اسلامی اخلاق

مولف: احمد دیلمی و مسعود آذر بائیجانی

مترجم: سید غلام عسکری عابدی

فہرست مطالب

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرورکائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہبِ عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگرچہ رسول اسلام ﷺ کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا

کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین وبے تاب ہیں،یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھاکر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا،وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہوسکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیتؑ عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت ؑ کی ترویج و اشاعت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، حضرات آقایان احمد دیلمی ومسعود آذر بائیجانی کی گرانقدر کتاب ''اخلاق اسلامی ''کو فاضل جلیل مولانا سید غلام عسکری عابدی نے اردو میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم ان حضرات کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں،اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت ؑ

عرض مترجم

وَ اِنکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیم[1]''اے پیغمبر آپ اخلاق کے بڑے مرتبہ پر فائز ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'' :اِ نَّمَا بُعِثتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاَخلَاقِ[2]''میں مبعوث ہوا ہوں تاکہ کارم اخلاق کو کمال تک پہنچاؤں۔

علماء اور دانشوروں نے اسلام کی تعلیمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ عقائد کا، دوسرا حصہ احکام کا اور تیسرا حصہ اخلاق کا ہے۔

اسلام میں اخلاق کی اہمیت کے پیش نظر اسے اسلام کا ایک رکن اور بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات اور اہلبیت اطہار ؑ کی مختلف حدیثیں اس کی اہمیت پر تاکید کرتی نظر آتی ہیں۔ قرآن کریم نے پیغمبروں کی بعثت کا مقصد تربیت اور تزکیہ قرار دیا ہے اور تین مقامات پر تزکیہ کو تعلیم پر مقدم قرار دیا ہے۔

جب خدا کے پیغمبروں کے آنے اور آسمانی کتابوں کے نازل ہونے کا مقصد انسانوں کی تربیت اور تزکیہ اور ان کو مختلف آلودگیوں سے پاک کرنا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ جب تک زمین سے گھاس اور پتھر وغیرہ جدا نہیں ہوجاتے قیمتی بیجوں کا اس میں ڈالنا بے کار اور بے فائدہ ہوتا ہے تو یہ بات بھی واضح ہوجا تی ہے کہ تعلیم و تربیت کے لئے انسانوں کو برائیوں سے دور رکھنا بے حد ضروری ہے۔

قرآن میں تعلیم وتربیت سے متعلق چار جگھوں میں سے تین جگھوں پر تزکیہ (تربیت) کو تعلیم پر مقدم رکھا گیا ہے[3]۔ خدا کے پیغمبروں اور اس کے نمائندوں نے تعلیم کے علاوہ تزکیہ اور تربیت پر بھی زور دیا ہے جو ان کے مبعوث ہونے کا مقصد

---

[1] سورہ: قلم، آیت: ۴
[2] بحار الانوار، ج: ۱۶، صفحہ: ۲۱۰
[3] سورہ: بقرہ، آیت: ۱۲۹ و ۱۵۱، سورہ: آل عمران، آیت: ۱۶۴، سورہ: جمعہ، آیت

ہے۔ پہلے مرحلہ کو انجام دینے کی خاطر اصول دین اور مبدأ و مقصد کی تعلیم دی تاکہ خدا پر اعتقاد کے سایہ میں اخلاق یعنی تزکیہ اور تربیت کو دوام اور استمرار حاصل ہو سکے۔

قلبی ایمان، ارادہ کو حرکت میں لاتا ہے اور عادتوں اور کرداروں کو اپنے سانچہ میں ڈھال دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اخلاق کا رابطہ عقیدہ سے بھی ہے اور احکام سے بھی احکام کا رابطہ حقوق سے اور حقوق کا رابطہ اخلاق سے ہے۔

زمانۂ قدیم سے مختلف سماج اور مذاہب میں کسی نہ کسی عنوان سے اخلاق اہمیت کا حامل رہا مختلف عقیدہ والوں نے مختلف زبانوں میں اس موضوع پر اپنے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

علماء اسلام نے کوشش کی ہے کہ اسلامی اخلاق کو آیات و روایات کی روشنی میں جن کا تعلق وحی سے ہے منظر عام پر لائیں اور اس کے ذریعہ اس شعبہ میں اپنی دینی و سماجی خدمات کو انجام دے سکیں اور ان کی یہ کوشش تھی اور ہے کہ اس سے متعلق ایجاد کئے جانے والے شبہات اور سوالات کا مناسب طریقہ سے جواب دیں ان با اہمیت کوششوں میں سے یہ کتاب بھی مجموعی طور پر بہت اہمیت کی حامل ہے۔

اسی وجہ سے مجمع جہانی اہل بیت ۲۲۲ نے اسے اپنی ترجمہ کی جانے والی فہرست میں شامل کیا۔ یہ کتاب ایک خاص اسلوب کے تحت لکھی گئی ہے اور عقلی، فلسفی اور نظری جہات کے علاوہ دینی اور علمی و عملی لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے، آیات و روایات کے علاوہ دوسرے بہت سے علماء اور دانشوروں کے نظریات کے ذریعہ اسلامی اخلاق کی برتری کو ثابت کیا گیا ہے۔

ہر اخلاقی موضوع کو دلیل کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممکن ہے مترجم یا کتاب کے بعض قارئین کسی جزئی مسئلہ سے متفق نہ ہوں لیکن یہ اختلاف نظر کتاب کی اہمیت کو کم نہیں کرتا ہے۔

اگر چہ اصل کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایران کی یونیور سیٹیوں اور ان کے طلاب کے لئے لکھی گئی ہے لیکن اس کے ترجمہ میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ صرف ایک خاص طبقہ تک محدود نہ رہے بلکہ اس سے دوسرے لوگ بھی بہرہ مند ہو سکیں۔

اردو کے دامن میں نسبتاً علمی اور علم اخلاق سے متعلق اصطلاحوں کی کمی ایک طرف اور ایسی حالت میں بھی کتاب کو معیاری شکل میں پیش کرنے کی کوشش دوسری طرف ایسے اسباب تھے جن کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ سخت تھا۔ لیکن خدا کے فضل وکرم اور اہلبیت اطہار ؑ کی نوازشوں سے اس کا ترجمہ تکمیل تک پہنچا۔

یہاں مناسب اور ضروری ہے کہ ان حضرات کا شکریہ ادا کیا جائے جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں میرا تعاون کیا اور مختلف موقعوں پر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازااور ماہ رمضان کے باوجود ٹائپ وغیرہ کی ذمہ داری کو وقت کے اندر پورا کر دیا۔

مجمع جہانی اہل بیت ؑ کے ان ذمہ دار حضرات کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھے اس لائق سمجھا کہ اس نیک عمل کو انجام دینے کی ذمہ داری میرے سپرد کی تاکہ اس کے ذریعہ ثواب دارین حاصل کر سکوں۔

اس سلسلہ میں تعاون کرنے والے تمام حضرات کے نام نامی کا ذکر کرنے سے معذور ہوں۔ ممکن ہے کسی نے مفید مشورہ دے کر میرا تعاون کیا ہو اور میں نے اس پر عمل بھی کیا ہو لیکن ان صاحب کا نام مجھے یاد نہ ہو۔ لہٰذااس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے سبھی سے معذرت خواہ ہوں۔آخر میں خدا اوراہلبیت اطہار ؑ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اگر ان کا فضل و کرم میرے شامل حال نہ ہوتا تو یہ کام یہ ناچیز انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس خدا کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ اخلاق اسلامی کے مطابق زندگی گذارنے والے تمام حضرات کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور ان کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین)۔

والحمد للہ رب العالمین سید غلام عسکری عابدی ۱۸ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ

پیش لفظ انسان اپنی زندگی کے آغاز سے آخر عمر تک فطری طور پر اخلاقی قدروں کی طرف مائل رہتا ہے اور اس کی شخصیت ہمیشہ اخلاقی فضائل و رذائل کے معیار کے ذریعہ پرکھی جاتی ہے۔اس امتحان میں جو بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ نہ صرف لوگوں کی نظروں میں بلکہ اپنے پروردگار کی نظر میں بھی بلند اور قابل قدر مرتبہ حاصل کرلیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں خدا کے پیغمبروں نے امت کو خالق کائنات کی پرستش کی طرف دعوت دینے کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ کی بنیادی اخلاقی قدروں پر اعتماد کرتے ہوئے انسان کو اس کے رشد و تکامل کی طرف ہدایت فرمائی ہے۔ خدا کے انہیں پیغمبروں میں سے پیغمبر اسلام صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہیں جنہوں نے اپنے مبعوث ہونے کا سبب، اخلاقی قدروں کو کمال تک پہنچانا بیان فرمایا ہے۔

اس دوران کچھ لوگ دین کی اصلی اور بے نیاز تہذیب سے متمسک اور اخلاقی و الہامی قدروں کی طرف مائل ہونے کے بجائے مختلف قسم کے اخلاقی نظریوں کی طرف متوجہ ہوگئے تاکہ اپنی کچھ روحی، نفسیاتی اور معنوی مشکلات کو حل کرسکیں۔

اخلاقی نظریات کو پیش کرنے کے لئے کچھ لوگوں کی کوششیں اگرچہ اخلاقی حکمت و بصیرت میں ترقی اور گہرائی کا سبب بنیں لیکن اخلاق کے آسمانی اصولوں سے دوری اور خدا و آخرت سے بے توجہی ایک ایسی بڑی آفت بن کر سامنے آئی ہے جو اخلاقی بنیادوں کی کمزوری اور شبہات کے وجود میں آنے کا سبب بنی جبکہ انھیں (آسمانی اصولوں کو) اخلاق کے اساسی پایہ کی حیثیت حاصل ہے کہ جسے اخلاقی بنیادوں رکن کی حیثیت حاصل ہے۔

اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ شبہات کو نظر میں رکھتے ہوئے علم اخلاق سے مربوط علوم جیسے علم نفسیات اور علوم تربیتی سے استفادہ کرکے اخلاق اسلامی کے ڈھانچہ، اخلاقی موضوعات کے مفاہیم اور اسلامی تربیت کے طریقوں کو دین کے اصلی منابع ومصادر سے استفادہ کرتے ہوئے پیش کیا جائے۔

اس کتاب کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا اور دوسرا حصّہ محقق ارجمند حجۃ الاسلام والمسلمین جناب احمد دیلمی نے اور تیسرا حصّہ محقق ارجمند حجتالاسلام والمسلمین جناب مسعود آذر بائیجانی نے تحریر فرمایا ہے۔

امید ہے کہ یہ کوشش نسل جوان کی ضرورتوں کا جواب دینے کے لئے ایک اچھا قدم قرار پائے گی تاکہ اخلاقی مباحث پر اس سے بہتر اور قیمتی کتابیں تحریر کرنے کے لئے راستہ ہموار ہو سکے۔

یہ کتاب دو مؤلفین کے ذریعہ تألیف کی گئی ہے لہٰذا ممکن ہے اس کے متن میں بعض مقامات پر تحریر ی وجہ سے فرق نظر آئے ؛ اگر چہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان اسے ایک طرز پر پیش کیا جائے۔

کتاب کی پہلی تظیم وترتیب اس سے زیادہ حجم میں شائع ہوئی تھی اور اب یہ دوسری تظیم وترتیب، محترم اساتید کی خواہش پر کچھ اصلاحات کے ساتھ نسبتاً کمتر حجم میں پیش کی جارہی ہے۔

درسی کتابوں کی تحقیق و تدوین کے ادارہ کی جانب سے اس کتاب کے سلسلہ میں اساتیداور دانشوروں کے مشوروں کا استقبال کیا جائے گا اورتمام دوستوں سے یہ خواہش ہے کہ اپنے نظریات کو تحریری شکل میں اس ادارہ کے سرپرست کوارسال فرمائیں تا کہ محترم اساتید کی مشارکت سے اس کتاب کی اصلاح و تکمیل کا میدان فراہم ہو سکے۔

آخر میں ہم اس کتاب کے گرانقد رمؤلفین اور اس سلسلہ میں ہمارا تعاون کرنے والے دیگر حضرات کے تہ دل سے شکر گزار ہیں اور خداوند متعال سے ان کی کامیابی کے لئے دعا کی جاتی ہے۔

رہبر انقلاب کی جانب سے اعلیٰ تعلیمی مراکز کے لئے معینہ کمیٹی درسی کتابوں کی تدوین و تظیم کا مرکزدرسی کتابوں کی تدوین اور تحقیق کا ادارہ

مقدمہ

بیشک خدا کے تمام رسولوں کا اصل مقصد انسان کی معنوی شخصیت کی اصلاح اور اسے بلند کرنا تھا۔

آسمانی مصلحین کی قاموس (لغت) میں اُن علوم کے کام کرنے کے وسیلوں کی تصویر بنا دی گئی ہے جو اس مقدس مقصد کی بغیر واسطہ خدمت نہ کرتے ہوں۔

کوئی بھی حقیقت طلب محقق اگر اسلام کے اولین منابع و مصادر میں مختصر سی فکر کرے تو اسے اس کے تعلیمات کے تانے بانے میں بطور آشکار اخلاق و معنویت کی چھاپ نظر آئے گی۔

مسلمان دانشوروں اور دیانتداری کی حفاظت کرنے والوں نے اسلام کی اخلاقی تعلیم کو بیان کرنے میں سخت ترین زحمتوں کو تحمل کیا ہے۔

اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ ان کی زحمتوں کے نتیجے ہیں ۔ لیکن زمانہ کا گذرنا، عمومی ادبیات اور علمی کتابوں کے لکھنے کی روش میں تبدیلی اور آخر کار اخلاقی تعلیم کا عمومی ہونا یہ ایسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے جدید حالات کے مطابق کتاب کی تدوین کی ضروری ہے۔

اس کتاب میں نئے اسلوب کے تحت، اخلاقی مسائل و موضوعات کو تین حصوں میں جگہ دی گئی ہے۔ جو آگے آنے والی فصلوں سے ظاہر ہو جائے گا۔

ہم دونوں نے اپنی کم علمی کا احساس ہونے کے باوجود، درسی کتابوں کی تألیف و تحقیق کے ادارہ کے گرانقدر ذمہ داروں کے حکم پر یہ ذمہ داری قبول کی ہے۔

بعض ایسے نکات ہم نے پیش کئے ہیں جن سے آگاہی رکھنا تھا، اس کتاب کے مطالعہ میں معزّز مخاطبین کے لئے مفید اور اس کی قدر و قیمت کو طے کرنے میں مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۔ پہلے حصہ میں ایسے مختلف موضوعات ہیں جن کا تعلق، فلسفہء اخلاق سے ہے۔ لیکن ان میں سے صرف دو اہم موضوعات کا انتخاب کر کے ان پر بحث کی گئی ہے، تمام موضوعات کو پیش کرنا مقصد نہیں ہے۔

۲۔ اسی حصہ میں اور انہیں موضوعات پر وقت کی تنگی اور مطالب کی کمی کی بناء پر مختلف نظریات پیش کرنے اور آزاد تطبیقی بحث کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ اخلاق اسلامی مبانی واضح ہو جائیں۔

۳۔ پوری کتاب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ تمام مطالب بالخصوص آیات و روایات پہلے درجہ اور معتبر اسلامی منابع و مصادر کے مطابق ہوں اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ درمیانی اور بالواسطہ منابع و مصادر سے پرہیز کیا جائے۔

۴۔ اخلاقی مسائل میں وسیع النظری لکھنے والوں کے لئیقابل توجہ رہی ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ ان اخلاقی مسائل کی قدر و منزلت کو نسبتاً کچھ زیادہ اعتدال کے ساتھ اور بہتر طریقہ سے درک کیا جائے اور اُن اخلاقی مسائل میں تنگ نظری و کوتاہ بینی کی وجہ سے جو مشکلات وجود میں آتی ہیں حتیٰ الامکان انھیں روکا جائے۔

۵۔ مخاطبین کی عام علمی سطح پیش نظر ہونے کی وجہ سے بعض نظریات کو پیش کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے۔

٦۔ کوشش کی گئی ہے کہ مباحث کو منظم طریقہ سے ایک خاص عقلی ترتیب ایجاد کر کے پیش کیا جائے۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی ممکن ہے یہ نقص سے خالی نہ ہو۔

۷۔ تربیت اور اخلاقی سلوک کے لئے تربیت کے طریقوں سے آگاہی ضروری ہے تاکہ اخلاق کی منزل مقصود اور آخری ہدف تک پہنچا جا سکے۔اس کتاب کے تیسرے حصہ میں اسی نکتہ پر توجہ دی گئی ہے۔

۸۔ تیسرے حصّہ میں علم نفسیات و تربیت کے نتیجوں سے استفادہ کر کے اور اسلامی تعلیم کے دائرہ میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اخلاقی تربیت کے طریقوں کو بطور دقیق مگر اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

اس حقیقت کو بیان کرنا ضروری ہے کہ یہ کتاب فراخ دل اور متواضع برادر ارجمند جناب حجتا لاسلام والمسلمین جناب علی رضا امینی جو درسی کتابوں سے متعلق منصوبہ بندی کے مرکز کے محترم معاون ہیں اور جنہوں نے اس طرح کے کام کا وسیلہ فراہم کیا ہے) کی نگرانی اور عاقلانہ تحقیقی مدیریت کے سایہ میں اور جناب جواد رفیعی (جنہوں نے ہر طرح سے تعاون فرمایا) اور جناب درودی ہوں نے مسلسل کوشش و پیروی کی) اور جناب فاخری(جنہوں نے اس کام کی نظارت میں نہایت دقت اور حوصلہ سے کام لیا) اور تنظیم و ترتیب میں حصّہ لینے والے افراد، اپنے اصلاحی نظریوں سے ہم پر احسان کرنے والے اساتید اور ٹائپ، تصحیح، مطابقت، صفحہ آرائی، وغیرہ کو انجام دینے والے گرانقدر بھائیوں کی مسلسل کوششوں سے تشکیل پائی ہے۔ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ متواضعانہ طور پر اِن تمام حضرات کی قدر دانی کریں اور اُن کا شکریہ ادا کریں۔

یہ واضح ہے کہ اس کتاب میں کمیاں اور نواقص موجود ہیں۔ لکھنے والوں کی معمولی بضاعت، مباحث کی وسعت، بعض نئے موضوعات کی تازگی اور مخاطبین کی وسعت نظر جیسے اسباب نے اِن کمیوں میں زیادتی کر دی ہے۔ اس بناء پر تمام محترم صاحبان نظر، گرانقدر اساتید اور محترم طلاب جو اپنے تنقیدی نظریات کو منعکس کرکے مؤلفین پر احسان کریں گے با کمال مسرّت ان کی پہلے سے ہی قدردانی کی جاتی ہے اور اس کام کے آغاز و اتمام پر خدا وند مہربان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

احمد دیلمی۔ مسعود آذر بائیجانی قم۔تابستان ۱۳۸۰ھ۔ش، مطابق ۲۰۰۱ء

پہلا حصہ

اخلاق کے اصول پہلی فصل: کلیّات دوسری فصل: اخلاق کی جاودانی تیسری فصل: اخلاقی عمل پہلی فصل کلیّات : علم اخلاق کیا ہے ؟اس کا موضوع اور ہدف کیا ہے؟ دوسرے علوم سے اس کا کیا رابطہ ہے؟اخلاق کی تعلیم کیوں ضروری ہے ؟ مسلمان علماء کے درمیان موجود اخلاقی نظریات اور اُن کے طریقوں کی قسمیں کون سی ہیں؟یہ وہ اہم سوالات ہیں جو علم اخلاق کے مسائل شروع ہوتے ہی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

ان کا مناسب اور شائستہ جواب نہ صرف اس علم کے موضوع، حدود اور مقام و منزلت کے واضح ہونے کا سبب بنے گا بلکہ ہماری امیدوں کی اصلاح کے ساتھ بہت سے ایسے شبہات اور ابہامات کو بڑھنے سے روک سکتا ہے جو ممکن ہے بعد کی بحثوں میں سامنے آسکتے ہیں۔

الف۔ علم اخلاق سے واقفیت علم اخلاق کی ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات اور مفاہیم کا واضحہونا ضروری ہے :ا۔ لفظ اخلاق کا لغوی مفہوم اخلاق خُلق کی جمع ہے جس کے معنی انسان کی باطنی قدرت اور عادت کے ہیں، جسے باطنی آنکھوں سے نہیں بلکہ چشم بصیرت سے درک کیا جا سکتا ہے یہ (خُلق) خَلق کے مقابلہ میں ہے جو ظاہراً قابل حس و درک شکل وصورت کے معنی میں ہے اور ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے قابل ہے[1]۔

اسی طرح خُلق کو واضح و پائیدار نفسانی صفت بھی کہتے ہیں کہ انسان اپنی صفت کے مطابق بغیر کسی تاخیر کے اعمال کو انجام دیتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی انسان شجاع ہے تو وہ اپنے دشمن سے مقابلہ کرنے میں شش وپنج میں نہیں پڑتا ۔ یہ باطنی وراسخ وثابت حالت، ممکن ہے کسی انسان میں طبیعی، ذاتی و فطری طور پر پائی جاتی ہو جیسے کوئی۱۔ اصفہانی، راغب: معجم مفردات الفاظ قرآن، ص: ۱۵۹۔ جلدی غصہ میں آجاتا ہے یا معمولی بات پر خوش ہو جاتا ہے۔

---

[1]

خُلق پیدا ہونے کے دوسرے عوامل واسباب وراثت، تمرین و تکرار ہیں۔ مثلاًیہ کہ کوئی پہلے شجاعت والے کاموں کو تردّد اور تذبذب کی حالت میں انجام دیتا ہے پھر تمرین کی وجہ سے تدریجاً اس کے اندر شجاعت کی پائدار صفت اس طرح وجود میں آجاتی ہے کہ اُس کے بعد کسی جھجک کے بغیر شجاعت کا مظاہرہ کرتا ہے[1]۔

یہ باطنی و نفسانی راسخ صفت ممکن ہے ''فضیلت'' یعنی اچھی خصلتوں کا سبب قرار پائے اور ممکن ہے ''رذیلت'' یعنی برائی اور بدکرداری کی ہو جائے۔بہر حال اُسے خُلق کہا جاتا ہے۔

۲۔ علم اخلاق کی تعریف

اسلامی علوم میں علم اخلاق کے مستند و معروف اور سب سے اصلی منابع کی طرف رجوع کرنے سے اور قرآن واحادیث میں اس کے استعمال کے مقامات پر دقت کرنے سے علم اخلاق کی تعریف اس طرح بیان کی جاسکتی ہے: علم اخلاق وہ علم ہے جو اچھی اور بری نفسانی صفات اور ان کے مطابق اختیاری اعمال و رفتار کو بیان کرتا ہے اور اچھی نفسانی صفات کو حاصل کرنے،پسندیدہ اعمال کو انجام دینے اور بری نفسانی صفات اور ناپسندیدہ اعمال سے پرہیز کرنے کے طریقوں کو بتاتا ہے[2]۔

اس تعریف کی بناء پر علم اخلاق اچھی اور بری صفات کے بارے میں گفتگو کرنے کے علاوہ ان کے مطابق انجام پانے والے اعمال و رفتار کے بارے میں بھی بحث کرتا ہے۔ اس کے علاوہ نفسانی یا عملی فضائل تک پہنچنے اور برائیوں سے بچنے کے طریقوں کے بارے میں بھی بحث کرتا ہے۔اس طرح علم اخلاق کے موضوع کو یوں بیان کیا گیا ہے: اچھی اور بری صفات اور اعمال، اس وجہ سے کہ انسان کے لئے ان کا حاصل کرنا اور انجام دینا یا ترک کرنا ممکن ہو۔

[1] رجوع کیجئے: ابن مسکویہ: تہذیب الاخلاق و طہارۃ الاعراق، ص: ۵۱۔ نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج: ۱، ص: ۲۲

[2] رجوع کیجئے: ابن مسکویہ: تہذیب الاخلاق، ص ۲۷، طوسی۔ خواجہ نصیر الدین: اخلاق ناصری: ص ۴۸۔ نراقی، محمد مہدی: جامع

چونکہ انسان کے اچھے اور برے صفات اور اس کے طرز عمل کی بازگشت اس کی جان و روح سے وابستہ ہے اس لئے بعض اخلاقی دانشوروں نے انسانی نفس کو علم اخلاق کا موضوع قرار دیا ہے۔

علم اخلاق کا آخری ہدف یہ ہے کہ انسان کو اس کے حقیقی کمال و سعادت تک پہنچائے کہ یہی کائنات اور انسان کی خلقت کا اصلی مقصد ہے. اس کمال و سعادت کی واقعی تفسیر اور اس کا محقق ہونا، اس بات میں ہے کہ انسان اپنی استعداد اور ظرفیت کے مطابق، نفسانی صفات اور کردار میں الٰہی اسماء اور صفات کا مظہر بن جائے تاکہ جہاں پوری طبیعی دنیا کسی ارادہ کے بغیر، خدا کے جمال و جلال کی تسبیح میں مشغول ہے، وہیں انسان اپنے اختیار اور اپنی آزادی کے ساتھ سب سے زیادہ گویا، مقرب اور مکمل الٰہی مظہر بن کر سامنے آجائے۔

۳۔ اخلاق کا فلسفہ

اخلاقی گفتگو میں قبل اس کے کہ اچھی اور بری صفات و اعمال کے مصادیق کو معین کیا جائے اور ان کو حاصل کرنے یا ان سے پرہیز کرنے کے طریقوں کو بیان کیا جائے، بعض ایسے بنیادی سوالات سامنے آتے ہیں جو دوسرے اخلاقی مباحث پر مقدم ہیں اور مخصوصاً عقلی ماہیت رکھتے ہیں۔

اُن میں سے کچھ سوالات مندرجہ ذیل ہیں :

''اچھے'' اور ''برے'' جیسے الفاظ اور عناوین کا مفہوم کیا ہے؟

اخلاقی مفاہیم کی ماہیت و حقیقت کیا ہے؟

اخلاقی قضیوں کی زبان، انشائی ہے یا اخباری؟

صحیح یا غلط اخلاقی قضیوں کا مبدأ اور معیار کیا ہے ؟

کسی اچھی یا بری صفت یا رفتار کا معیار کیا ہے ؟

آیا اخلاقی قضیے مطلق (عالمی اور دائمی) ہیں یا نسبی (زمانی و مکانی ہیں) ؟

اخلاقی ذمہ داری کی حدیں اور شرطیں کیا ہیں ؟

اخلاقی مباحث و تحقیقات کا وہ حصہ جو اِن بنیادی سوالوں کا جوابدہ ہے اسے فلسفۂ اخلاق کہتے ہیں۔

اگر چہ اس کے مباحث کی ماہیت حتمی اور ہمیشہ عقلی نہیں ہوتی ہے، خاص طور سے فلسفۂ اخلاق کے جدید مکاتب فکر میں زبان و ادب کے لحاظ سے بھی (پہلے سوال کے مانند) گفتگو ہوتی ہے۔

اخلاقی تربیت لغت میں تربیت کے معنی کسی شئے کی صلاحیتوں کو پرورش دینا ہے۔یہ صلاحیتیں ممکن ہے جسمی و مادّی، علمی و عقلی ہوں اور ممکن ہے وہ قابلیتیں اخلاقی ہوں۔

اخلاقی تربیت سے مراد، پسندیدہ اخلاقی صفات و کردار کے حصول میں باطنی صلاحیتوں کو پرورش دینا، بلند اخلاقی فضائل کو حاصل کرنا اور برائیوں سے پرہیز اور ان کو نابود کرنا ہے۔

اس بناء پر تربیت اخلاقی کا اہم کام، اخلاقی صلاحیتوں کو پیدا کرنا اور اخلاقی کمالات تک پہونچنا ہے۔ جبکہ علمی تربیت میں اصل مقصد علمی قابلیتوں کی پرورش کرنا اور اس کے اعلیٰ مراتب کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔اس بناء پر انسان کو ایک آلہ اور وسیلہ کی حیثیت دیکھا جاتا ہے۔

اخلاقی تربیت کا ربط علم اخلاق کے ایک اہم حصے سے ہے اور چونکہ اس کی اکثر باتیں عمل سے متعلق ہیں لہٰذا اس حصہ کو کبھی اخلاق عملی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اخلاقی مباحث کا وہ حصہ جو اخلاقی لحاظ سے اچھائیوں اور برائیوں کی تعریف کرتا ہے اُسے کبھی اخلاق نظری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ب۔ علم اخلاق اور دوسرے علوم

علم اخلاق بھی دوسرے علوم کی طرح بعض موجودہ علوم سے مربوط ہے۔ ہم یہاں دوسرے علوم پر علم اخلاق کے اثر اور اس سے مربوط بعض علوم جیسے علم فقہ، عرفان عملی و علوم تربیتی کا ایک جائزہ پیش کریں گے۔

۱۔ علم اخلاق اور فقہ

علم فقہ مکلّف انسان کے اعمال و رفتار کے بارے میں دو جہت سے بحث کرتا ہے :

الف۔ اُخروی آثار کے لحاظ سے یعنی ثواب و عقاب کے لحاظ سے، جو واجب و حرام جیسے عناوین کے تحت بیان ہوتے ہیں۔

ب۔ دنیاوی آثار کے لحاظ سے جس میں صحیح و باطل جیسے عناوین کے تحت گفتگو ہوتی ہے۔

فقہ کی پہلی قسم کے احکام کی حیثیت اخلاقی ہے اور ان میں سے بہت سے علم اخلاق سے مربوط ہیں۔

فقہ کی دوسری قسم کے احکام کا ربط علم اخلاق سے نہیں ہے، ان کی حیثیت صرف فقہی اور حقوقی ہے[1]۔

---

[1] شہید مطہری، مرتضیٰ: آشنائی باعلوم اسلامی (عرفان) ص :۱۸۱، ۱۸۶۔

۲۔ علم اخلاق اور حقوق

علم حقوق کا موضوع، معاشرے کے لئے وہ لازم الاجراء قوانین ہیں جنہیں حکومت پیش کرتی ہے اور وہ اس کی ذمہ دار ہے۔ اس بناء پر علم حقوق کا ربط فقط انسان کی اجتماعی و دنیاوی زندگی سے ہے اور اس کے سارے قوانین سب کے لئے ہوتے ہیں اور ان کا اجراء دنیاوی فلاح کے لئے ہوتا ہے۔

جبکہ علم اخلاق کا ربط، انسان کی فردی زندگی سے بھی ہوتا ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری بھی نہیں ہوتا۔

اس طرح اخلاق کا ربط، فردی و اجتماعی زندگی سے بھی ہے اور اس میں بعض پر عمل ضروری اور بعض پر عمل ضروری نہیں ہوتا ہے۔ وہ اخلاقی احکام جن کی حقوقی حیثیت نہیں ہوتی[1]۔

اور اُن میں دنیاوی فائدے بھی نہیں ہوتے وہ پاکیزگیٔ نفس کے لئے اور اُخروی لحاظ سے لازم الاجرء ہوتے ہیں۔ علم اخلاق اور حقوق میں فرق ہونے کے باوجود دونوں میں یگانگت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف حقوق عدالت اجتماعی کے اجراء میں جس کا شمار بلند اخلاقی اقدار میں ہوتا ہے، اخلاق کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے تو دوسری طرف علم اخلاق، اخلاقی خوبیوں کی ترویج اور برائیوں سے مقابلہ کر کے معاشرے کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے۔ اس طرح یہ معاشرے میں نظم و ضبط اور عدالت برقرار کر کے علم حقوق کا بہترین معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے دونوں میں سے کسی ایک کا بھی نہ ہونا معاشرے کے لئے بہت زیادہ نقصاندہ ہے۔

[1] فلسفۂ تعلیم وتربیت، دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ، جلد اول، بخش دوم،

۳۔ علم اخلاق اور عرفان عملی

عرفان ایک علمی اور ثقافتی نظام ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں: نظری اور عملی۔ عرفان نظری کا رابطہ ہستی (وجود)، یعنی خدا، دنیا اور انسان سے ہے۔ عرفان کی یہ قسم فلسفہ سے زیادہ مشابہ ہے عرفان عملی، خدا، دنیا اور خود سے.

ا۔ البتہ کبھی کبھی اُن احکام کو جن پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے مثلاً مستحب و مکروہ، احکام اخلاقی یا آداب کہا جاتا ہے اور فقہ میں ان کے شامل ہونے کا معیار حکم کا لازم ہونا مانا جاتا ہے۔ یہ استعمال صرف ایک خاص اصطلاح ہے اور عام طور پر اس کا واسطہ اخلاق سے نہیں ہے۔

۲۔ غیر مذہبی حقوقی نظام میں حقوق کو اخلاق کے مقابل قرار دیا گیا ہے اور اُن دونوں کے لئے مشترک حدود اور موضوعات کے قائل نہیں ہیں لیکن اسلامی حقوقی نظام میں بعض اجتماعی زندگی کے طریقے، اخلاقی ماہیت بھی رکھتے ہیں اور حقوقی ماہیت بھی جس کے نتیجہ میں وہ حقوقی حکم اور اجراء کی ضمانت بھی رکھتے ہیں، جیسے چوری اور قتل.

انسان کے رابطے اور ان کے فرائض کو بیان کرتا ہے عرفان کی یہ قسم جس کو سیر و سلوک کا علم بھی کہتے ہیں، علم اخلاق سے زیادہ مشابہ ہے عرفان عملی میں گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ سالک کو انسانیت کی معراج (توحید) تک پہنچنے کے لئے کہاں سے آغاز اور کن منزلوں کو ترتیب سے طے کرنا چاہئے اور اس سفر کی منزلوں میں کون سے حالات، اس سے روبرو ہو سکتے ہیں اور اس کے سامنے کون سے واقعات پیش آئیں گے۔

البتہ یہ تمام مراحل اس کامل اور تجربہ کار انسان کے زیر نظر ہوں جو خود اس سفر کو طے کر چکا ہو اور ان منزلوں کے قاعدے اور قانون سے آگاہ ہو اور اگر انسان کامل کی رہنمائی ہمراہ نہ ہو تو گمراہی کا خطرہ ہے۔

اس طرح عرفان عملی کی بحثیں خاص طور پر اخلاقی تربیت اور معنوی مقامات تک پہنچنے کے طریقوں اور وسیلوں کے ارد گرد گھومتی ہیں اور حقیقت میں یہ مسئلہ علم اخلاق کے اصلی موضوعات میں شمار ہوتا ہے۔

۴۔ علم اخلاق اور تربیتی علوم

تربیتی علوم، علم نفسیات کے نتیجوں سے بہرہ مند ہو کر اور انسان کے سلیقوں پر حاکم قوانین کو پہنچواکر اور اُن فارمولوں سے آگاہی کی کوشش کر کے جو انسان کے عمل اور رد عمل کے دائر ہ میں ہیں، شکل اختیار کرتے ہیں اور علمی، اخلاقی و فنی مہارتوں کی قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لئے وسائل امکانات فراہم کرتے ہیں اور اگر ان کی توجہ اخلاقی عوامل پر ہے تو ان کی اُن عاملوں پر نظر وسیلہ اور آلہء کار کی حثیت رکھتی ہے اور چونکہ اخلاقی فضیلتوں کی وجہ سے تربیتی مرحلوں کو طے کرنے میں مدد ملتی ہے، لہٰذا اُن پر بھی توجہ کرتے ہیں۔

اگر چہ علم اخلاق اس سے بلند ہے کہ اس کو تربیت کے ایک وسیلہ کے عنوان سے پہچنوایا جائے لیکن بعض اخلاقی حدود میں علم اخلاق اور تربیتی علوم (دونوں) حدود اور مسائل میں اخلاق علمی کے مانند مشترک ہیں۔

علم اخلاق اس (اخلاق علمی کے) دائرہ میں بھی، اصل علم و موضوع اور متعلقات پر اخلاقی نظر رکھتا ہے اور معلم و شاگرد کے مقاصد کو بھی اخلاقی لحاظ سے منظم کرتا ہے اور ساتھ ہی ان کے ایک دوسرے سے متعلق رابطوں کو، اخروی معیار کے مطابق مستحکم کرتا ہے۔ علوم تربیتی کی تربیت کرنے والے ان اخلاقی فارمولوں سے اور علم نفسیات کی معلومات نیز، خطا و آزمائش کے نتیجوں سے بہرمند ہوکر اپنے بلند اور قیمتی اہداف تک تیزی سے اور آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔

ج۔ اخلاق سے متعلق نظریات

اخلاق کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان خاص طور سے علمائے علم اخلاق کے درمیان تین نظریات پائے جاتے ہیں ابتداء میں اِن تین نظریوں کے بارے میں اجمالی طور پر گفتگو کی جائے گی پھر ان میں مورد قبول نظریہ کو پیش کیا جائے گا ۔

ا۔ فیلسوفوں کا نظریۂ اخلاق

اس مکتب فکر کے افراد، افراط و تفریط کے مقابلہ میں جو رذائل اخلاقی میں سے ہیں، اخلاقی فضائل کے لئے حد اعتدال کو اختیار کرتے ہیں اور خوبی و بدی کے لئے اسی کو کسوٹی قرار دیتے ہیں۔

اس بناء پر چونکہ انسان کے عمل کا سرچشمہ نفسانی قوتیں ہیں لہذا اس کے اعمال و کردار باطنی قوتوں میں اعتدال یا عدم اعتدال سے مربوط ہیں اس بناء پر اس مکتب میں قوائے نفسانی میں اعتدال اور اس میں افراط وتفریط سے بحث ہوتی ہے اور تمام دینی اخلاقی باتوں کو اسی معیار پر پیش کیا جاتا ہے تربیت اخلاقی کے بارے میں یہ مکتب نفسانی قوتوں میں اعتدال کی نصیحت کرتا ہے ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق و طہارت الاعراق، نصیر الدین طوسی کی اخلاق ناصری اور کافی حد تک جامع السعادات، تصنیف مولیٰ محمد مہدی نراقی اسی مکتب ونظریہ کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں۔

اعتدال کی توضیح کے سلسلہ میں موجود مشکلوں کی وجہ سے نیز اخلاق کے تمام مفاہیم کی تفسیر میں جامعیت کے نہ ہونے کی بناء پر یہ مکتب تنقید کا شکار ہوا ہے اور چونکہ یہ موضوع علمی اور بہت زیادہ خشک ہے لہٰذا علماء اور فلاسفر کو چھوڑ کر عوام کے درمیان رائج نہ ہو سکا[1]۔

---

[1] استاد مطہری، مرتضیٰ: تعلیم وتربیت در اسلام، ص: ٢٠٠۔

۲۔ عارفوں کا نظریۂ اخلاق

یعنی وہ اخلاق جس کو رائج کرنے والے صوفی اور عرفاء تھے۔اس طرح کے اخلاق نے جس کا زیادہ دار ومدار اخلاقی تربیت اور سیر سلوک پر ہے، ایک تربیتی نظام کو رائج کرنے اور اس کے آغاز وانجام و مراحل کے علاوہ اس راہ پر چلنے کے لئے ضروری وسیلوں کو معین کرنے پر خاص توجہ دی جاتی ہے عارفانہ اخلاق کا محور (اصل مقصد) نفس سے جنگ وجہاد کرنا ہےپرہیز گار عارفوں کی ہمیشہ یہ کوشش تھی کہ اپنے اعمال و کردار کو شریعت کے ظاہر و باطن کے مطابق قرار دیں اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔

ان لوگوں نے اسی طرح دل اور محبت کی قدرت پر زور دے کر اور اشعار کی نفوذی زبان سے استفادہ کر کے اور تشبیہات واستعارات وکنایات کو استعمال کر کے لوگوں کے درمیان زیادہ مقبولیت حاصل کر لی ہےخواجہ عبداللہ انصاری کی لکھی ہوئی کتاب ''منازل السائرین،، اور بہت سے معنوی وعرفانی مضامین والے فارسی اشعار کے معتبر دیوان جیسے مولوی کی مثنوی معنوی اور عطار نیشاپوری کی منطق الطیر اسی طرح کے اخلاق کو بیان کرتی ہیں۔

اس نظریۂ اخلاق میں بھی متعدد نظریات پائے جاتے ہیں۔اس مکتب کا تنقیدی جائزہ اور اس کی قدر وقیمت کو طے کرتے وقت ضروری ہے کہ اس بات پر بھی توجہ کی جائے کہ اُن نظریات کو بطور کلی تقسیم کرنے پراُن کے دو گروہ بنتے ہیں :

پہلا گروہ: وہ نظریات جو معنوی سلوک میں اصولی طور پر شریعت کی پابندی کو ضروری نہیں جانتے یا مختصر مدت اور ایک خاص مرحلہ تک ہی لازم مانتے ہیں۔

دوسرا گروہ: وہ نظریات جو شرعی احکام کی پابندی کو بلند معنوی مقامات تک پہنچنے کے لئے تنہا راستہ اور اسے ہمیشہ ضروری جانتے ہیں۔

پہلے گروہ کی قدر وقیمت کا اگر اندازہ لگایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ ایک طرح سے نفس سے جنگ کرنے میں افراط کا شکار ہوگئے اور اخلاق اسلامی کو زندگی سے موت کی طرف لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اخلاق میں غور و فکر کی اہمیت کو بھی کافی حد تک فراموش کر چکے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ لوگ ایسی تعلیمات سے نزدیک ہوگئے ہیں جو قرآن و سنت کے بر خلاف ہے مثلاً خود پرستی (تکبر) اور نفس سے جہاد کے بہانے، نفس کی عزت اور کرامت کو فراموش کر دیا ہے حالانکہ اخلاق اسلامی میں نفس کی شرافت و کرامت نہ صرف ایک اخلاقی فضیلت ہے[1] بلکہ اسے حاصل کرنا اور تقویت پہنچانا تربیت کا خود ایک طریقہ ہے[2]۔

لیکن عرفانی نظریہ کے دوسرے گروہ والے جو شریعت سے وفاداری کو اپنی تعلیم کے لئے سرِ لوح (بنیاد) اور لازم قرار دیتے ہیں، معنوی سفر کے قاعدوں کو منظم کرنے اور اُن کے مبدأ و مقصد اور اس سفر کے مرحلوں کو معین کرنے سے حاصل نتیجوں کو اور ان قدرتمند عناصر (جیسے محبت، ذکر، معنوی بلندی کے لئے نظارت) کے استعمال کرنے کی کیفیتوں کو جو اخلاقی تربیت کے سلسلہ میں بہت ہی کارآمد و مفید ہیں، اپنے ہمراہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اِن تمام امور کو قرآن و روایات کے مطابق جانتے ہیں۔ تربیت کے ان جذاب نتیجوں کو اخلاق اسلامی کے توصیفی مباحث کے ہمراہ کرنا اسلام کے اخلاقی نظام کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

۳۔ اخلاق نقلی[3]

یعنی وہ اخلاق جسے محدثین نے اخبار و احادیث کو نقل و نشر کر کے لوگوں کے درمیان بیان کیا ہے اور اس طرح اسے وجود میں لائے ہیں[4]۔

---

[1] (وَ لِلّٰهِ العِزَّةُ وَ لِرَسُولِہِ وَ لِلمُومِنِین) (سورہ: منافقون، آیت: ٨)۔
''وَلاَ تَکُن عَبد غَیرکَ وَ قَد جَعَلَکَ اللهُ حُرّاً، ، (نہج البلاغہ: نامہ٣١)۔

[2] مقدس اسلامی کتابوں میں مکارم اخلاق (مکارم یعنی بڑی خوبیاں) سے مراد یہی ہے۔
بعض روایتیں، جیسے'' مَن کَرُمَت عَلَیہ نَفسَہ هَانَت عَلَیہ شَهوَاته، ،۔(نہج البلاغہ، حکمت: ۴۴١)۔
ایضاً: ''مَن هَانَت عَلَیہ نَفسَہ فَلَا تَأمَن شَرَّہ، ،۔(تحف العقول، ص: ۴٨٣) اس بات کو بیان کرتی ہیں۔

[3] نقلی سے مراد آیات و روایات یا کسی کے قو ل کو نقل کرنا ہے

[4] استاد مطہری، مرتضیٰ: تعلیم وتربیت در اسلام، ص: ٢٠١۔

اس نظریہ میں اخلاقی مفاہیم کو کتاب وسنت کی بنیاد پر بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ عمل اُن مفاہیم پر حاکم، واقعی تربیت اور ان کے درمیان پائی جانے والی مناسبتوں پر کافی و وافی توجہ کے بغیر ہوتا ہے اس طرح کے متن اکثر اخلاقی مفاہیم کی توصیف کو اپنا مقصد قرار دیتے ہیں اور ان کی بنیادوں اور عملی نمونوں پر کم توجہ دیتے ہیں۔

اس بناء پر (اس نظریہ میں) اخلاق کی ابتداء و انتہا مخصوصاً اخلاقی تربیت زیادہ واضح نہیں ہے۔ اس اخلاقی روش میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی ہے جس کی بناء پر اسے ایک اخلاقی نظام کہا جا سکے اور جو اخلاق کی بنیادی بحثوں کو بھی شامل کئے ہو اور تربیتی و توصیفی بحثوں کو بھی عقلی ترتیب کے لحاظ سے پیش کئے ہو۔

اس روش پر لکھی ہوئی کتابیں، اخلاقی مواد و مطالب کے لحاظ سے غنی ہونے کے باوجود، شکل وصورت کے لحاظ سے مناسب ورضایت بخش نہیں ہیں محمد غزالی کی احیاء العلوم اور فیض کاشانی کی المحجۃ البیضاء جیسی کتابیں اس طرح کے اخلاقی مضامین کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اس کتاب میں ایسا قابل قبول قاعدہ ہے جو تینوں مذکورہ طریقوں میں پائے جانے والے مثبت نکات کی ترکیب اور ان کا مجموعہ ہے۔اسی کے ساتھ اس قاعدہ میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مذکورہ طریقوں میں پائی جانے والی کمیوں کو پورا کیا جائے۔

اس بناء پر اس قاعدہ میں اولاًیہ کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان اخلاق اسلامی کو شکل و مضمون کے لحاظ سے منطقی و عقلی قاعدوں کی بنیاد پر بیان کیا جائے۔ثانیاًعارفوں کے نتیجوں اور تجربوں سے حتی المقدور استفادہ کیا جائے اور ثالثاً اخلاقی فیصلوں کا معیار ہمیشہ قرآن و روایات کو قرار دیا جائے۔

اس روش میں کتاب خدا اور نبی اکرمؐ اوراُن کے اہلبیت اطہار ؑؑؑ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے جن خوبیوں کو گذشتہ اخلاقی طریقوں اور مکاتب میں شمار کیا گیا ہے، وہ سبھی موجود ہیں۔ اخلاق اسلامی میں وسعت کی بناء پر اصلی اخلاقی سوالوں کے جواب

بھیملیں گے اور اس میں اخلاقی مفاہیم پر بحث بھی شامل ہوگی اور اسی کے ساتھ طریقۂ کار اور تربیت کے عملی طریقوں اور قوانین کی توضیح بھی کی گئی ہے۔

یہاں اسلامی مفاہیم پر ایک خاص نظام حاکم ہے۔ ہر مفہوم کی دوسرے مفاہیم سے نسبتوں پر اور اخلاقی نظام کے مجموعہ میں ان کی اہمیت پر بھی دقت کی گئی ہے۔ اخلاق تربیتی پر زیادہ توجہ کے ساتھ ہی مخاطبین کے شعور کی مناسبت سے راستوں اور وسیلوں کو پہچنوایا گیا ہے اور اس میں مبدأ و مقصد، درجات و مراتب کا بھی خیال کیا گیا ہے۔

معرفت اور جہاد بالنفس پر خاص توجہ کے ساتھ ہی انسان کی عزت و شرافت و بزرگی پر بھی تاکید کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اخلاقی مفاہیم کو سمجھنے اور بیان کرنے اور عمل کی ترغیب کے لئے عقلی نتیجوں کو سامنے رکھ کر محبت و دوستی کو اس معنوی سفر کے لئے کامیاب اور نتیجہ تک پہنچانے والے وسیلےکے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

اس نظریہ کا وحی سے نسبت رکھنا اور اس کا شریعت کے مطابق ہونا اس کی جوہری خصوصیت ہے۔ اس کے باوجود، عقلی میزانوں، عرف و عقل کے مسلّم اصولوں، اور معنوی سفر میں پیش قدمی کرنے والے سچے لوگوں کے عملی تجربوں سے، نیز قرآن و سنت میں جو کچھ آیا ہے اسے سمجھنے، اس کی تفسیر، تطبیق و اجراء کرنے میں غفلت نہیں کی گئی ہے۔

اس بناء پر اس مقبول اخلاقی نظریہ کی کچھ خاص خصوصیتوں کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :

۱۔ مباحث کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا اور ان کے بر خلاف نہ ہونے کو واضح کرنا۔

۲۔ ایسا جامع نظام پیش کرنے کی کوشش کرنا جو تمام اخلاقی سوالوں کا جواب دے سکے۔

۳۔ ایک ایسی تفسیر پیش کرنا جو معتدل اور اخلاقی مفاہیم کے موافق ہو۔

۴۔ اخلاقی بحثوں کو عقلی لحاظ سے مطالعات کے تین حصوں (اصولی، توصیفی، ترتیبی) میں تقسیم و ترتیب دینا۔

۵۔ اخلاقی تربیت کے وسیلوں اور ان کی طبیعی ترتیب پر توجہ دینا اور ان کا شرعی ہونا۔

۶۔ تہذیب اخلاق (خوش اخلاقی) میں پیش قدم و کہنہ مشق (تجربہ کار) لوگوں کے تجربوں سے عملی فائدہ حاصل کرنا۔

۷۔ کتاب و سنت میں وارد ہوئے مصداقوں کے درمیان سے اخلاق کے کلی اصولوں اور قاعدوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

۸۔ عمل اور نفسانی ملکات کے مختلف حلقوں کے بارے میں اسلام کے نظریہ کو مستقل طور پر البتہ ہر ایک کی تأثیر پر توجہ کرتے ہوئے بیان کرنا۔

۹۔ فکر، نفسانی ملکات، رفتار و کردار پر آپس میں پڑنے والے ہر ایک کے اثرات پر توجہ کرنا۔

۱۰۔ اخلاقی مفاہیم کی تفسیر اور عمل میں، عقل، فطری رجحانات اور عملی آثار اور تجربوں کے مرتبہ پر توجہ کرنا۔

۱۱۔ اخلاقی لیاقتوں کے توازن اور اُن سب کی باہمی ترقی پر تاکید کرنا اور اُن میں افراط و تفریط سے پرہیز کرنا۔

۱۲۔ اخلاقی قوانین کو استعمال کرنے میں مخاطبین کی خاص حالت و کیفیت پر توجہ کرنا۔

د: اخلاق اسلامی کے مباحث کی تقسیم

یہ اخلاق، اسلامی مفہوم کے مطابق اور قرآن و عترت اطہار ؑ کے ذریعہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس کی روشنی میں علم اخلاق کے اُن بنیادی سوالوں کا جن کی گفتگو آج فلسفۂ اخلاق میں کی جاتی ہے، جواب دیتا ہے اور مطلوب و کامل انسان کو نفسانی صفات اور عمل کے مختلف نمونوں کے طور پر نمایاں بھی کرتا ہے۔

ان دو مسئلوں کے علاوہ، مثالی انسان اور سب سے بلند معنوی مقامات تک پہنچنے کے لئے علمی و اجرائی، عملی قاعدوں اور ضابطوں کو پہچنواتا ہے۔ اس بناء پر اخلاق اسلامی منظّم و مرتّب طور پر مندرجہ ذیل تین فصلوں میں تقسیم و ترتیب پاتا ہے

:۱۔اخلاق کی بعض بنیادی اور فلسفی بحثیں اخلاق کی حقیقت اور اخلاقی عمل کے ضروری عناصر سے واقفیت اور ان کو پہچنوانا۔

۲۔اخلاقی خوبیوں اور برائیوں کی توصیف نفسانی صفت کے عنوان سے بھی اور عمل کے مختلف حدود میں بھی۔

۳۔اخلاق تربیتی انسان کو اخلاقی فضیلتوں سے آراستہ اور برائیوں سے پاک کرنے کے لئے وسیلوں اور طریقوں کو بیان کرنا۔

دوسری فصل

اخلاق کی جاودانیمقدمہ

۱۔ مسئلہ کی وضاحت: ناقص بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا، چوری کرنا، قومی برتری پر اعتقاد رکھنا وغیرہ بعض گذشتہ معاشرے میں جائز مانا جاتا تھا اور اُنھیں اخلاق کے خلاف شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ آج معاشرے کی اکثریت ان چیزوں کو غیر اخلاقی مانتی ہے۔اس زمانے میں بھی مختلف تہذیبیں اخلاقی فضائل ورذائل کے بارے میں متعدد قسم کے نظریات رکھتی ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ بعض معاشرے ''چند بیویوں،، کے ہونے کو جائز اور حجاب کو ضروری جانتے ہیں، اکثر عیسائی تہذیبوں میں ''چند بیویوں،، کا ہونا غیر اخلاقی بات اور حجاب کو غیر ضروری جانا جاتا ہے۔

اس طرح کی حقیقتوں پر توجہ کرنے سے ہم اخلاق سے متعلق ایک اہم سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ کیا اچھی اور بری اخلاقی عادتیں اور خصلتیں آفاقی و جاودانی ہیں ؟اخلاقی عدالتوں نے انسانوں کی ظاہری اور باطنی صفتوں کے لئے جن احکام کو صادر کیا ہے کیا وہ عالمی اور ابدی اعتبار رکھتی ہیں ؟ دوسرے لفظوں میں کیا اخلاقی خوبیا ں اور برائیاں مطلق اور عام ہیں یا نسبی خصوصیتیں رکھتی ہیں اور تنہا کسی خاص دور اور زمانہ یا خاص مکان و معاشرہ اور مخصوص حالات کے لئے اعتبار اور معنی رکھتی ہیں ؟

۲۔ بحث کی تاریخ: اس بحث کی شروعات قدیم یونان کے زمانہ تک پہنچتی ہے اور مغربی ملکوں کے جدید علمی زمانہ میں بھی یہ سوال اخلاقی فلسفیوں کے لئے ایک بنیادی سوال بن گیا ہے۔ اسلامی مکاتب میں اخلاق کے نسبی رجحان کو اشعری متکلمین کے یہاں پایا جا سکتا ہے،

اگرچہ ان لوگوں نے اشیاء کے عقلی وذاتی حسن وقبح سے انکار کرنے میں '' اخلاقی نسبیت (Ethical relataivity)''کی اصطلاح سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔

لیکن یہ بحث موجودہ زمانہ میں مسلمان دانشوروں کے علمی حلقوں میں بھی ایک بلند درجہ رکھتی ہے اور مختلف زاویوں سے اس پر بحث کی گئی ہے۔

۳۔ موضوع کی دینی اہمیت: اُن آثار کے علاوہ جو اس بحث کے نتیجوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور آگے بیان کئے جائیں گے یہ موضوع مسلمانوں کے سب سے زیادہ بنیادی و کلیدی عقیدوں اور اعتقادی و ایمانی ارکان میں سے کسی ایک سے بہت زیادہ نزدیکی رابطہ رکھتا ہے۔ اسلام کا مکمل اور خاتم ہونا اور نتیجۃً اس کا عالمی اور جاودانی ہونا ایسی خصوصیت ہے کہ اسے گذشتہ و حال کے لگھروں سے آزاد کرتا ہے۔

مسلمانوں کا یہ عقیدہ، گذشتہ وآئندہ کے ادیان سے بشر کے بے نیاز ہونے کو بیان کرتا ہے، اخلاق کا جاودانی ہونا اس بات کی تاکید ہے کہ جغرافیائی موقعیت، تاریخی ادوار، زمان و مکان کے حالات، دینی تعلیمات اور منجملہ ان کے اخلاقی احکام اس کو اپنے زیر اثر قرار نہیں دیتے ہیں مگر ان مجاز و بہتر راستوں سے جسے دین نے خود معین کیا ہے۔

وہ مبانی و نظریات جو نسبیت کو اچھائیوں اور برائیوں کے دائرہ میں قبول کرتے ہیں، اسلام کے کمال اور خاتمیت کی معقول تفسیر کے سلسلہ میں ٹکراتے نظر آتے ہیں۔ اس بناء پر مذکورہ اصل کی پابندی، اخلاقی مفاہیم میں ثبات واطلاق کے اثبات کی مرہونی ہے۔

یہ بات ثابت ہونا چاہئے کہ اخلاقی موضوعات کی ابتدائی طبعیت ہمیشہ ایک حکم رکھتی ہے اور جغرافیائی اختلاف زمانہ کا گذر، تہذیبوں کا اختلاف، ایک اخلاقی موضوع کے اچھائی یا برائی سے متصف نے میں کوئی اثر نہیں رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ سوال کا جواب دینے کا ہمارا طریقہ اخلاق کے سلسلہ میں ہمارے نظریہ کو بھی بیان کرے گا اور اخلاقی تحقیقات کے تانے بانے پر بہت اثر ڈالے گا اور نہ صرف اخلاقی اچھائی اور برائی کے سلسلہ میں ہمارا فیصلہ بدل جائے گا بلکہ اخلاق میں بحث کے طریقے، اس کے منابع اور یہاں تک کہ اخلاقی احکام کے مخاطبین کے حدود کو بھی بیان کرے گا۔

۴۔اطلاق اور نسبیت کا مفہوم: اخلاقی مطلق پسندی سے مراد اس عقیدہ پر زور دینا ہے کہ اخلاقی اصول و تعلیمات، اخلاقی موضوعات کی ذات اور ان کے حقیقی آثار ونتائج کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز سے وابستہ نہیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کسی موضوع کے اچھے یا برے ہونے کی جو چیزیں سبب بنتی ہیں صرف موضوع کی ذات میں موجود عناصر کا مجموعہ اور اس پر پڑنے والے واقعی آثار ہیں نہ کہ اس سے باہر کے حالات و حوادث۔ جیسے کسی سماجی، اجتماعی، ثقافتی، اقتصادی زندگی کے حالات یا فاعل کے ذوقی ونفسیاتی حالات۔ اس بناء پر بوڑھوں کی مناسب طریقہ سے دیکھ بھال کرنا، ابتداء سے پرہیزگار و پاک دامن رہنا اور اخلاقی لحاظ سے دوسروں کی عزت کی حفاظت کرنا اگر ایک پسندیدہ عمل مانا گیا ہے تو اصولی طور پر ہر زمان ومکان میں اور ہر فاعل کے ذریعہ تمام حالات میں اسے سراہا گیا ہے اور اخلاقی بھی مانا گیا ہے مگر یہ کہ حالات کا بدل جانا عمل کی ماہیت میں تبدیلی کا سبب قرار پائے یا قدروں کے درمیان کش مکش کا سبب بن جائے[1]۔

نسبیت یعنی ایک شئے کا اس کے اصلی آثار اور ذات سے خارج و متغیر امر یا امور سے وابستہ ہونا۔ اس بناء پر ایک اخلاقی مفہوم کی نسبیت خواہ فضیلت ہو یا رذیلت اس طرح سے ہے کہ ایک باطنی صفت یا ظاہری رفتار پر اس کا صادق آنا یا نہ آنا معلوم ہو اور وہ صفات (باطنی یا ظاہری ہوں) اپنے اصلی آثار اور حقیقت سے خارج اور متغیر عناصر سے وابستہ ہوں۔ جیسے اس صفت کا حامل انسان یا اس رفتار سے مربوط فاعل، وہ سماج جس میں وہ انسان زندگی گذار رہا ہے اور جس میں وہ قاعدہ و طریقہ پایا جاتا ہے، اور اس زمانہ کے حالات۔ مثلاًبوڑھوں سے متعلق رفتار، اخلاقی لحاظ سے ہمیشہ ایک حکم نہیں رکھتی۔ یا مختصر شراب پینا یا حجاب کی پابندی نہ کرنا، عیسائی سماج میں زندگی بسر کرنے والے کے لئے ایک اخلاقی برائی شمار نہیں کی جاتی لیکن اسلامی سماج میں زندگی گذارنے والے کے لئے ایک برا اور اخلاق کے خلاف عمل مانا جاتا[2] ہے۔

[1] اسی کتاب میں اخلاقی قدروں میں تزاحم اور ترجیح کا معیار اور سوالات وجوابات کی طرف (صفحہ ۶۷ پر)
[2] علامہ طباطبائی: المیزان، ج: ۱، ص: ۳۷۶، ۳۷۷۔

ایک موضوع کو اخلاقی اچھائی یا برائی سے متصف ہونے کے اعتبار سے موضوع کی ذات اور اس کے اصلی آثار سے باہر کس متغیر چیز کے تابع قرار دیا جائے اس کے لئیا خلاقی نسبت پسندی کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

ایک کلی تقسیم کی بناء پر[1] وہ لوگ جو اخلاقی اصول کو سماجی تہذیب کی تبدیلی کے تابع قرار دیتے ہیں وہ نسبیت قرار دادی[2] کے طرفدار ہیں اور وہ لوگ جو اسے انسان کی خواہش اور انتخاب کے تابع قرار دیتے ہیں، نسبیت ذہنی[3] کو قبول کرتے ہیں۔

ان کے مقابلہ میں وہ لوگ جو اخلاقی اصول کے لئے عینی وخارجی اصل اور مبدأ کے قائل ہیں وہ اصالت عین[4] کے طرفدار ہیں۔ دوسری تقسیم کے لحاظ سے اخلاقی نسبیت پسندی کی قسموں کو مندرجہ ذیل طریقہ سے بیان کیا جاسکتا ہے :

١۔ علم حیات کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: اخلاقی اصول، انسان کی متغیر زندگی کے حالات کے تابع ہیں۔

٢۔ علم سماجیات کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: اخلاقی اصول اس سماج کے متغیر حالات کے تابع ہیں جس میں انسان زندگی گذارتا ہے۔

٣۔ علم نفسیات کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: اخلاقی مفاہیم، انسان کے متغیر نفسیاتی حالات اور اس کے ذوق وشوق، رغبت وسلیقہ کے تابع ہیں۔ اس طرح کی قسم کو کبھی ذوقی نسبیت پسندی یا (نظریۂ اصالت وجود {Egzistansialism} (اگزسٹیا لیسٹی بھی کہتے ہیں۔

٤۔ تہذیب وثقافت کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: اخلاقی فضائل و رذائل اخلاقی سماج کے آداب و رسوم کے پابند ہیں۔

---

[1] لوئس پویمن۔ نقدی برنسبیت اخلاقی، ترجمہ فتح علی۔ (بحوالۂ مجلّہ نقد و نظر، ش ١٣، ١٤، ص٣٢٦)
[2] Conventional
[3] Subjectivism
[4] Objectivsm

۵۔ مادہ پرستی کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: کسی صفت یا رفتار کی اچھائی یا برائی کا معیار، انسانوں کے درمیان مادی لحاظ سے برابری اور مساوات کو ایجاد کرنے اور امکانات کو مساوی لحاظ سے تقسیم کرنے کے سلسلہ میں اس کی تاثیر و کارکردگی کو قرار دیا گیا ہے[۱]۔

الف۔ اخلاقی نسبیت پسندی کے نتیجے: کلی طور پر اور ہر اس دلیل و مبنیٰ کی بنیاد پر جسے دعوے کے طور پر پیش کیا جائے، اخلاقی نسبیت کا رجحان، تباہ کن نتائج کا حامل اور غیر قابل قبول ہے اور وہی دلیلیں اسے باطل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس کے بعض کلی اور مشترک نتیجے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ذمہ داری کا سلب ہونا: اخلاق مطلق اور عمومی و جاودانی اصول سے انکار کرنے سے کسی بھی انسان کو اس کی رفتار کے مقابلہ میں، اخلاقی لحاظ سے اور بہت سی جگہوں پر حقوقی لحاظ سے بھی ذمہ دار نہیں مانا جاسکتا ہے[۲]۔

۲۔ اخلاقی احکام کا بے ثمر ہونا: اخلاقی احکام اور قضیے اس صورت میں مفید ہیں جب وہ تاثیر گذار ہوں۔ اس کے علاوہ مخاطبین کے ذوق و شوق، تسلیم و رضا کو پروان چڑھائے اور ان کو ایثار و فداکاری کے لئے آمادہ کرے۔

یہ چیزیں عام و مطلق کی حقانیت اور اخلاقی اصول کی جاودانی کو قبول کرنے اور ان سے عشق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاقی نسبیت کا رجحان ان تمام امور سے ٹکراؤ رکھتا ہے اور ہر طرح کے مشترک اخلاقی اصول کی سفارشوں سے لگاؤ اور اس سے محبت کی گرمی کو ٹھنڈا کردیتا ہے[۳]۔

جس کے نتیجہ میں تبلیغ و ہدایت اور ارشاد و تربیت بے معنی ہیں اور خدا کے نبیوں اور ولیوں کو بشر کی ہدایت کے لئے نہ کسی اجازت کی ضرو ہوگی اور نہ ہی سماجی مصلحین اپنی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے لوگوں کے کسی معقول جواب کے منتظر رہ سکتے ہیں۔

---

[۱] پُل رو بیجک: موافق و مخالف اگزسٹنسیالیزم، ترجمہ: سعید عدالت نژاد، نقل ازمجلہ ء نقد و نظر، ش۱۳-۱۴، ص: ۳۰۰تا۳۲۳۔
[۲] پُل رو بیجک: ایضاً، (نقل ازمجلہ ء نقد و نظر، شمارہ: ۱۳-۱۴، ص: ۳۰۵)
[۳] پُل رو بیجک: (نقل ازمجلہ ء نقد و نظر، شمارہ: ۱۳-۱۴، ص: ۳۱۲)۔

۳۔ دین کے مکمل اور جاودانی ہونے کی نفی: اخلاق دین کی نظر میں ایک بلند اور وسیع مرتبہ کا حامل ہے۔ اور اتنا بلند ہے کہ اس کی نظر میں تکوین و تشریع کا اصل مقصد، اخلاق کی عالی فضیلتوں تک پہنچنا اور اسے حاصل کرنا بتایا گیا ہے۔اسی وجہ سے دین کی تمام تعلیمات میں اخلاقی باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اکثر دینی تعلیمات براہ راست اخلاقی موضوعات کے بارے میں ہوتی ہیں۔

اس حقیقت پر توجہ کرتے ہوئے اخلاقی احکام کے عدم ثبات اور تغیّر کو قبول کرنا دینی تعلیم کا عصری اور وقتی ہونا مانا جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دین کے کامل اور خاتم ہونے کی نفی کردی جائے۔ اس بناء پر اخلاقی نسبیت اور دین کا عالمی و جاودانی ہونے میں ٹکراؤ نظر آتا ہے جبکہ کمال اور خاتمیت دین کی شان ہے۔

۴۔ اخلاقی شکاکیت : اخلاقی نسبیت پر اعتقاد رکھنے سے کسی اخلاقی موضوع کے سلسلہ میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔ اخلاقی نسبیت پسندی سے تہذیبی ماحول اور کسی خاص سلیقہ کے تحت، صداقت کے قبیح ہونے کے بارے میں کسی فیصلہ کا جتنا احتمال ہوسکتا ہے اتنا ہی حسن صداقت کے سلسلہ میں بھی ممکن ہے۔ اخلاقی نسبیت پسندی، واقعیت کی توصیف اور اسے بیان کرنے والے کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ اخلاقی احکام کی ماہیت کے بارے میں اپنے نظریہ کو بیان کرنے کی حیثیت سے ہے اور اس کے مطابق اخلاقی اصول کا سالم وناسالم ہونا، انسان یا سماج کے متغیر عوامل پر منحصر ہے۔ اس بناء پر کسی اخلاقی موضوع کے بارے میں کوئی مستقل فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہی اخلاقی شکاکیت ہے۔

۵۔خادموں اور خائنوں کا یکساں ہونا :اخلاقی نسبیت کا سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور وجدان کے خلاف نتیجہ یہ ہے کہ خدمت وخیانت، اصلاح وجنایت، خیر خواہی وشرارت وغیرہ اخلاقی دائرہ میں سبھی برابر اور سبھی ایک نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ایک ہی طریقہ سے ان کی تعریف و تنقیص ہوتی ہے۔اس بناء پر فرعون و معاویہ کا عمل اتنا ہی معقول ہوگا جتنا حضرت آسیہ و حضرت زینب ۲۲۸ کے عمل کو پسندیدہ کیا گیا ہے۔

ب۔ اخلاق میں مطلق پسندی اور اس کی دلیلیں اخلاقی نسبیت کے رجحان کے تباہ کن نتیجوں پر توجہ کرنے کے بعد ضروری ہے کہ جاودانہ اخلاق کی معقول اور عقلی بنیادوں پر بیان کیا جائے اور اُن نظریاتی اختلافات اور نقصانات کو راستہ سے ہٹا دیا جائے جو اس نظریہ کے لئے خطرہ کا باعث ہیں۔ اس نظریہ کو حاکم بنانا اور اس کا معقول قوام واقتدار حاصل کرنا اس شرط کے ساتھ ہے کہ اپنے دعوے کو عقل و برہان کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

ا۔پائدار اخلاق کی نشاندہی کی ضرورت: اخلاقی نسبیت کے رجحان کے بعض نتیجوں پر اجمالی نظر ڈالتے ہی اخلاق کے جاودانی ہونے کی ضرورت آشکار ہوجاتی ہے۔

انسان کا با مقصد ہونا اور اس کا اپنی ذمہ داری کو قبول کرنا، تعلیم و تربیت اور ترغیب وترہیب (ڈرانے) کی حکیمانہ توجیہ، عدل وظلم کے بارے میں گفتگو کا امکان، انسانی حقوق کا دفاع اور اس کی حق تلفی کے خلاف جنگ، فضیلت ورذیلت، خیر و شر، خائن وخادم، جزاء و سزا، ثواب وعقاب، جنت وجہنم، عادل وفاسق کے درمیان تمیز پیدا کرنا، انبیاء واولیاء کی رسالت، مصلحین اور خیر خواہوں کی کوششوں کا دفاع کرنا، ابدی اور کامل دین کی طرفداری، اخلاقی حسن وقبح کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے عمومی اصولوں اور معیاروں کی نشاندہی کا امکان اور دسیوں اور سیکڑوں ایسے انسانی زندگی کے اصول و ارکان جن کو نظر انداز کرنے سے انسانی زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا لہٰذا اُن کی بقاء صرف ثابت اور پائدار اخلاقی اصولوں کو قبول اور بیان کرنے اور اُن کی نشاندہی کرنے سے ممکن ہے۔

۲۔ اخلاق کے جاودانی اصولوں کو بیان کرنا: مختلف اخلاقی مکاتب میں اخلاق کے جاودانی اصولوں کی عقلی تفسیر مختلف شکلوں میں کی جاتی ہے۔یہاں اختصار کے طور پر اخلاق کی صرف اُن بحثوں کا ذکر ہوگا جو اسلامی دائرہ میں داخل ہیں۔

اس دائرہ میں اخلاق جاودانہ کے عقلی بنیادوں کو بیان کرنے کے لئے جس مطلب کو سب سے زیادہ قوی مانا گیا ہے وہ حقیقت میں اخلاقی فرائض کی بحث کے سلسلہ میں علامہ طبا طبائیؒ کی قائم کردہ بنیادوں سے اخذ شدہ نظریہ ہے۔ اس نظریہ کی مختصر شرح درج ذیل عبارت میں بیان کی جارہی ہے۔

اخلاقی مفاہیم، انسان کے اختیاری افعال کے درمیان عینی اور حقیقی رابطوں کا نتیجہ اور مظہر ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ مفاہیم اُن دونوں (عینی اور حقیقی رابطوں) کے درمیان پائے جانے والے علت و معلول کے رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ رابطہ فاعل کے علم وجہل و ارادہ اور سماج پر حاکم حالات سے آزاد و مستقل اور حقیقی ہوتا ہے۔ اخلاقی خوبی و بدی اور اوامر و نواہی اسی واقعی و تکوینی نسبت کا مظہر ہیں، اسے جیسے انسان کے اختیاری فعل کا اس کے نفسانی کمال پر پڑنے والی تأثیر کی نوعیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ رابطہ، عینی وتکوینی ہے اور علیت کے رابطہ کی نوعیت سے متعلق ہے لہٰذا وہ تغیر و تحوّل سے دوچار نہیں ہوتا۔ دونوں (عینی اور حقیقی) روابط کے ثبات و پائداری کی وجہ سے یہ نسبت ثابت و جاودانی ہے۔

اس طرح اس سے حاصل اخلاقی مفاہیم بھی عالمی اور جاودانی ہیں۔ کیونکہ انسان کی روح اور حقیقت میں جو رابطہ کا ایک سرا ہے تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اور وہ مشخص فعل اور عمل بھی جو اخلاقی حکم کا موضوع اور رابطہ کا دوسرا سرا ہے، اسے بھی واحد اور ثابت فرض کیا گیا ہے[1]۔

کتاب و سنت کی نظر میں بھی انسان کی واقعی شخصیت اور روح پر اس کے اختیاری اعمال کا رابطہ اور اثرایک حقیقی اور عینی امر ہے۔ یہ حقیقت قرآن میں جابجا نظر آتی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند مورد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے قرآن کریم اُن لوگوں کے بارے

---

[1] علامہ طبا طبائی، اصول فلسفہ و روش رئالیسم، مقالہء اعتباریات و رسائل سبعہ، مقالہء اعتباریات, استاد مطہری کی جاودانگی و اخلاق، یاد نامہ استاد مطہری، ج: ۱، ص: ۴۱۰ ،۴۱۸ وانہی استاد کی: حکمت عملی، ص: ۱۴، ۲۰ و اسلام و مقتضیات زمان ج: ۱، ص: ۳۴۱ ، ۳۵۱ و ج: ۲، ص: ۲۴۶۔

میں جو قیامت اور آیات الٰہی سے انکار کرتے ہیں، فرماتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کی بد اعمالیوں کی تاریکی نے ان کے دلوں پر غلبہ حاصل کر لیا ہے[1]۔ علامہ طباطبائی کے قول کے مطابق اس آیت سے معلوم ہوتا ہے :

۱۔ برے اعمال کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور وہ انسان کے نفس کو اپنے مطابق بنا دیتی ہیں۔

۲۔ یہ نقوش اور صورتیں، نفس اور حقیقت کو درک کرنے میں مانع اور حائل ہو جاتی ہیں۔

۳۔ نفس اپنی ابتدائی طبیعت کے لحاظ سے ایسا پاک اور نورانی ہوتا ہے کہ حقائق کو درک کر سکتا ہے اور حق و باطل کے درمیان تمیز پیدا کر سکتا ہے[2] اسی طرح قرآن کریم میں آیا ہے کہ جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا خدا اس کے لئے نجات کا راستہ کھول دے گا[3]۔ اور فرمایا کہ اے ایمان لانے والو! اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کرو گے تو حق و باطل میں تشخیص کی قدرت تم کو وہ عطا کر دے گا[4]۔

علامہ طباطبائی مرحوم اِن آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں '' :معرفت'' حاصل کرنے کے لئے تقویٰ ایک مستقل ذریعہ نہیں ہے بلکہ تقویٰ انسان کی طبیعت کے اپنے فطری اعتدال پر پلٹنے کے لئے سبب بنتا ہے اور یہ اعتدال اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان کی رغبتیں پہلے کی بہ نسبت عالی بن جائیں اور اس کے ذریعہ بہتر اعمال انجام پائیں۔

یعنی اعمال صالح، پسندیدہ اور نیک اخلاق کی حفاظت کا ضامن نیز حقیقی معرفت، مفید علوم اور صحیح افکار کی پیدائش کا موجب بنتا ہے[5] اس بیان میں فضیلتوں اور رذیلتوں کے پیدا ہونے کے اسباب کے ثابت ہونے کی کیفیت کی شرح کے ساتھ خوبی اور بدی کے اطلاق اور اثبات کو نتیجہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی جب انسان کی باطنی طاقتیں ثابت ہیں اور ان میں

[1] سورۂ مطففین، آیت: ۱۴۔
[2] علامہ طباطبائی: المیزان، ج: ۲۰، ص: ۱۳۴۔
[3] سورۂ: طلاق، آیہ: ۲۔
[4] سورۂ: انفال، آیہ: ۲۹۔
[5] علامہ طباطبائی: المیزان، ج: ۹، ص: ۵۶ و ج:۱۹، ص۳۱۳و۳۱۵۔

افراط وتفریط و اعتدال جیسی تینوں حالتیں بھی ایک ہی طرح ہیں، لہٰذا اخلاقی فضایل ورذایل جو انھیں حالات سے وجود میںآتے ہیں بالطبع ثابت ہوں گے اور نسبیت وتبدیلی سے دور ہوں گے۔ یہ بیان باطنی قوتوں سے مربوط ایک خاص معرفت شناسی پر مبنی ہے۔

یہاں کوشش کی گئی ہے کہ عقلی لحاظ سے اورانسان کی نفسانی قوتوں کی مخصوص وضاحت پر تکیہ کرتے ہوئے تمام اخلاقی مفاہیم کی تفسیر کی جائے۔ اخلاق اسلامی کے وہ مشہور منابع جو فلسفی نظریات پر مبنی ہیں، اس شیوہ کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ روش ایک ایسے نظام سے متأثر ہے جسے ارسطو نے اخلاقی قضیوں کو بیان کرنے کے لئے پیش کیا ہے۔[1]

ج۔ سوالات اور جوابات اس بحث کی تکمیل کے لئے مناسب ہے کہ ایسے بعض شبہات جو ممکن ہے اسی طرح بیان کئے جاتے ہوں، سوال و جواب کی شکل میں تحقیق کی جائے۔ اس مربوط واصلی سوالات مندرجہ ذیل ہیں :

پہلاسوال:اگر اخلاقی اصول، مطلق اور جاودانی ہوتے ہیں تو استثنائات کے لئے کیا توجیہ اور تفسیر کی جا سکتی ہے؟

پہلا جواب: حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی احکام استثنا نہیں ہوتے اور جس وقت اخلاقی حکم کا موضوع محقق ہوتا ہے اسی وقت اس کا حکم بھی اس کے لئے ثابت ہوجاتا ہے ہاں، کبھی اخلاقی حکم کے اصل معیار میں خطا نظر آتی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں: ''سچ بولنا اچھا ہے'' لیکن اگر یہ کسی بے گناہ کا خون بہنے کا سبب بن جائے یا اسلام کے دفاعی نظام کے اسرار کے فاش ہونے کا موجب قرار پائے تو ایسے موقعوں پر ''سچ بولنا اچھا نہیں ہے''یہاں اخلاقی حکم عمومی اور کلی قاعدوں سے جدا ہوگیا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ہم نے اخلاقی حکم کے موضوع کو اس کی تمام خصوصیتوں اور قیدوں کے ہمراہ پہچنوانے میں خطا کی ہے۔ پہلے والے حکم میں اس کا واقعی موضوع ''سچ بولنا کسی بڑی خرابی اور فساد کے بغیر مفید ہونا''ہے قطعی طور پر ان تمام موارد میں جہاںیہ موضوع محقق ہوتا ہے سچ بولنے کا حکم موجود رہے گا۔

---

[1] اشیاء اور افعال کے ذاتی وعقلی حسن وقبح کو قبول کرنے کی بناء پر۔ جسے شیعہ اور معتزلہ قبول کرتے ہیں۔انسان کا اختیاری عمل، مصلحت کی بناء پر اچھااور مفسدہ وفساد کی بناء پربرا ہوجاتا ہے۔البتہ مصلحت اور مفسدہ کی تشخیص میں اور ان کی اہمیت کے توازن میں عقل کے علاوہ وجدان، فطرت اور وحی بھی بہت زیادہ اثر رکھتی ہے

سچ بولنا اگر بے گناہوں کا خون بہنے وغیرہ کا سبب بنے تو یہ معاملہ اخلاقی نہیں ہے[١]۔

دوسرا جواب: اخلاقی اصول استثناء کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ لیکن ایسی جگہ پر جہاں غیر ضروری اور نا مناسب نتائج کا سامنا ہوتا ہے ایسی حالت میں ایک خارجی فعل، دو عنوان کا مصداق بن جاتا ہے۔ جیسے پہلے جواب میں درج مثال۔ اُن دو عنوانات میں ایک سچ بولنا ہے اور دوسرا بے گناہ کا قتل یا اسلامی فوج کے اسرار کا فاش کرنا۔ اس بناء پر ایک ہی عمل ایک لحاظ سے اچھا ہے اور دوسرے لحاظ سے برا۔ ایسی جگہوں پر مجبوراً ایک ہی طرف کو انتخاب کیا جائے گا۔ کیونکہ یا اس عمل کو ترک کیا جائے یا انجام دیا جائے۔ یہاں تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔

عمل کے ترک کرنے یا انجام دینے کے انتخاب میں مجبوراً اس کے حسن وقبح کے درجات کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا: اگر ان کی اچھائی یا برائی مرتبہ کے لحاظ سے ایک ہے تو اسے انجام دینے میں انسان نہ مذمت کا مستحق ہے اور نہ تعریف کا۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر مقدم ہے تو اسی کو انتخاب کرنا چاہئے۔ اس بنا پر خوبی اور بدی (اچھائی اور برائی) مطلق ہیں لیکن کبھی عمل کے مرحلہ میں دونوں یکجا ہوجاتے ہے۔ یہاں ان دونوں کے تداخل کو پہلے بیان کی گئی ترتیب سے حل کرنا چاہئے[٢]۔

تیسرا جواب: اخلاقی فعل و رفتار، اخلاقی خصلت و عادت سے جدا ہے۔ اخلاق کا مطلق ہونا یعنی اخلاقی فعل ورفتار کا مطلق ہونا نہیں ہے۔ اس شبہہ کے پیدا ہونے کی وجہ، اس ظریف نکتہ سے غفلت کا نتیجہ ہے ممکن ہے۔ کہ ایک فعل ایک اعتبار سے اخلاقی ہو اور دوسرے اعتبار سے غیر اخلاقی۔ مثال کے طور پر بچہ کی جسمانی تنبیہ کرنا مطلقاً اچھا ہے اور نہ ہی خراب۔

لیکن کبھی یہ رفتار زیادتی و ظلم کا مصداق اور اخلاقی لحاظ سے بری بن جاتی ہے۔ لیکن جب بچہ کی تادیب کے لئے یہی طریقہ باقی رہ جائے تو اخلاقی لحاظ سے یہی اچھا ہے۔ اس بنا پر اخلاقی مفاہیم اور خصلتیں مطلق ہیں اور اخلاقی افعال و رفتار نسبی۔ یہاں اخلاقی

[١] مصباح یزدی، محمد تقی: دروس فلسفہ ء اخلاق، ص: ۴۱، ۱۸۷تا ۱۸۹۔
[٢] مصباح یزدی، محمد تقی: دروس فلسفہ ء اخلاق، ص: ۱۸۶و ۱۸۷۔

احکام کا موضوع اخلاقی مفاہیم اور خصلتیں ہیں نہ کہ خاص افعال و رفتار۔ انسان کے افعال و رفتار پر اس وجہ سے کہ وہ کس اخلاقی مفہوم کا مصداق ہے، اخلاقی حکم لگایا جاتا ہے اور چونکہ ایک رفتار مختلف حالات میں مختلف اخلاقی مفاہیم کا مصداق بن سکتی ہے لہٰذا اُس پر مختلف اخلاقی احکام لگائے جائیں گے۔ یہ بات ''اخلاقی احکام میں نسبیت'' کے معنی میں نہیں ہے[1]۔

دوسرا سوال: بعض روایات کے مطابق عورت و مرد کے اخلاقی احکام میں فرق ہے۔ گویا یہ ایسا ہے کہ اسلام کی نظر میں بھی اخلاقی مفاہیم نسبی ہیں۔ جیسے حضرت علی ـ کی یہ فرمائش کہ ''عورتوں کی سب سے اچھی خصلتیں مردوں کی سب سے بری خصلتیں ہیں: جیسے تکبر، بزدل ہونا، کنجوس ہونا۔ لہٰذا جب عورت مغرور ہوتی ہے سر نہیں جھکاتی ہے اور جب کنجوس ہوتی ہے اپنا اور اپنے شوہر کا مال محفوظ رکھتی ہے اور جب بزدل ہوتی ہے اس کے سامنے جو آتا ہے اس سے ڈرتی ہے[2]۔

اس فرمائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اخلاقی مفاہیم، انسانوں کے آدھے حصہ (مردوں) کے لئے بُرے اور باقی آدھے حصّہ (عورتوں) کے لئے اچھے اور پسندیدہ ہیں۔

جواب: اس روایت میں اس فرمائش کا موضوع، خاص حالات و شرائط کے تحت رفتار و عمل کا وجود میں آنا ہے۔ عورتوں کے لئے تکبر کا پسندیدہ قرار پانا، نا محرم مردوں کی متکبرانہ رفتار کے مقابلہ میں ہے۔ کیونکہ روایت اس حکم کے بیان کی دلیل میں کہتی ہے : ''اگر عورت، نا محرم مرد کے مقابلہ میں اس طرح کی بزرگانہ و متکبرانہ رفتار رکھتی ہے تو دوسروں کے لئے سوء استفادہ اور دست درازی کا امکان نہیں رہتا ہے''۔

عورتوں کے خوف کی تعریف بھی ان کی اپنی عفت و پاکدامنی کے لئے محتاط رہنے کے معنی میں ہے۔ یعنی جب بھی ان کی عفت خطرہ سے دوچار ہو تو انھیں احتیاط کو ترک کرنا اور بے پروا نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح عورتوں کے لئے کنجوسی کو اچھا قرار دینا اصل

[1] استاد مطہری، مرتضیٰ: تعلیم وتربیت در اسلام، ص: ۱۴۸ تا ۱۵۶۔
[2] نہج البلاغہ، فیض اسلام، حکمت ۲۲۶۔

میں ان کے اپنے شوہر کے مال کو استعمال کرنے کے لئے ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی ۔ آگے فرماتے ہیں کہ: ''عورت کا بخل سے کام لینا سبب بنتا ہے کہ اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان مشترک مال محفوظ رہے۔،، اس بنا پر تکبر، خوف اور بخل، عورت اور مرد کے تئیں نفسانی خصلتوں کے عنوان سے ایک ہی اخلاقی حکم رکھتے ہیں۔ لیکن نا محرم مرد کے مقابلہ میں عورت کی متکبرانہ رفتار اور اس کی اپنی عفّت کے واسطے محتاط رہنا، اور اپنے شوہر اور اپنے کنبہ کے مشترک مال کو استعمال کرنے میں بخل سے کام لینا ایک پسندیدہ عمل ہے۔اور اس طرح یہ وسیلہ اخلاقی نسبیت تک (یہ کہ وہی اخلاقی عادتیں اور خصلتیں ہیں) نہیں پہنچ سکتا ہے۔

تیسرا سوال:علوم انسانی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال ایک گروہ کے درمیان اچھے اور دوسرے گروہ کے نزدیک برے مانے جاتے ہیں، مثلاً بعض کے نزدیک احترام کی خاطر سر سے ٹوپی اتارنا اچھا اور بعض دوسروں کے یہاں بے احترامی اور بے ادبی مانا جاتا ہے۔ اس طرح کے دوسرے بہت سے اعمال ہیں یہ اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کے نسبی ہونے کی دلیل ہے[1]۔

جواب: مذکورہ رفتار اور ان سے متعلق نظریات میں اختلاف علم اخلاق کے دائرہ سے باہر ہے۔ حقیقت میں اس طرح کے امور ایک سماج کے آداب و رسوم اور عرف کو تشکیل دیتے ہیں۔ آداب و رسوم قرار دادی (اعتباری) ماہیت رکھتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں قرار دادی اعتباریات کی قسموں میں سے ہیں، جو نہ ہی خارجی وجود رکھتی ہیں اور نہ ہی خارجی حصول کے لئے سبب بنتی ہیں بلکہ ایک سماج میں وہاں رہنے والے لوگوں کے قولی یا عملی توافق سے وجود میں آتی ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف معاشرہ کے لوگوں سے وابستگی متفاوت اور نسبی ہے البتہ اُن کا نسبی ہونا اخلاقی احکام نسبیت کا سبب نہیں ہے[2]۔

---

[1] دورانٹ: لذات فلسفہ، ص ۸۳ تا ۹۹۔
[2] استاد مطہری، مرتضیٰ: اسلام و مقتضیات زمان ج: ۲، ص: ۲۴۸ تا۲۵۸

چوتھا سوال: ادیان و مکاتب اور جوامع کے درمیان ایسے موضوعات جو ذاتی طور پر علم اخلاق کے دائرہ میں داخل ہیں اُن کے سلسلہ میں موجود عقیدوں کے درمیان اختلاف، اخلاقی احکام میں نسبیت کی دلیل ہے۔ مثال کے طور پر، مسلمان نماز پڑھنے کو واجب اور سور کے گوشت کھانے کو حرام جانتے ہیں، جبکہ اس سلسلہ میں عیسائیوں کا عقیدہ دوسرا ہے۔ یا یہ کہ عیسائیوں کے درمیان چند بیویوں کا رکھنا حرام اور اخلاق کے خلاف ہے اور مسلمانوں کے درمیان محدود طور پر مباح ہے اور اخلاق کے خلاف نہیں مانا جاتا ہے۔

جواب: کسی واقعیت اور حقیقت کی معرفت میں اختلاف یا ان کو پہچاننے کے ذریعوں، یا کسی بات کے صدق وکذب یا اخلاقی اچھائی یا برائی کے معیار کے سلسلہ میں نظریاتی اختلاف، واقعی امور کی نسبیت کی دلیل نہیں بن جاتا۔ اس حقیقت کو قبول کرنے کے بعد کہ اخلاقی فضائل و رذائل جن کی جڑیں عالم عینی میں ہیں اور ان کی حقیقتیں ثابت اور انسان وجہان میں تکوینی اور وجودی آثار رکھتی ہیں ان کے سلسلہ میں نظریاتی اختلاف کا موجود ہونا، ثابت حقیقتوں کے بدلنے اور ان کے نسبی ہونے کا سبب نہیں بنتا اور نہ ہی وہ اخلاقی حقائق کی تغییر کا نتیجہ ہوتا ہے، بلکہ ان کو پہچاننے میں بعض لوگوں کے خطا کرنے کی دلیل ہے۔ جیسے وہ خطائیں جو مادی اور جسمانی حقیقتوں کو پہچاننیمیں انسان سے سرزد ہوتی ہیں۔

حقیقت میں جو کچھ اخلاقی احکام کے اسباب کے سلسلہ میں بیان ہوا، اس پر توجہ کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اس طرح کے اختلافات یا انسان کی کمال مطلوب کے صحیح سمجھ نہ ہونے کی وجہ سے ہیں یا انسان کے فعل کے سلسلہ میں کافی دقت کے باوجود غلطی ہو جانے کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ یعنی وہ عمل جو حقیقت میں اس مقصد کے خلاف ہے، اس کے مطابق مانا جاتا ہے اور اس کے بر خلاف بھی ہوتا ہے۔ اس طرح اخلاق کے جاودانہ اصولوں کو عقلی اور عقلی طور پر بیان اور سوالوں کا جواب دینے کے بعد معلوم ہوا کہ جاودانہ اخلاق کے نظریے، ایسے نظریے ہیں جو قابل قبول اور شائستہ ہیں[1]۔

---

[1] استاد مطہری، مرتضیٰ، سیری د ر سیرۂ نبوی، ص: ۹۱ تا ۱۱۶)۔ البتہ جاودانہ اخلاق کے دفاع کے لئے دوسرے راستوں کو بھی طے کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض مشہور اخلاقی اصولوں کی جدا جدا تحقیق کی جائے تا کہ ان کا مطلق ہونا ثابت ہو جائے۔

تیسری فصل

اخلاقی عمل

اس حصہ میں اُن بنیادی موضوعات پر گفتگو کی جائے گی جو فلسفہ اخلاق کی بحثوں میں اخلاق کے عنوان سے بیان کئے گئے ہیں یعنی ''اخلاقی اچھائی اور برائی کا معیار ''۔ وہ بنیادی سوالات جن کے جوابات اس فصل میں دئے جائیں گے مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ ایک عمل کس صورت میں علم اخلاق کی عدالت کے دائرہ میں قرار پاتا ہے ؟

۲۔ اخلاق اسلامی کی نظر میں کن عام شرطوں کے تحت ایک عمل اچھا یا برا مانا جاتا ہے؟

۳۔ اسلام کی نظر میں اخلاقی ذمہ داری کی عام شرطیں کیا ہیں؟

۴۔ اخلاقی فضائل ورذائل کے کلی معیار کی شناسائی کے بعد اچھے یا برے عمل کے مصداق کی پہچان کے لئے دین میں کن وسیلوں کو پہچنوایا گیا ہے ؟

۵۔ کیا دین میں اخلاقی اچھائی اور برائی کو پہچنوانے کے لئے مشخص مفاہیم اور کلمات موجود ہیں؟

٦۔ کبھی عمل کے مقام پر ایک وقت یا موضوع میں دو اخلاقی حکم اس طرح جمع ہوجاتے ہیں کہ انسان دونوں کا پابند ہوتا ہے دونوں کی پیروی کی قدرت نہیں رکھتا ۔کیا اسلامی اخلاق کے نظام میں ان موارد کے لئے کوئی راہ حل تلاش کیا گیا ہے اور کیا ایک اخلاقی حکم کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لئے کوئی معیار بتایا گیاہے؟

ان تمام سوالوں کو ان چار محوروں میں خلاصہ کیا جا سکتاہے :

الف ۔ اخلاقی عمل کے حدود اور ان کی کلی شرطیں۔

ب۔ اخلاقی ذمہ داری کی عمومی شرطیں۔

ج۔ اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کو پہچنوانے کے راستے اور وسیلے۔

د ۔ اخلاقی تعارض اور تزاحم کا معیار اس بنا پر اس فصل کے مطالب چار عنوان میں ترتیب پاتے ہیں۔

الف ۔اخلاقی عمل کے قیمتی عناصر اس بحث میں اخلاقی عمل سے مراد ''اچھا عمل'' ہے اسلامی اخلاق کے نظام میں، جہاں اخلاق کے لئے جزا وسزا کو ضروری مانا گیا ہے، اچھا عمل وہ عمل ہے جس کے ہمراہ اخروی بدلہ اور ثواب موجود ہو، خواہ اس کے ہمراہ دنیوی بدلہ ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر اس بحث کا مقصد ایسی شرطوں کو بیان کرنا ہے کہ ایک عمل انجام دینے والا اُخروی ثواب اور جزا کو حاصل کر سکے۔

ایک مجموعی تقسیم بندی کے لحاظ سے ایک اچھے اور قیمتی اخلاقی عمل کے لئے اس کے ضروری عناصر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: فاعلی عناصر اور فعلی یا عینی عناصر۔ فاعلی عناصر سے مراد ایسے حالات ہیں جو ایک طرح سے فاعل کی طرف پلٹتے ہیں۔ فعلی یا عینی عناصر یعنی ایسے حالات جن کا فاعل کے ارادہ اور حالات سے آزاد ہو کر ایک واقعی اور عینی امر کے عنوان سے فعل میں موجود رہنا ضروری ہو۔

مجموعی طور پر یہ دو طرح کے عناصر جو اخلاق کی اصلی فضیلتوں کی بنیادوں کو تعمیر کرتے ہیں، درج ذیل ہیں: ا ۔فاعلی عناصر فاعل میں دو اساسی عنصر کی موجودگی لازم ہے تا کہ اس کے عمل فعل میں موجود دوسری شرطوں کے باوجود اخلاق کے اچھے اور قیمتی زیور سے آراستہ ہو۔ یہ دو عنصر جنھیں ''فاعل کی آزادی اور اس کے اختیار'' اور ''ایک خاص نیت اور مقصد کے وجود'' سے تعبیر کیا گیا ہے اس انسان میں فعل کے شروع ہونے سے تمام ہونے تک پائے جاتے ہیں۔

ا۔ توجہ کرنی چاہئے کہ اخلاق اسلامی کی کلامی شرطیں جیسے مبدأ ومعاد ورسالت پر عقیدہ جو بعض عناصر کے محقق ہونے کے لئے مبنأاور ابتدائی شرطیں ہیں، یہاں ان کے سلسلہ میں بحث نہیں کی جائے گی۔ بلکہ علم اخلاق کے کلامی اصول کے عنوان سے ان کو مسلم جانا جاتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ کہ کلامی بحثوں اور اسلامی معارف کے درسوں میں ان پر تحقیق ہوئی ہے اور ان کو قبول کیا گیا ہے۔

ایک: فاعل کی آزادی اور اس کا اختیار جیسا کہ علم اخلاق کی تعریف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخلاق انسان کے اُن اختیاری اعمال اوراس کی اُن قدرتوں اور صفتوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو اختیاری مبدأکی حیثیت رکھتی ہیں اوروہ چیزیں جو اس کی آزادی اور اختیار سے باہر ہیں اصولی طور پر وہ اخلاقی تحسین وتقبیح اور فیصلہ کے دائرہ سے باہرہیں اوروہ اخلاقی حکم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اوروہ اس کی مستحق بھی نہیں ہیں۔

انسان دو طرح کے افعال انجام دیتا ہے: ایک وہ افعال ہیں جو فطری اور اضطراری (بے اختیاری) طور پر انجام دئے جاتے ہیں اور دوسرے وہ افعال ہیں جواختیاری اور ارادی طور پر انجام دئے جاتے ہیں۔ فطری اور اضطراری افعال انسان کی طبیعت سے صادر ہوتے ہیں اور ان کے انجام میں علم وآگاہی کا دخل نہیں ہوتا ہے جیسے سانس لینا۔ انسان کے ارادی اور اختیاری افعال اس کے علم وآگاہی کے ذریعہ صادر ہوتے ہیں۔ یعنی انسان ابتدا میں اس عمل کو پہچانتا ہے اور اسے دوسرے تمام اعمال سے جدا کرتا ہے، پھر اسے نفس کے کمال کا مصداق سمجھتا ہے۔ اس کے بعد اسے انجام دینے کے لئے اقدام کرتا ہے[1]۔

البتہ جس طرح فلسفی اور کلامی بحثوں میں ثابت ہوچکا ہے اوراس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان ان کاموں کی نسبت جو علم وارادہ سے انجام دیتا ہے، اختیار تکوینی رکھتا ہے۔ ہاں یہ جاننا چاہئے کہ آدمی کا اختیار مطلق نہیں ہوتاہے، کیونکہ اس کا اختیار سلسلۂ علل کے اجزاکاایک جز ہے خارجی اسباب وعلل بھی اس کے اختیاری افعال کے محقق ہونے میں دخیل ہیں۔ مثلاً تغذیۂ انسان، اس کے

[1] علامہ طباطبائیؒ، المیزان، ج۱، ص ۱۰۷،۱۰۶۔

ارادہ وخواہش کے علاوہ غذا کے خارج میں موجود ہونے اور اس تک دسترسی و کھانے کی قابلیت و صلاحیت اور قوۂ ہاضمہ کی سلامتی اور دسیوں بلکہ سیکڑوں ایسی علتیں ہیں جو اس کے اختیار سے باہر ہیں، ان علتوں کے سلسلہ میں خدا کی مرضی و ارادہ کی بھی ضرورت ہے، یہ ایسی حالت میں ہے کہ انسان کے ارادہ کی بقا بھی اس کی مرضی سے وابستہ ہے[1]۔

اس بنا پر انسان کے ارادہ کی آزادی، اس کے ارادی افعال کے دائرہ میں بھی محدود اور مشروط ہوتی ہے لیکن اس کے عمل کی نسبت اخلاقی تعریفیں اور مذمتیں اس کے اختیاری فعل کے دائرہ کے لحاظ سے محدود ہیں۔

اختیاری اور ارادی فعل کے مقابلہ میں طبیعی اور جبری (غیر ارادی) فعل ہے، جبر واختیار کے الفاظ کا مختلف علوم کی اصطلاح میں مختلف طریقہ سے اور سماج کی عام بول چال میں اس کے بہت سے معانی میں استعمال ہونے کی بنا پر لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے شبہے پیدا ہوتے ہیں۔یہاں مناسب ہے کہ جبر واختیار کے مختلف استعمالات اور ان کی اہم قسموں کو بیان کیا جائے۔ کلمۂ جبر مندرجہ ذیل مقامات پر استعمال ہوتا ہے اورآزادی واختیار ہر جگہ اس کے مقابل معنی رکھتا ہے :

۱۔ فلسفی جبر: وہ اعمال جو انسان سے صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے وجود میں آنے کے لئے اس کا کچھ بھی دخل نہیں ہوتا ہے۔ جیسے آدمی کا سانس لینا، اس کی طبیعت کے مطابق ہے اس طرح کے جبر کے مقابلہ میں، فلسفی آزادی اور اختیار ہے۔

۲۔ اخلاقی جبر: وہ اعمال جنھیں اخلاقی حکم وتقاضہ کے مطابق انسان انجام دیتا ہے یا ترک کرتا ہے جیسے یہ کہ انسان اخلاقی لحاظ مامور ہے کہ نماز پڑھے یا حرام ہے کہ وہ شراب پیئے اس طرح کا جبر، اخلاقی آزادی واختیار کے مقابلہ میں ہے۔

۳۔ حقوقی جبر: قانونی لحاظ سے انسان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی میں کچھ مخصوص اعمال کو انجام دے یا کچھ خاص اعمال کو ترک کرے۔ جیسے قانون کے مطابق ہم سب مجبور ہیں کہ اپنی آمدنی کے لحاظ سے ٹیکس اور مال گذاری ادا کریں یا دوسروں کی

---

[1] ایضاً، ج۱۶، ص۶۷۔

ملکیت اوران کی خصوصی زندگی کے حقوق کا احترام کریں۔ ان امور کی مخالفت کی صورت میں قانونی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جبر کے اس مفہوم کے مقابلہ میں حقوقی آزادی اور اختیار ہے۔ علم حقوق میں جن ضروری اعمال کی مناسبت سے گفتگو ہوتی ہے وہ اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

۴۔ نفسیاتی جبر: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان نفسیاتی وضعیت اور باطنی حالت سے متاثر ہوکر کچھ ایسے اعمال کو انجام دیتا یا ترک کرتا ہے کہ وہ اس کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔ جیسے کوئی انسان اپنی ماں کے انتقال کی وجہ سے غمگین ہوجاتا ہے اوراس پر قلبی رقت طاری ہوجاتی ہے اوروہ اس حالت میں دوسرے کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آتا ہے یااپنی زوجہ کو تکلیف نہیں پہنچاتا ہے یا اپنی روزانہ کی مالا مال آمد کی کثرت سے مست ہوجاتا ہے، یا اپنے عزیزوں سے ملاقات کے شوق وولولہ کی خاطر ناگزیر ہوکر خود سے متعلق دوسروں کی بداعمالیوں کو معاف کردیتا ہے اور بذل و بخشش سے کام لیتا ہے۔اس طرح کا جبر نفسیاتی آزادی اور اختیار کے مقابلہ میں ہے علم نفسیات میں، جبر واختیار کا اس طرح سے معنی کرنا زیادہ رائج ہے۔

۵۔ سماجی جبر: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعی اور سماجی حالات، آداب وتہذیب اس کی رسموں اور طور طریقوں کی وجہ سے انسان خود سے ایک خاص فعل کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے اور مجبوراً بعض اعمال کو ترک کردے جیسے ہمارے سماج میں ایک بازاری دوکاندار پر یہ سماجی دباؤ رہتا ہے کہ عاشور کے دن وہ اپنے کاروبار کو بند کردیتا ہے ،اگرچہ اس کی مرضی نہ بھی ہو۔ یا اجتماعی تحولات وتعمیرات کے موقع پر جو صنعتی ترقی کی بنا پر ہوتے ہیں، انسان مجبور ہے مٹرو سے اُترتے وقت تکلفات کونظر انداز کردے اور اس کے دروازوں کے بند ہونے سے پہلے مختصر وقت میں ہی اس سے باہر آجائے۔ سماجی آزادی اور اختیار، اس طرح کے جبر کے مقابلہ میں ہے۔ اجتماعی اور سماجی علوم میں جبر کا یہ مفہوم وسیع پیمانہ پر مستعمل ہے۔

کلمۂ جبر و اختیار کے مشہور طریقۂ استعمالات کی اجمالی شرح کے بعد اب ہم جبر واختیار کے نوعی مفہوم کو جو اخلاقی عمل کا رکن ہے، آسانی سے جان اور سمجھ سکتے ہیں۔

کسی عمل کو جو چیز علم اخلاق کی عدالت میں حاضر کرتی ہے وہ فلسفی مفہوم میں عمل کا اختیار اور آزاد ہونا ہے۔ فلسفی وتکوینی آزادی اور اختیار، اعتباری جبر جیسے حقوقی واخلاقی جبر سے مغایرت و بے گانگی نہیں رکھتا ہے اور اخلاقی یا حقوقی دستوروں کی موجودگی کسی خاص فعل سے متعلق انسان کی تکوینی آزادی اور اختیار کو سلب نہیں کرتی ہے۔ اُسی طرح جیسے اکراہ واجبار واضطرار، فاعل کی تکوینی آزادی اور اختیار سے ٹکراؤ نہیں رکھتے ہیں[1]۔

اس طرح وہ چیزیں جو کبھی نفسیاتی یا سماجی جبر کے نام سے جانی جاتی ہیں، ہرگز تکوینی وفلسفی آزادی سے مغایرت نہیں رکھتی ہیں۔ ہاں، سبھی اخلاقی یا حقوقی اوامر ونواہی اور نفسانی اور سماجی عوامل کسی عمل کے انجام یا ترک سے متعلق، انسان کے عزم وارادہ کے پیدا ہونے میں اثرانداز ہو سکتے ہیں اور بہت سی جگہوں پر ایسا ہوتا بھی ہے لیکن یہ دخالت وہیں سے گذرتی ہے جہاں انسان کی تکوینی آزادی اور ارادہ وجود میں آتا ہے اور یہ کبھی انسان کو حقیقی لحاظ سے مجبور اور مسلوب الاختیار نہیں کرتی ہے۔

دو: فاعل کی نیت اور مقصد بہت سے دوسرے اخلاقی مکاتب کے برخلاف، مکتب اخلاق اسلامی، اخلاقی عمل کو انجام دینے کے لئے فاعل کی نیت اور مقصد پر بہت زیادہ زور دیتا ہے اصولی طور پر فلسفی لحاظ سے ایک آزاد اور مختار فاعل کے ذریعہ صادر ہونے والا فعل ان چار علتوں (فاعلی، مادی، صوری، غائی) کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہاں نیت اور مقصد سے مراد وہی علت غائی ہے جو فاعل کو کسی عمل پر مجبور کرتی ہے۔

[1] علامہ طباطبائیؒ المیزان، ج۱، ص۱۰۷۔

اس بنا پر اختیاری عمل کے محقق ہونے میں مقصد کے موجود ہونے کی اصل ضرورت ایک ایسی بات ہے جس سے انکار نہیں کیا سکتا ۔ لیکن بات اصل یہ ہے کہ عمل کو انجام دیتے وقت فاعل کے کسی خاص مقصد کی موجودگی آیا اخلاقی عمل کے قابل قدر ہونے کے لئے ایک لازم شرط ہے؟بہت سے اخلاقی مکاتب نے اس سوال کا جواب منفی دیا ہے[۱]،اسلامی اخلاقی مکتب کے نظریہ کے مطابق فاعل میں نیت ومقصد کا ہونا،اخلاقی اقدار کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔

یہاں پر اس بات کی یاددہانی ضروری ہے کہ مخصوص نیت اور مقصد کے تحقق کے لئے دواساسی رکن کی موجودگی ضروری ہے،

پہلا: فاعل کسی فعل کو انجام دینے کے لئے ارادہ اور توجہ رکھتا ہو،

دوسرا: فعل کو انجام دینے سے اس کا مقصد فقط خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو جسے اخلاص کہا جاتا ہے۔ اس طرح اخلاقی عمل کا فاعلی عنصر یا اس کی شرط اُس صورت میں مخدوش ہوتی ہے جب فاعل کسی کام کو غفلت اور سہوکی وجہ سے انجام دے یا خوشنودی پروردگار کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد رکھتا ہو۔ البتہ پہلے رکن کا فقدان ہمیشہ دوسرے رکن کے نہ ہونے کے برابر مانا جائے گا۔ لیکن دوسرارکن، پہلے رکن کے تابع نہیں ہے[۲]۔

اخلاق اسلامی کے فلسفہ میں کسی عمل کی اس وقت اخلاقی قدر وقیمت ہوتی ہے اور اس وقت نیک بدلہ اور اجر کا مستحق ہوتا ہے جب دوسری شرطوں کے محقق ہونے کے علاوہ فاعل کا مقصد خداکی مرضی حاصل کرنا ہو اور عمل کے انجام دینے کو کمال الٰہی اور اس کے جمال وجلال وصفات سے معنوی طور پر نزدیک ہونے کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ قرار دے۔ بس جب بھی کوئی مجنون یا احمق فاعل،پروردگار کی خوشنودی کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے کوئی کام انجام دے تو اس کا عمل اخلاقی قدر و قیمت طے کرنے کے لئے ضروری نصاب سے محروم رہے گا اس کے علاوہ فاعل کا مقصد یگانہ اورخالص ہونا چاہئے۔ یعنی فاعل کی نیت بہترین

---

[۱] ۔ کانٹ کانظریہ یہ نہیں ہے وہ معتقد ہے کہ اخلاقی عمل کو انجام دینے کے لئے انجام فریضہ کے لئے ضروری مصداق ہونا چاہئے اس کے علاوہ انجام فریضہ کی نیت بھی اخلاقی عمل کے لئے شرط ہے۔ ر۔ک: ایمانوئل کانٹ: بنیاد مابعد الطبیعۃ اخلاق ترجمۂ (فارسی) حمید عنایت وعلی قیصری، ص۲۳،۲۴۔

[۲] مطہری، مرتضیٰ، تعلیم وتربیت در اسلام(اسلام میں تعلیم وتربیت) ص۱۹۵۔۱۹۶۔

مقصد کے تحت اور خالص ہو۔ کبھی اس شرط کو ضرورت کے تحت حسن فاعلی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ حسن فعلی کے مقابلہ میں ہے جو آگے بیان ہو گا۔

اخلاقی عمل کی قدر و قیمت کو طے کرنے میں نیت کی اہمیت اور اس کی تاثیر کو عقل و فلسفہ کی نظر سے اور اسلام کی مقدس کتابوں کی زبان سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے :

۱۔ مقصد کی عقلی اہمیت: فلسفۂ اخلاق اسلامی کی نظر میں انسان کا سب سے بلند و جودی مرتبہ اس کا روحانی مرتبہ ہے۔ اس مرتبہ میں انسان کا حقیقی کمال خدا کے صفات کمالیہ زیادہ سے زیادہ معنوی تقرب حاصل کرنے میں ہے دوسرے لفظوں میں انسان کا سب سے بلند روحی مرتبہ اس چیز میں ہے کہ روح جو انسان کا جوہر ہے، الٰہی اسماء وصفات جمال وجلال کی جلوہ گاہ بن جائے یہ چیز علم اخلاق کے کلامی شرائط اور اس کے مقصد و رسالت سے مربوط ہے یہ عظیم کام اس صورت میں ممکن ہے.

جب انسان اپنے اختیاری عمل میں، جو روح کی ترقی وتنزلی میں وجودی تاثیر رکھتا ہے، خدا وند متعال سے نزدیک ہونے کے لئے مقصد اور نیت کے ساتھ حرکت کرے۔ نیت اور اخلاقی قدروں کے درمیان یہ تاثیر اور رابطہ ایک تکوینی اور حقیقی رابطہ ہے نہ کہ جعلی اور قراردادی۔

۲۔ وحی کے مطابق مقصد کی اہمیت: اسلام کی مقدس کتابوں میں، خواہ وہ قرآن سے مربوط ہو یا سنت سے اخلاقی عمل کے لئے خدائی مقصد کے موجود رہنے کی ضرورت پر واضح طریقہ سے تاکید کی گئی ہے۔ ان کی چند مشہور مثالیں مندرجہ ذیل ہیں '' :یہ غنائم یا بلند درجہ اُن فقیر مہاجرین کے لئے ہے جن کو اپنے وطن اور مال سے محروم کر دیا گیا۔

جبکہ وہ خوشنودی خدا اور فضل الٰہی حاصل کرنے کے لئے کام کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول کے امور میں مدد کرتے ہیں۔ یہ سچے اور حقیقت پسند لوگ ہیں '' وہ لوگ خدا سے دوستی کی بنا پر مسکین ویتیم واسیر کو کھانا کھلاتے ہیں (اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ) ہم

خوشنودی خدا کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے ہیں[1]۔ '' جن لوگوں نے اپنے خدا کی خوشنودی کے لئے صبر و شکیبائی سے کام لیا اور نماز کو قائم کیا اور ہم نے اُن کو جو روزی دی ہے اس میں سے پوشیدہ وآشکار طریقہ سے انفاق کیا اور بدی کو نیکی کے ذریعہ دفع کرتے ہیں آخرت کا گھر انھیں کے لئے ہے[2] ''

یہ بات واضح ہے کہ الٰہی مقصد پر قرآن کی یہ تاکید صرف مذکورہ موارد اور مقامات سے مخصوص نہیں ہے، اور مخصوص اعمال کا ذکر بعنوان مثال اور شاید الٰہی مقصد کی حفاظت میں انسان کے ذریعہ ہونے والی لغزشوں کے سب سے مشہور اور بنیادی مقامات کے ذکر کے عنوان سے ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ سے یہ نقل ہوا ہے کہ فرمایا '' بیشک اعمال کی اہمیت انہیں انجام دینے کی نیت پر منحصر ہے اورانسان کے لئے وہی چیزیں رہیں گی جن کی نیت کی ہے [3]، مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے[4] ''

نیت کے مراتب: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حتیٰ وہ افراد جو خدا کے وجود کو قبول کرتے ہیں اور قیامت اور پیغمبروں کی بعثت پر عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی اپنے اعمال کو ثواب حاصل کرنے وبہشت میں جانے، اس کی لازوال نعمتوں سے بہرہ مند ہونے اور دوزخ و جہنم کے کیفر اور سزاؤں سے نجات کی غرض سے انجام دیتے ہیں، نہ کہ خدا کی مرضی حاصل کرنے کے لئے۔ مقدس اسلامی کتابیں خاص طور سے قرآن بہشت کی زیبائیوں اور خصوصیتوں سے نیز اخروی سزاؤں کی شدت اور ان کے قطعی ہونے سے خبردار وہوشیار کرکے ایک طرح سے کیفر سے ڈرنے اور جزاو ثواب کی امید کی نیت سے عمل کرنے کو صحیح مانتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا اس طرح کے اخلاقی اعمال کی قبولیت بیان شدہ اخلاقی عمل کی قیمتی شرطوں سے سازگار ہے؟ اس بنیاد پر کہ فاعل کو اپنے عمل میں فقط خدا کی مرضی کا حصول مد نظر رکھنا چاہئے۔

---

[1] سورۂ انسان۔آیت ۸و۹۔
[2] سورۂ رعد، آیت ۲۲، اسی طرح سورۂ مائدہ آیت نمبر۱۵۔۱۶، سورۂ بقرہ آیت ۲۰۷، ۲۲۵، ۲۶۴، ۲۷۲، ۲۸۴، سورۂ ممتحنہ آیت نمبر۱، سورۂ نساء آیت نمبر۳۸، سورۂ روم آیت ۳۸۔۳۹
[3] مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، ج۷۰، ص۲۱۲، ح۳۸۔
[4] کلینی، کافی، ج۲، ص۸۴۔

اس سوال کے جواب میں کہا گیا ہے کہ خدا کی مرضی کے متعدد مراتب ہیں اور انسان انہیں حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کبھی خدا کی مرضی کو اس وجہ سے اختیار کرتا ہے کہ وہ اخروی بدلہ وثواب کا باعث یا قیامت کے دن کیفر وسزا سے نجات کا ذریعہ وسبب ہے لہذا وہ اخلاقی عمل کے انجام میں انسان کے لئے توجہ کا مرکز قرار پاتی ہے اور کبھی صرف خدا کی مرضی کو حاصل کرنا صرف مقصد کے تحریک کرنے اور آگے بڑھانے کے لئے ہوتا ہے[1] یعنی خدا کے نزدیک عمل کی محبوبیت ہے جو عمل کی انجام دہی میں انسان کی اس سے محبت اور اس کی طرف مائل ہونے کا سبب بنتی ہے لہذا خدا کے نزدیک بھی فاعل کی محبوبیت وجود میں آئے گی اور خدا اس سے محبت کرے گا۔ البتہ اس طرح کے اخلاقی عمل کی انجام دہی، خدا کے صرف خاص بندوں کے ذریعہ ہی میسر ہے۔

اس بنا پر پہلی صورت میں بھی فاعل کا مقصد، خدا کی مرضی کا حصول ہے اس وجہ سے کہ وہ بدلہ دینے کا باعث اور کیفر وسزا سے بچنے کا سبب ہے۔

مقصد اور ایمان کا رشتہ: یہ بات ذکر ہو چکی ہے کہ اسلام کے اخلاقی نظام میں، اخلاقی عمل اس وقت اہمیت اور قیمت رکھتا ہے جب فاعل اسے انجام دینے میں معبود کی مرضی کا سودا کرے۔ چاہے خدا کی مرضی ذاتی طور پر مطلوب ہو اور چاہے پروردگار کی خوشنودی اس وجہ سے کہ وہ ثواب کا باعث اور عذاب سے بچنے کا سبب ہے، اس وجہ سے اسے اپنا مقصد قرار دیدے۔

(دونوں صورتوں میں اہمیت رکھتا ہے) عقلی طور پر اس امر کا محقق ہونا اس صورت میں ممکن ہے جب فاعل خدا کے وجود روز قیامت اور جزا و سزا کی حقانیت، انبیاء کی بعثت اور ان کی تعلیمات پر یقین اور عقیدہ رکھتا ہو۔ البتہ خدا پر ایمان رکھنے میں، معاد ونبوت سے متعلق ایمان بھی اس کے شامل حال ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہماری دینی کتابوں میں ایمان پر اخلاقی قدروں کے لئے ضروری شرط کے عنوان سے بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اس کے کچھ نمونے مندرجہ ذیل ہیں'' :عورت اور مرد میں سے جو کوئی

---

[1] مصباح یزدی، محمد نقی، اخلاق درقرآن، ص۹۶۔

نیک اور شائستہ کام انجام دے اور مؤمن ہو، قطعی طور پر ہم اسے ایسی زندگی عطا کریں گے جو حیات طیبہ اور پاکیزہ ہے اور مسلّم طور پر جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے اس سے بہتر ان کے کئے ہوئے کا بدلہ دیں گے[1]۔

''نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ اپنے چہرہ کو مشرق و مغرب کی طرف کرلیں بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی خدا، قیامت، فرشتوں، آسمانی کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور[2] خدا کے پیغمبر اُن چیزوں پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہیں ایمان لائے ہیں اور مؤمنین بھی سب خدا، فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے رسولوں میں کسی کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے ہیں اور وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم نے پیغام الٰہی کو سنا ہے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اور ہم تیری طرف پلٹ کے آنے والے ہیں[3] ایمان کی حقیقت اور علم کے درمیان کے متعلق ایک طرف اور دوسری طرف اس کے اور اسلام کے درمیان فرق کے بارے میں یہ کہا جاچکا ہے کہ ایمان ایک قلبی بات ہے، اسی کے ساتھ اختیاری بھی ہے۔

جبکہ علم و عقیدہ انسان کے لئے ممکن ہے غیراختیاری صورت میں بھی حاصل ہوجائے، اس لئے علم اور ایمان کے درمیان وجودی حقیقت کے لحاظ سے کوئی ملازمہ اور اُن میں وابستگی ضروری نہیں ہے۔ یعنی ممکن ہے کوئی انسان کسی حقیقت کے سلسلہ میں عالم ہو لیکن اسی سلسلہ میں کفر کا اظہار کرے[4] قرآن کریم ایمان سے علم کے جدا ہونے کے بارے میں فرماتا ہے'' :اس کے باوجود کہ ان کے دل اس کے سلسلہ میں یقین کرچکے تھے، لیکن ظلم و زیادتی اور تکبر کی بناپر اس سے انکار کردیا۔ بس دیکھ لو فساد کرنے والوں کا

---

[1] سورۂ نحل، آیت۹۷۔
[2] سورۂ بقرہ، آیت۱۷۷۔
[3] سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵۔
[4] علامہ طباطبائی ؒ، المیزان، ج۱۸، ص۲۵۹۔

انجام کیا ہوتا ہے البتہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ایمان کا عام راستہ علم سے ہوکر گذرتا ہے لیکن علم انفرادی طور پر ایمان کے محقق ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

ایمان اور اسلام کے فرق کے بارے میں قرآن کی آیۂ شریفہ اس طرح بیان کرتی ہے :(اِن المُسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات[٢]) اوراسی طرح دوسری آیتیں بھی[٣] اسلام کو ایمان کے مقابلہ میں قرار دیتی ہیں۔

دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اسلام دین کے سامنے عملی طور پر تسلیم ہوجانے کے معنی میں ہے اور تسلیم عملی بدن کے ظاہری اعضاء وجوارح کے ذریعہ محقق ہوتی ہے لیکن ایمان ایک قلبی، اعتقادی اور باطنی چیز ہے اور یہ چیز اس طرح ہے کہ اس کے آثار بدنی اور ظاہری اعمال میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

اس بناپر ہر مؤمن مسلمان ہے لیکن ہر مسلمان مؤمن نہیں ہے[٤] جیسے منافق، جودین کے دستور وں پر عمل کرتا ہے لیکن ایمان نہیں رکھتا ایمان اور عمل کا رشتہ : قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ایمان کو قیمتی، موجب سعادت اور صالح عمل کے ساتھ شمار کیا گیا ہے اُن میں سے اس مثال کو ملاحظہ فرمائیے '' :جولوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح انجام دیتے ہیں ہم ان کو بہت جلد ان باغ ہائے جنت میں داخل کریں گے جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہو نگی اوروہ ہمیشہ اس میں زندگی گزاریں گے[٥]۔ ''بعض دوسری آیتوں میں صرف ایمان کو انسان کی سعادتمندی اور کامیابی اور بہشت میں داخل ہونے کے لئے ایک شرط کے طورپرپیش کیا گیا ہے۔

''خدا نے مومنین ومومنات سے ان باغات کا وعدہ کیا ہے جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ اُن میں سے ہمیشہ زندگی گزاریں گے،

---

[١] سورۂ نحل، آیت ١۴۔
[٢] سورۂ احزاب ۔آیت: ٣٥
[٣] جیسے سورۂ حجرات کی چودہویں اور پندرہویں آیت
[٤] رجوع کیجئے علامہ طباطبائی ؒ المیزان، ج١٦، ص٣١٣۔٣١۴
[٥] سورۂ نساء آیت٥٧، ١٢٢، اورسورۂ بقرہ کی آیت ١٠٣، سورۂ نساء کی آیت١٢۴، اورسورۂ کہف کی آیت٣٠ کی طرف رجوع کیاجائ

ان جنّات عدنِ میں پاکیزہ جگہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے اور خدا کی خوشنودی سب چیزوں سے بڑی ہے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے اس آیت میں واضح طریقہ سے خدا کی بڑی نعمتوں مثلاً ایمان کے ساتھ اس کی مرضی کی بشارت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ کسی عمل کے موجود ہونے اور اس کی ضرورت پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔

کیا اس طرح کی آیتیں، گزری ہوئی یا آگے آنے والی آیتوں سے، اس بنا پر کہ اخلاقی قدروں کے محقق ہونے کے لئے عمل صالح کا موجود ہونا ضروری ہے، اختلاف نہیں رکھتیں؟ کیا اسلام کے اخلاقی نظام میں صرف ایمان، اخلاقی قدروں اور تعریف وجزا کے مستحق ہونے کا سبب بن سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے اور ان دو طرح کی آیتوں کے مفہوم کے درمیان مناسب رابطہ برقرار کرنے کے لئے یہ کہا گیا ہے

'ایمان کی حقیقت اور اسلام وعمل سے اس کی نسبت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آیتیں جو ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر کرتی ہیں، وہ عام حالات پر نظر رکھتی ہیں، یعنی ان لوگوں سے مربوط ہیں جن کے لئے کام کرنے کی شرطیں جیسے قدرت، فرصت وغیرہ فراہم ہیں اور وہ ان حالات میں عمل کرتے ہیں اور وہ آیتیں جو صرف ایمان کو ہی کامیابی کا سبب قرار دیتی ہیں، ان حالات سے مربوط ہیں جن میں انسان ایمان لاتا ہے لیکن عمل کو انجام دینے کے لئے حالات جیسے قدرت، فرصت وغیرہ اس کے لئے فراہم نہیں ہیں[1]۔ ''

کافروں کے نیک اعمال: آخری سوال جو مقصد اور نیت کے بارے میں جواب کا مستحق ہے یہ ہے: جو کافرین اور غیر مؤمن افراد مبدأ، معاد اور نبوت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں لہٰذا اپنے اعمال کی انجام دہی میں (اگرچہ ذاتی طور پر وہ عمل پسندیدہ ہیں) خدا کی مرضی حاصل کرنے کی نیت نہیں رکھتے ہیں، کیا وہ لوگ اسلام کے اخلاقی اصول کی رو سے کسی طرح کی تعریف اور جزا کے مستحق نہیں ہیں؟ کیا ان کے نیک اعمال کی کوئی اہمیت وقیمت نہیں ہے اور کیا پروردگار کی جانب سے انہیں بدلہ نہیں ملے گا؟

[1] ر.ک مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق درقرآن، ص۱۱۳،۱۱۲۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا گیا ہے'' :وہ اعمال جو مذکورہ خصوصیت نہیں رکھتے ہیں لیکن شارع کے معین کردہ طریقوں کے مخالف بھی نہیں ہیں ۔

کوئی منفی مقصد بھی نہیں رکھتے ہیں یعنی دین حق اور اس کے ماننے والوں سے دشمنی کے مقصد سے انجام نہیں دیتے اور فاعل انھیں انجام دینے کے لئے مادی اور حیوانی ضرورتوں کے پورا کرنے سے بالاتر مقصد دکھاتا ہے یعنی اس کا عمل، انسانی احساسات وعواطف کی خاطر انجام پاتا ہے (جیسے کسی کو معاف کردیتا ہے اور سخاوت کو ظاہر کرتا ہے اس جیسے دوسرے اعمال) اگرچہ انسانی نفس کی بلندی وتکامل کے لئے ضروری شرطیں نہیں رکھتے اور اس کے لازمی نصاب تک نہیں پہنچتے لیکن وہ اس کے لئے مقدمہ فراہم کرتے ہیں.

یعنی انسان کی روح وجان کو معنوی سفر طے کرنے کے لئے آمادہ کردیتے ہیں ۔ یہاں تک کہ بعض روایتوں کی بناپر اُخروی سزاؤں کے رفع ہونے یا اُن میں تخفیف ہونے کا سبب بن جاتے ہیں اور اگرچہ لازم شرطوں کے نہ ہونے کی بناپر بہشت میں داخل نہیں ہوگا اوراسے ابدی سعادت میسر نہیں ہوگی لیکن مطلق ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہ ہو''۔

۲۔ فعلی اور عینی عنصر اخلاقی عمل کے لئے ان شرطوں کے علاوہ جو فاعل کے ذریعہ ان کی انجام دہی میں ہونی چاہئے، لازم ہے کہ وہ عمل فی نفسہ اورذاتی طور پر بھی نیک، اچھا اور پسندیدہ ہو۔

اسلامی علوم میں رائج تعبیر کے مطابق اُسے حُسن فعلی کے عنوان سے یاد کرتے ہیں یہ حُسن فاعلی کے مقابلہ میں ہے جس کے بارے میں عنصر فاعلی کے عنوان کے تحت اس کتاب میں گفتگو ہوئی ہے۔

---

[1] ر۔ک مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق درقرآن، ص۱۷۲،۱۱۷۱۔

اس سوال کے بارے میں کہ کیا کوئی عمل ذاتی طور پر نیک اور شائستگی کا حامل ہے یا نہیں؟ اس سے پہلے اس سلسلہ میں اجمالی طور پر گفتگو ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں زیادہ تحقیق اور معلومات کے لئے اس سے مربوط منابع و مصادر میں جستجو کرنی چاہئے[۱] لیکن اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے کہ اس عمل کا معیار اور اس کی نشانی انسان پر منحصر ہیں اور انھیں نشانیوں کی بنیاد پر اُسے نیکی اور برائی سے متصف قرار دیا جاتا ہے اور وہ ثواب یا عقاب کا مستحق ہوتا ہے اور محاسبہ وآزمائش کی بنیاد پر انسان خدا کے نزدیک جگہ پاتا ہے۔ جب کہ اگر خارجی عمل پر اس کے علائم سے ہٹ کر اس پر توجہ کی جائے تو صرف ایک بدنی حرکت ہوگی اور وہ حرکت باقی تمام حرکتوں کی طرح نہیں ہوگی اور اس کی بہ نسبت اچھائی اور برائی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے[۲]۔

اخلاقی عمل کے لئے حُسن فعلی کی ضرورت کو عقلائی لحاظ سے بیان کرنے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا ارادی وآزادانہ (غیر ارادی) فعل اس کے نفس کے ذریعہ وجود میں آتا ہے اور کمیت، کیفیت، شکل، زمانی ومکانی خصوصیات وغیرہ کے لحاظ سے وہ فاعل کے مقصد کے تابع ہے۔ یعنی حقیقت میں فاعل کا مقصد اس کے عمل کی روح اور اسے وجود میں لانے والا ہے۔

اس بنا پر ہر کام کو ہر مقصد کے ساتھ انجام نہیں دیا جا سکتا ہے اور ہر مقصد ایک خاص طریقہ سے کسی عمل کے ساتھ سنخیت اور مناسبت رکھتا ہے۔ سونے کی حالت میں کسی علمی امتحان میں کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ گھر میں بیٹھ کر کعبہ کی زیارت نہیں ہو سکتی ہے اور دوسروں کی عزت وحرمت اور مال کے ساتھ زیادتی کر کے پروردگار کی خوشنودی حاصل نہیں کی جا سکتی ہے[۳]۔

اس طرح فلسفۂ اخلاق اسلامی میں فاعل کی نفسانی حالت اور مقصد پر بھی توجہ کی جاتی ہے اس کے علاوہ عمل کی عینی ماہیت اور اس کے واقعی وحقیقی آثار کو بھی توجہ کا مرکز بنایا جاتا ہے۔ یہ مکتب اُن اصالتِ فاعل کے طرفدار مکاتب کے برخلاف ہے جو عمل کی انجام دہی میں فقط فاعل کے نفسانی پہلوؤں پر تاکید کرتے ہیں اور اصالت عین کے طرفدار مکاتب کے بر خلاف بھی ہے جو صرف

---

[۱] سبحانی، جعفر: حسن وقبح عقلی، پایہ ہائے جاودان اخلاق کی طرف رجوع کیجئے

[۲] علامہ طباطبائیؒ: المیزان، ج۱۶، ص۸۲

[۳] رک: مصباح یزدی، محمدتقی، دروس فلسفۂ اخلاق، ص۱۶۸،۱۶۷۔

خارجی عمل کی طبیعت اوراس کے عینی ومادی آثار کو اخلاقی اچھائی اور برائی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔اس کے علاوہ جو شرائط وحالات اخلاق اسلامی میں فاعل کے مقصد کے لئے عمل کا معنوی عنصر ہیں اوراسی طرح اخلاقی عمل کے مادی عنصر کے لئے ضروری مانے جاتے ہیں، وہ دوسرے اخلاقی مکاتب میں بیان ہونے والے شرائط وحالات سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔

ب: اخلاقی ذمہ داری کی شرطیں: گزشتہ بحث میں اخلاقی عمل کی اہمیت کی شرطوں اور ان کے عنصروں کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اخلاقی تعریف، جزا اور اس کی اہمیت اور قدر وقیمت کے مقابلہ میں اخلاقی سرزنش، مذمت وسزااوراس کی ذمہ داری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اخلاق میں ''قدروقیمت''اور ''ذمہ داری'' دوفیصلہ کن بنیادی رکن کی حیثیت رکھتی ہیں اور اُن میں سے کسی ایک کے فقدان کی وجہ سے ایک اخلاقی نظام کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ اس وجہ سے مناسب ہے کہ اخلاقی ذمہ داری کے اصلی عناصر اور ارکان کے بارے میں بھی کچھ بیان کیا جائے۔

اخلاقی ذمہ داری سے مراد پروردگار کے حضور میں ذمہ داری ہے اوراس کے نتیجہ میں اخروی جزاوسزاہوتی ہے خواہ دنیوی ذمہ داری اور سزا وجودرکھتی ہو یانہ رکھتی ہودوسرے لفظوں میں اخلاقی ذمہ داری کی علامت، عمل پر مترتب ہونے والااخروی عقاب اور سزا ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے اخلاقی قدر وقیمت آخرت میں جزا وثواب کو وجودمیں لاتی ہے۔

مسلمان متکلمین، اخلاقی دستوروں کے مقابلہ میں ذمہ داری کی شرطوں کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ان شرطوں میں کچھ اصل دستور اور اخلاقی تکلیف سے مربوط ہیں، کچھ دوسری شرطیں، دستور دینے والے سے مربوط ہوتی ہیں اُن میں سے بعض شرطیں ایسی ہیں جواُن موضوعات کے لئے ہیں جن سے دستور کا رابطہ ہوتا ہے اور بعض دوسری شرطیں مسؤل وذمہ دارانسان سے مربوط ہوتی ہیں[1]۔

---

[1] علامہ حلی: کشف المراد، ص ٣٢٢، شیخ طوسی: الاقتصاد فی ما یتعلق بالاعتقاد، ص١٠٧۔ حمصی رازی شیخ سدید الدین: المنقذسن التقلید، ص٢٨٨کی طرف رجوع کیجئے

اخلاقی اوامر واحکام کے پسندیدہ ہونے کی وہ شرطیں جو شریعت کی اساس اور بنیاد کا اہم حصہ ہیں اور اسی طرح حاکم اور اخلاقی فرمان جاری کرنے کے لائق انسان کی خصوصیات، علم اخلاق کے کلامی موضوعات وافکار کی جگ ہیں اوران کے سلسلہ میں تحقیق وبحث کرنے کی جگہ، علم کلام ہے جہاں خداشناسی، نبوت اور دین کی ضرورت، جیسے مباحث میں بحث وتحقیق کی گئی ہے اُن عملی شرطوں کو بیان کیا جاچکا ہے جن کے لئے حکم دیا جاتا ہے یا ان کی انجام دہی سے نہی کی جاتی ہے، اب اُن بنیادی عناصر کے سلسلہ میں گفتگو ہوگی جن کا انسان کے اندر موجود ہونا اخلاقی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے شرط اور ضروری ہے۔

ا۔بلوغ بچے اورنا بالغ افراد اخلاقی ذمہ داری کے بارے آزاداور بری ہیں۔البتہ اُن کے سرپرست اُن کے اعمال کی خاطر حقوقی طورپر ذمہ دارہیں۔اس وجہ سے اسلام کے اخلاقی نظام میں بچوں کے نیک اعمال اخلاقی اہمیت اور ثواب وجزا کے حامل ہیں لیکن ان کی اخلاقی برائیوں سے متعلق سوال نہیں ہوگا اور اُن کے لئے آخرت میں کوئی کیفرو سزا نہ ہوگی۔

اسلام کی مقدس کتابوں میں اخلاقی ذمہ داری کی بنیادی شرطوں میں سے بلوغ کو ایک شرط کے طور پرپیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت امام محمد باقر ۔ ایک روایت میں بلوغ کے زمانہ آغاز کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''انسان کے سن بلوغ تک پہنچنے کے بعد حدودالٰہی مکمل طورپراس کے نفع اورنقصان میں جاری ہوجائیں گے[1]۔

٫٢۔عقل طبیعی وفطری بلوغ کے علاوہ قوۂ عقل کی موجودگی اخلاقی ذمہ داری کی شرط ہے۔ اس بناپر وہ افراد جو عقل سلیم نہیں رکھتے اورقدرت تعقل کی کمی سے دوچارہیں وہ اخلاقی ذمہ داری کے حامل نہیں ہیں۔ اگر چہ ان کے سرپرست اُن کے اعمال کے نتیجہ میں دوسروں کو ہونے والے نقصانات کے تئیں حقوقی طور پر ذمہ دار ہوتے ہیں۔فاعل میں عقل کے موجود ہونے کی ضررت پر جودلیلیں ہیں اُن میں سے ایک وہ اثر ہے جو فاعل میں علم وآگاہی کے لئے عقل رکھتی ہے[2]۔

---

[1] رکـ کلینیؒ : کافی، ج: ٧، ص: ١٩٨۔ شیخ صدوق: فقیہہ، ج٤، ص١٦٤۔
[2] رکـ شیخ طوسی: الاقتصاد فی ما یتعلق بالاعتقاد، ص١١٧

آئندہ بیان ہوگا کہ اخلاقی ذمہ داری کی شرطوں میں سے ایک فعل کی اچھائی اور برائی سے متعلق فاعل کا علم اور اس کی آگاہی ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ شرط عقلی قدرت پر موقوف ہے انسان کے اندر عقل وادراک کی موجودگی آگاہی کے لئے ضروری مقدمہ ہے اور خود اخلاقی ذمہ داری کے لئے ایک شرط محسوب ہوتی ہے۔

۳۔ علم یا اسے حاصل کرنے کا امکان کوئی انسان اخلاقی طور پراس وقت ذمہ دار ہوتا ہے جب ترک کی جانے والے اعمال کی خرابی، برائی اور ممنوعیت کے بارے میں اورانجام دئے جانے والے اعمال کی خوبی، شائستگی، وجوب اور اسی طرح اُن کو انجام دینے کے سلسلہ کی کیفت میں علم وآگاہی رکھتا ہو یا یہ کہ ضروری علم حاصل کرنا اس کے لئے ممکن ہو۔یعنی ایسے حالات وشرائط کے تحت ہو جن میں وہ ان سے متعلق علم کو حاصل کرسک‌اے۔

اس بنا پر بہت سے ایسے مسلمان یا غیر مسلمان جو اپنے اخلاقی فرائض کے بارے میں علم نہیں رکھتے لیکن اُن کے لئے اس طرح کا علم حاصل کرنا ممکن ہے، وہ اس طرح کے اپنے اعمال کے سلسلہ میں اخلاقی طور پر ذمہ دار ہیں اور اخروی سزائیں ان لوگوں سے بھی متعلق ہیں اگرچہ فی الحال علم نہ رکھتے ہوں ان کے مقابلہ میں وہ مسلمان یا غیر مسلمان جن کے لئے اس طرح کا امکان فراہم نہیں ہے اوران سے ممکن بھی نہیں ہے وہ اس طرح کی اخلاقی ذمہ داری سے بری ہونگے۔

اخلاق کے علاوہ موجودہ حقوقی نظام بھی انسان کے علم یا اس کے لئے علم حاصل کرنے کے امکانات کو کیفری طور پر ذمہ دار ہونے کے لئے شرط سمجھتے ہیں۔ فرائض سے متعلق علم یااسے حاصل کرنے کے امکان کو اخلاقی ذمہ داری کے لئے ایک شرط کیوں مانا گیاہے؟

علم کی شرط اور اس کی موجودگی کی ضرورت کے سلسلہ میں اس کیوں کا جواب دینے کے لئے فطری، وجدانی، عقلی وعقلائی اور دینی لحاظ سے متعدد دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں :

[1] ایضاً ۱۱۶، ۱۱۷۔ علامہ حلی: کشف المراد، ص۳۲۲

پہلی دلیل :انسان کا سالم وجدان کسی انسان کے لئے کیفر اور سزا کے اعلان وابلاغ کے بغیر اور اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک وہ اپنے فریضہ سے متعلق علم کے حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کرے[۱]۔

یہاں یہ بیان کرنا مناسب ہے کہ یہ شرط حتیٰ اس نظریہ کی صورت میں بھی قابل قبول ہے کہ بدلہ اور سزا کو اخلاقی عمل کا طبیعی نتیجہ مان لیں، کیونکہ وہ لوگ بھی جو عمل اور بدلہ کے درمیان قراردادی رابطہ کی نفی کرتے ہیں اور تکوینی رابطہ کو قبول کرتے ہیں عمل کا لحاظ اس کے معنوی عناصر کے ساتھ کرتے ہیں نہ کہ فقط مادی عنصر کے ساتھ۔ یعنی اخلاقی عمل اس کے تمام عنصروں، منجملہ ان کے اس کا مادی پیکر کے ساتھ، فاعل کے مقصد اور نیت اور اس کے آگاہ ہونے اور نہ ہونے کے نتیجہ میں بدلہ اور کیفر کی صورت میں نتیجہ دیتا ہے اور یہ فقط اس کے مادی پیکر میں نہیں ہے۔

دوسری دلیل: عقل، فریضہ سے متعلق علم وآگاہی کو فریضہ کی انجام دہی کے لئے تکوینی اور فلسفی شرط کے طور پر مانتی ہے اور اس بنا پر اس کے فقدان کی صورت میں فریضہ کی انجام دہی کو محال جانتی ہے۔ کیونکہ فرائض سے متعلق جہل کی حالت میں فریضہ سے متعلق پابندی کے لئے فاعل میں کوئی مقصد اور اسے تحریک کرنے والی کوئی چیز موجود نہ ہوگی اس طرح مقصد کے بغیر فعل کا صادر ہونا عقلی طور پر محال ہے[۲]

اس کے علاوہ عقل اصولی طورپر انسان کی جواب دہی، بازپرس اور سزاؤں کو مجہول تکلیف (نامعلوم فریضہ) اوران حالات کی بناپر جن میں انسان نے اپنے اخلاقی فرائض سے آگاہی کے لئے پوری کوششیں کی ہیں، برا، ناپسند، اور حقیقت میں تشریعی عدالت کے خلاف جانتی ہے[۳] عقل کے اس فیصلہ کو علم اصول کے علماء قاعدہ ''قبح عقاب بلابیان'' کے عنوان سے یاد کرتے ہیں

---

[۱] رکـ آخوند خراسانی: کفایۃ الاصول، ص: ۳۴۳
[۲] میرزا نائینیؒ : فوائد الاصول (تقریر شیخ محمد علی کاظمی) ، ج۳، ص۳۶۵۔۳۷۱۔
[۳] آخوند خراسانی: کفایۃ الاصول۔

۳۔ **تیسری دلیل**:عقلائی اور عرفی وجدان، مجہول تکلیف (نامعلوم فریضہ) کے ترک کرنے پر سزا کا مستحق نہیں جانتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ سماج کے عقلمند لوگ اپنے ماتحت رہنے والوں کو اس دستور کی بنا پر جو ان کے لئے اعلان نہیں ہوا اوران تک نہیں پہنچا ہے یا جس کی دستیابی میں ان لوگوں نے کوتاہی اور تقصیر نہیں کی ہے، جواب دہی اور سزا کا مستحق نہیں جانتے ہیں اور اُن لوگوں کو سزا دینا غیر مناسب اور برا مانتے ہیں۔

چوتھی دلیل:کتاب وسنت میں مذکورہ قاعدہ (قبح عقاب بلا بیان) کی تائید کثرت کے ساتھ کی گئی ہے۔ نمونہ کے طور پر ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیاجاتاہے :خداوند عالم فرماتا ہے: ''ہم نے جب تک پیغمبر کو مبعوث نہیں کرتے، اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے[1]''۔

معروف تفسیروں کے مطابق پیغمبر کو (بغیر کسی مقصد کے) بھیجنا اہم نہیں ہے بلکہ حقیقت میں اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک ضروری علم وآگاہی کو لوگوں تک نہیں پہنچا دیا جاتا، ان لوگوں کو ذمہ دار نہیں جانا جاسکتا ہے اور سزا نہیں دی جاسکتی ہے۔ دوسری جگہ پر فرماتاہے: ''خدا کسی کو بھی تکلیف نہیں دیتا مگر صرف اتنی جتنی کہ اسے قدرت دی ہے[2]'' اس آیت کے مطابق بھی انسان اسی قدر ذمہ دار ہے جس قدر اس نے کچھ حاصل کیا ہے یا حاصل کرسکتا ہے۔ خواہ علم وآگاہی ہو یاقدرت واستعداد۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی فرمایا ہے'' :ہماری امت سے نو چیزوں (کے بدلہ) کو اُٹھا لیاگیا ہے: خطا، فراموشی، لاعلمی، ناتوانی، وہ امور جن کی خاطر قدرت نہیں ہے، وہ امور جن کو اضطرار یا اکراہ یا اجبار کی وجہ سے انجام دیا جاتا ہے، فال بد نکالنا، خلقت میں اور تفکر وتدبّر میں وسوسہ پیدا ہونا اور حسد اس صورت میں کہ زبان یا ہاتھ سے ظاہر نہ ہو۔

---

[1] سورۂ اسراء آیت۱۵ (وَمَاكُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثْ رَسُوْلاً)۔
[2] سورۂ طلاق آیت۷(لَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلّا مَا آتَاهَا)۔

اس حدیث میں انسان نوچیزوں سے متعلق اپنی اخلاقی ذمہ داری اور جواب دہی و سزا سے معاف ہوگیا ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ انسان ان تکلیفوں اور فرائض کے سلسلہ میں جواب دہ نہ ہوگا جن کے بارے میں علم وآگاہی نہیں رکھتا ہے مگر یہ کہ اس کی لاعلمی تقصیر اور کوتاہی کی بنا پر ہو، نہ کہ غلطی اور مجبوری کی بناپر۔ اس (غلطی کی) صورت میں بے خبر رہنا ذمہ داری کو ختم نہیں کرتا ہے۔اس وجہ سے کہ علم کا دوام اور باقی رہنا بھی اخلاقی ذمہ داری کے تحقق کے لئے مؤثر ہے اور عقلی طور پر بھولنے والے انسان کے لئے تکلیف اور ذمہ داری نہ ہونے کی دلیل کی بنا پر وہ انسان جو پہلے اپنی اخلاقی ذمہ داری سے متعلق علم رکھتا تھا لیکن اسے انجام دیتے وقت غفلت اور فراموشی کا شکار ہوگیا، اخلاقی طور پر ذمہ دار نہ ہوگا۔

۴۔قدرت اس شرط کی بنیاد پر انسان اُن چیزوں کے بارے میں جن کی پابندی کے لئے توانائی نہیں رکھتا اخلاقی طور پر ذمہ دار نہیں ہے۔ (خواہ وہ فعل کو انجام دینے کے لئے ہو یا ترک کرنے کے لئے) اور قیامت کے دن اس سلسلہ میں اس سے سوال وجواب نہ کیا جائے گا اور قابل توبیخ نہ ہوگا۔ اسلامی علوم میں یہ شرط ''تکلیف مالا یطاق'' کے عنوان کے تحت محال اور قبیح ہے اور یہ مسئلہ تمام لوگوں کے نزدیک مشہور، رائج اور قابل قبول ہے۔

مسلمان حکما اور متکلمین نے اس شرط کو ثابت کرنے کے لئے اس کے عقلی پہلو (یعنی یہ کہ نا قابل برداشت تکلیف اور فریضہ کی انجام دہی کا حکم دینا عدالت کے بالخلاف اور ظلم کے واضح مصداقوں میں سے ہے) پر زور دینے کے علاوہ الٰہی حکمت اور خدا کے افعال کے بامقصد ہونے کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ خدا کے تکوینی اور تشریعی افعال کے حکیمانہ ہونے کی مصلحت کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اُنہیں تکلیفوں کو بندوں کے لئے مقرر کرتا ہے جن کے نتیجہ میں مقصد حاصل ہوسکے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ مقاصد اس صورت میں قابل مقدور ہونگے کہ مقرر شدہ فرائض کی انجام دہی افراد کی طاقت و توانائی سے باہر نہ ہو۔

اس بناپر ایسے امور کے لئے تکلیف معین کرنا جو انسان کے لئے غیر مقدور و ناممکن ہے، بے کار و بے فائدہ اور حکمت و مصلحت کے خلاف ہے اور اُن کا حکیم پرور دگار کی طرف سے نافذ ہونا محال [۱] ہے۔

یہ شرط کتاب وسنت میں بھی کئی بار تائید اور تاکید کے مرحلہ سے گذری ہے۔اُن کی بعض مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :

''خدا کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی قدر جتنی کہ اس کے پاس توانائی ہے۔

جو کچھ نیکی سے حاصل کیا اس کے لئے مفید اور جو کچھ برائی سے حاصل کیا اس کے لئے نقصان دہ ہے [۲] ''ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اسی قدر جتنی کہ اس کے پاس طاقت ہے۔ اور ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو حق بیان کرتی ہے اوران پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا ہے [۳]۔

اس بات کے علاوہ کہ انسان کو اصل فعل کی انجام دہی پر قادرہونا چاہئے، یہ بھی ضروری ہے کہ اگر مکلف کے لئے فریضہ کو انجام دینے میں وسائل ومقدمات فراہم کرنے کی ضرورت ہو تو مکلف کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مقدمات کو بھی حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہو، ورنہ حقیقت میں وہ اس فریضہ سے متعلق قدرت اور توانائی نہیں رکھتا [۴]۔

یاد رہے کہ جس طرح علم کا فقدان اس صورت میں اخلاقی ذمہ داری کو معاف کرتا ہے جب انسان نے اپنی لاعلمی کے سلسلہ میں تقصیر اور کوتاہی نہ کی ہو، اسی طرح قدرت اور توانائی کی شرط کے سلسلہ میں بھی کہنا چاہئے کہ ہم بہت سے مقامات پر قدرت وتوانائی حاصل کرنے کے لئے ذمہ دار ہیں [۵] ، مثلاً ہمارا فریضہ ہے کہ اسلامی سرزمین اورملکوں کی حفاظت اور ان کے دفاع کی قدرت وتوانائی اور آمادگی کے وسائل کو فراہم کریں۔

---

[۱] رک۔ سبحانی ، جعفر، الہیات، ج۱، ص۳۰۱۔ شہیدصدر: دروس فی علم الاصول، حلقہ دوم، ص۲۳۵تا ۲۴۰۔
[۲] سورۂبقرۃ، آیت۲۸۶ ۔ علامہ طباطبائیؒ : المیزان، ج۲، ص۴۴۳، ۴۴۴۔
[۳] سورۂ مومنون، آیت ۶۲۔ اور اسی طرح سورۂ انعام، آیت۱۵۲۔ اور علامہ طباطبائی: المیزان، ج۱۵، ص۴۱تا۴۳۔
[۴] ر،ک۔ شیخ طوسی، الاقتصاد فیما یتعلق بالاعتقاد، ص۱۱۹،۱۱۸۔
[۵] ر،ک۔شہید مرتضیٰ مطہری: مقدمہ ای بر جہان بینی اسلامی (انسان درقرآن) ، ص۲۷۷،۲۷۶۔

''(اے ایمان لانے والو!) تم سب ان کے مقابلہ کے لئے ہر ممکن طاقت (جنگی سامان) اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کر لو تاکہ اُن کے ذریعہ خدا کے دشمن اور خود اپنے دشمن اور اُن دشمنوں کو جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے ڈراؤ[1]۔

۵۔ اضطرار (مجبوری) کا نہ ہونا اضطرار (مجبوری) بہت سی جگہوں پر اخلاقی ذمہ داریوں کو ختم کردیتا ہے۔ ''مضطر''اس انسان کو کہتے ہیں جسے مشکل حالات کا سامنا ہو۔ جیسے یہ کہ کوئی انسان کسی بیابان میں عاجز وناتوان اور بھوکا ہو اور اسے کھانے کے لئے مردار کے علاوہ کوئی چیز نہیں ملتی۔

٦۔ اکراہ واجبار کا نہ ہونا اکراہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب انسان کو کسی دوسرے جابر انسان یا گروہ کے ذریعہ دھمکی دی جاتی ہے اور وہ اپنی باطنی مرضی کے برخلاف ایسے فعل کو ترک کرنے یا انجام دینے پر مجبور ہوتاہے جو اخلاقی لحاظ سے برا اور ناپسند ہے۔ جیسے یہ کہ اس سے کہا جائے کہ اگر تم نے اپنے روزہ کو نہیں توڑا تو تمہاری جان لے لوں گا یا یہ کہ اگر فلاں مسئلہ میں سچ بولوگے تم کو کام سے ہٹادیا جائے گا۔

وہ حدیث جسے حدیث رفع کہا جاتا ہے ایسے مختلف امور کو بیان کرتی ہے جن میں انسان کے لئے تکلیف اور ذمہ داری نہیں ہے، اُن امور میں سے ایک ''ما استکر ہوا علیہ'' ہے یعنی وہ امور جنہیں انجام دینے یا ترک کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہےاکراہ اور اضطرار میں فرق یہ ہے کہ اضطرار میں دھمکی دینے والا کوئی نہیں ہوتا ہے بلکہ مجموعی حالات اس طرح ہوجاتے ہیں کہ وہ ناپسند حالات انسان کے اوپر بار ہو جاتے ہیں اور انسان ان نامطلوب حالات کو رفع کرنے کے لئے ناچار ہو جاتا ہے کہ اپنے اخلاقی فریضہ کے برخلاف عمل کرے اور اکراہ میں انسان اس مصیبت اور نقصان کو دفع کرنے کے لئے مجبور ہوتاہے کہ اپنے اخلاقی فریضہ کے برخلاف عمل کو انجام دے جو کسی دوسرے کی دھمکی کے نتیجہ میں اس کے سامنے ہے۔

[1] سورۂانفال، آیت ٦٠

اکراہ اور اضطرار مندرجہ ذیل دو بنیادی اسباب سے وابستہ ہے ایک۔ ایسا صدمہ اور نقصان جس سے بچنا ضروری ہے۔

دو۔ اس تکلیف اور وظیفہ کی اہمیت کہ انسان اکراہ یا اضطرار کی بناپر اسے انجام دینے سے پرہیز کرتا ہے اسلام کے اخلاقی نظام میں بعض اخلاقی فرائض کو اکراہ یا اضطرار کی بنا پر ہرگز ترک نہیں کیا جاسکتا ہے اور ہر حالت میں ان کی پابندی نہیں کی جاسکتی اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے نقصان کو برداشت نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسے کبھی بھی اکراہ یا اضطرار کی بناپر دوسروں کی جانوں کو خطرہ میں نہیں ڈالا جاسکتا ہے یا سماجی مصلحتوں کے خلاف عمل نہیں کیا جاسکتا ہے یا دین کی اہم مصلحتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے[1]۔

۷۔قصد وعمد اخلاقی طور پر ذمہ دار (جوابدہ) ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ انسان قصداً اورعمداً اپنے اخلاقی فریضہ کو نظر انداز کردے۔ اس بناپر جب بھول چوک کی وجہ سے اپنے اخلاقی فریضہ کو ترک کردے تو اخلاقی لحاظ سے وہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ج: ۔ اخلاقی عمل کی پہچان کار آمد اخلاقی نظام کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کی تعیین کے لئے عقلی اصولوں اور معیاروں کو پہچنوانے کے علاوہ ان کے مصداقوں کی بھی واضح طریقہ سے پہچان کرائے۔

انسانی اخلاقی نظام کے ناقص ہونے کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ اخلاقی فضائل ورذائل کو پہچنوانے کے لئے مفید قاعدوں، طریقوں اور راستوں کو پیش کرنے میں وہ ناکام ہیں حتی اگر یہ بھی قبول کر لیا جائے کہ اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کے سلسلہ میں اُن کی طرف سے پیش کردہ کلی اصول اور معیار صحیح ہیں۔

اسلام کے اخلاقی نظام میں اخلاقی فضائل ورذائل کے مصداقوں تک پہنچنے کے لئے اِن تین بنیادی طریقوں پر تاکید کی گئی ہے جو اپنی خاص ماہیت رکھتے ہیں :۱۔ عقل اعمال اور اشیاء کے ذاتی حُسن وقبح کو قبول کرنے اور اچھائی اور برائی کو درک کرنے اور پہچاننے

---

[1] رک۔ شہید مرتضیٰ مطہری: مقدمہ ای بر جہان بینی اسلامی، ۲۷۷۔۲۷۸۔

کے لئے انسانی عقل کی توانائی کا اعتراف کرنے کے ساتھ انسانی عقل کو اسلام کے اخلاقی نظام میں ایک مستقل قاضی کی حیثیت سے مانا گیا ہے۔ عقلی راستہ ایک ایسا راستہ ہے جو وحی سے جدا اور مستقل طریقہ ہے اور یہ بہت سی اچھائیوں اور برائیوں کو پہچنوانے کے لئے ذاتی طور پر قادر ہے۔

۱۔ نمونہ کے طور پر کانٹ کے اخلاقی نظریہ میں جو ممتاز اخلاقی مکاتب میں سے ہے کہا گیا ہے کہ وہ عمل اخلاقی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے جو تکلیف اور فریضہ کا مصداق ہو اور فاعل کی نیت اور مقصد صرف فریضہ کو انجام دینا۔ وہ اس سوال کے جواب میں کہ فریضہ کو کس طرح پہچانا جا سکتا ہے؟ جواب دیتا ہے کہ فریضہ ایک مطلق اور کلی بات ہے جو عام قانونی صورت میں مقرر ہو سکتا ہے۔ کانٹ اس بات کی تشخیص دینے کو انسان کی مشترک عقل یا وجدان کے سپرد کرتا ہے۔یہ بات واضح ہے کہ یہ ضابطہ اور قانون بہت زیادہ کلی، غیر شفاف اور تفسیر کا محتاج ہے جس کے نتیجہ میں اس نظریہ کے کارگر اور مفید ہونے کو بہت زیادہ محدود کر دیتا ہے۔
۲۔ یہاں پر ''عقل'' سے مراد عقلی احکام کی وہ قسم ہے جو قاعدۂ کلیہ: ''حکم عقل و شرع کے درمیان ملازمہ'' کے تحت قرار پا سکتی ہے اور اس قاعدہ کی مدد سے ارادۂ شریعت کی حکایت کر سکتی ہے۔ اس بات کے شرائط و کیفیات کو اصول فقہ کی کتابوں میں ملازمات عقلیہ کی بحث میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

انسانی عقل قطعی طور پر درک کرتی ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کا احترام کرنا چاہئے، ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے جو ان کے لئے مناسب ہے، دوسروں کے مال پر ان کی ملکیت کا احترام کرنا چاہئے، اپنے فائدہ کو دوسروں کے نقصان پہنچانے کا ذریعہ نہ بنائے، دوسروں کی زیادتیوں کی تلافی عادلانہ طریقہ سے کی جائے، افراد کے مخصوص حقوق کا احترام کیا جائے اور اس طرح کی دسیوں ایسی مثالیں ہیں جو اخلاقی فضیلتوں کے اصولوں میں سے ایک اصل ہیں انسانی اور الٰہی اخلاقی مکاتب کے درمیان پائی جانے والی اخلاق کی بعض مشترک چیزیں، اخلاقی اچھائی اور برائی کے متعلق انسانی عقل کا حاصل کروہ نتیجہ اور معلول ہیں۔

البتہ اخلاق کی بہت سی جزئی چیزوں کو سمجھنے میں عقل کی ناتوانی کی بنا پروہ (عقل) ہرگز انفرادی حیثیت سے اخلاق کی جامع و کامل عمارت نہیں کرسکتی

۲۔ فطرت اخلاق سے متعلق نیکیوں کی طرف فطرت کی رغبتیں اوربرائیوں سے باطنی طور پر نفرتیں آدمی کی سرشت میں ہیں اور یہ ایسا قابل اعتماد اور اطمینان بخش طریقہ اور راستہ ہے جس کا مقصد ومبداء انسانیت کا پاک اور غیر آلودہ گوہر قلب سلیم ہے۔

انسان کی فطری رغبتوں کو ان کے مثبت اور معنوی ہونے، ارادی اور زیادہ باخبر ہونے اور ان کا انسانی زندگی سے مخصوص ہونے جیسے معیاروں کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ان غریزی اور طبیعی میلانات سے جدا کیا جاسکتا ہے جو انسان کے اندر پائے جاتے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو رائج عام تہذیب وتمدن اور علم و تعلیم و تربیت سے بے خبر ہیں لیکن اس (فطرت) کے جہاں بین جام اور حق نما آئینہ کا نظارہ کرنے کی برکت سے مکارم اخلاق کے شفاف سرچشموں سے سیراب اور اخلاقی فضائل کے زیور سے آراستہ ہیں۔ اُویس قرنی وہ یمنی بادیہ نشین ہیں جو رسول خدا (ص) کے جمال کو دیکھے بغیر آپ کے فضائل ومکارم کے شیفتہ ہو جاتے ہیں اور آپ سے ملنے کے لئے اپنے وطن اورمال و دولت کو ترک کر دیتے ہیں۔

سلمان فارسی فضیلت اور حقیقت کی جستجو میں ہر دَیر و خانقاہ کا چکر لگاتے ہیں اور عیسائی راہب اور یہودی خاخام سے جس کا دل اس کے بارے میں خبر رکھتا تھا سوال کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ بے حد مشقت کا سامنا کرتے ہیں اور آخر کار یثرب کے اطراف نخلستانوں میں اپنی آرزؤں کی تجلی، امیدوں کی کرن اور اپنے گم گشتہ محبوب کو حبیب خداؐ کی صورت میں پا لیتے ہیں اوریہاں تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اہلبیت اطہار ؑ کے راز داروں میں شمار کئے جانے لگتے ہیں۔

ا۔ یہاں فطرت سے مراد ایسے واضح، معلوم شدہ اور اختیاری، مثبت، عالی، غیر اکتسابی اور باطنی رجحانات ہیں جو تمام انسانوں میں بالقوۃ پائے جاتے ہیں اور حالات کے فراہم ہونے پر فعلیت حاصل کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے معرفت کے سرچشموں اور ترقی کی راہوں کو اور اس سلسلہ میں آنے والی رکاوٹوں کوبار بار یاد دلایاہے اور ان کی نشان دہی کی ہے۔ سورۂ شمس میں کئی بار قسمیں کھانے کے بعد، جس میں آخری قسم آدمی کی جان اور نفس کی قسم ہے، فرماتاہے: ''پھر اُس کو بدی اور تقویٰ کا الہام کیا[1] ہے''۔

الہام سے مراد وہ علم ہے جو تصور اور تصدیق کی صورت میں انسانی جان کے سپرد کردیا گیا ہے۔ خدا کی طرف سے فجور اور تقویٰ کا الہام اس معنی میں ہے کہ انسانی رفتار کی اچھائی اور برائی کو فطری طور پر اسے بتایا اور سکھایا گیا ہے۔ مثلاً انسان واضح طور پر یتیم کا مال کھانے کی برائی کو اپنے مال کے استعمال سے جدا کرنے کی صلاحیت اور قدرت رکھتاہے ۔[2]

خدا وند عالم سورۂ روم میں فرماتا ہے'' :بس (اے رسول!) اپنے رُخ کو دین توحید (اسلام) کی طرف رکھےئے اس حال میں کہ آپ دوسرے تمام ادیان ومذاہب سے منہ پھیرے رہیں اور حق پرست رہیں۔ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر خدا نے لوگوں کو خلق کیا ہے خدا کی خلقت (توحیدی فطرت) میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوسکتی یہی ہے سیدھا اور مستحکم دین۔ لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے ہیں''۔[3] اس آیت میں اس دین کو جو عقائد اور اخلاق، حقوق وغیرہ کی تعلیمات کا مجموعہ ہے،ایک فطری بات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جسے پہچاننا اور اس کی طرف رغبت پیدا کرنا انسان کی سرشت میں ڈال دیا گیا ہے[4]۔

۳۔وحی

گذشتہ دو طریقے اگرچہ بہت سی جگہوں پر مشکل کشائی کرتے ہیں لیکن اُن کا مفید وکارگر ہونا کلی اور اصولی امور تک منحصر ہے اور جزئیات کی تفصیل بتانے اور اُن کو معین کرنے کے مرحلہ میں سخت نقصاندہ،ناکام اور اختلاف کا باعث بنتے ہیں۔

[1] سورۂ شمس، آیت۸۔

[2] علامہ طباطبائی ؒ، المیزان، ج۲۰، ص۲۹۷، ۲۹۸

[3] سورۂروم، آیت ۳۰۔

[4] رک۔ علامہ طباطبائیؒ ، المیزان ج۱۶، ص۱۷۸۔

اسی بنیاد پر خدا پرستی پر مبنی اخلاقی نظام میں ''وحی'' پہچان کا تیسرا طریقہ جو گذشتہ دو طریقوں کو مکمل کرتی ہے۔ وحی کو اخلاقی مفاہیم کی تعیین و تفسیر میں اور ان کی جزئیات کو بیان کرنے کی قدرت رکھنے کی بنا پر اخلاقی عمل کو پہچنوانے کے سلسلہ میں پہلا مرتبہ حاصل ہے۔ اگرچہ یہ کبھی بھی اُن دونوں کو نظرانداز نہیں کرتی ہے بلکہ ہمیشہ اُن کی ترقی اور زیادہ مفید قرار دینے پر تاکید کرتی ہے۔

اسلام کے اخلاقی نظام میں اخلاقی فضیلتوں کو اِن عنوانات کے تحت پہچنوانا گیا ہے: حَسَنَۃ (نیک، پسندیدہ) ، حلال، اجرو ثواب کا باعث اور جو کچھ انسان کے بہشت میں جانے کا سبب ہے۔ اور اس کے ساتھ اخلاقی برائیوں کو ذنب (جرم) ،اِثم (گناہ) ، حرام، گھاٹے اور جو کچھ، جہنم میں جانے کا باعث ہے ان جیسے عنوانات کے ذریعہ شناخت کرائی گئی ہے۔

اسی طرح اخلاقی لحاظ سے تمام مثبت اور منفی مفاہیم کی اہمیت اور اس سلسلہ میں داخل نمایاں باتیں جیسے سہل و دشوار، پوشیدہ و آشکار، فاعل کے مقصد اور نیت کی حالت و حقیقت اور اس کے ہمراہ یا بعد میں آنے والے کمی اور کیفی آثار و نتائج پر توجہ کرتے ہوئے کافی دقت کے ساتھ تحقیق کی گئی ہے اور انھیں جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ کتاب و سنت میں اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کی طبقہ بندی کے سلسلہ میں پائے جانے والے بہت سے نکات پر دقت کی ضرورت ہے، جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔

د۔ اخلاقی اقدار کا تزاحم اور ترجیح کا معیار عمل کے مرحلہ میں اخلاقی قدروں کا تزاحم انسان کی اخلاقی مشکلات میں سے ایک ہے۔یعنی انسان ہمیشہ اپنی شخصی اور سماجی زندگی کے دوران ایک ہی وقت میں دو یا اس سے زیادہ اخلاقی تکلیفوں سے سامنا کرتا ہے اس طرح سے کہ اُن سب کی پابندی ایک وقت میں ممکن نہیں ہوتی اور اُن میں سے بعض فرائض کی انجام دہی دوسرے زمانہ میں بھی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس بنا پر اس کے پاس اس کے سوا دوسرا راستہ نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ اُن میں سے ایک کا انتخاب کرلے۔

اس ناگزیر انتخاب کے سلسلہ میں ترجیح کا معیار کیا ہے؟ کیا اسلام کے اخلاقی نظام میں اس طرح کے انتخابات کے لئے کوئی معیار وملاک بیان کیا گیا ہے؟

ایک مفید اخلاقی نظام سے یہی امید کی جاسکتی ہے کہ اس طرح کی مشکلوں کو حل کرنے لئے ایسے معقول معیار کا مشورہ دیا جائے جسے سمجھا اور بروئے کار لایا جا سکے ۔ اسی بنیاد پر فلسفۂ اخلاق کی بعض کتابوں میں اس بات پر توجہ کی گئی ہے۔ اسلامی علوم میں فرائض کے درمیان کا مسئلہ خواہ اخلاقی ہو یا حقوقی، علماء اصول کی توجہ کا خاص مرکز بنا ہوا ہے اور تزاحم کے باب میں اس پر گفتگو کی گئی ہے۔

اِن لوگوں نے مقام عمل میں قدروں کے ٹکراؤ اور تزاحم وکشمکش کی قسموں کو بیان کرنے کے علاوہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے معیاروں اور قاعدوں کو بھی بتایا اور پہنچوایا ہے[1]۔

اُن معیاروں میں سب سے زیادہ اہم اور قابل فہم مندرجہ ذیل ہیں :اخلاق اور حقوق کے درمیان میں عقلی اور شرعی لحاظ سے ترجیح دینے کا بہترین معیار، ہر فریضہ کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہے۔ یعنی جب مجبور ہوجائیں کہ دو یا چند اخلاقی تکلیفوں میں سے کسی ایک کو اطاعت اورپابندی کے لئے انتخاب کریں تو اُن میں سب سے زیادہ اہم تکلیف کا انتخاب کرکے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم تکلیف کا انتخاب کس طرح کیا جائے؟ کیا سب سے زیادہ اہم تکلیف کی تشخیص کے لئے کوئی معیار ہے؟

انسانی عقل بہت سی جگہوں پر سب سے زیادہ اہم تکلیف کی پہچان کرنے پر قادر ہے۔ (مثال کے طور پر) جب مجبور ہوجائیں کہ دوسرے کی گاڑی کو اس سے پوچھے بغیر استعمال کرکے ایک مریض کی جان کو (ڈاکٹر کے پاس جاکر) خطرہ سے بچایا جائے یا دوسروں کے مال کا احترام کرنے کے اصول کی پابندی کی جائے، اِن دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے تو عقلاً

[1] رک: نائینیؒ فوائد الاصول(تقریر شیخ محمد علی کاظمی) ، ج۱، ۲، ص۳۱۷، اور ۳۳۵۔

بیمار کی جان کو بچانا اہم اورنہایت ضروری ہوگا۔ انسانی عقل یہاں اور اس طرح کی دوسری جگہوں پر انسان کے حق مالکیت کو نظر انداز کرنے کو موجہ اور معقول مانتی ہے۔

بہت سی جگہوں پر عقل اور انسان کے وجدانی اور باطنی معلومات کے درمیان تزاحم سے حل کا راستہ نہیں ملتا لیکن شریعت نے اپنے خاص طریقوں سے اصولوں کو بیان کرکے اور اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کی درجہ بندی اور قدر وقیمت کو طے کرکے مہم تر فریضہ کی نشاندہی کی ہے مثلاً اسلام کے اخلاقی نظام میں جب بھی انسان کے ذمہ خدا سے متعلق اور بندوں سے مربوط فرائض میں ٹکراؤ ہو تو لوگوں سے مربوط فریضہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اسی بناپر دین کی مقدس کتابوں میں لوگوں کی جان ومال وآبرو کو اہم امور میں شمار کیا گیا ہے جن کے سلسلہ میں دست درازی اور زیادتی نہیں ہونی چاہئے۔

اِن تینوں چیزوں میں سے لوگوں کی جان اور زندگی کی حفاظت بقیہ دو چیزوں پر مقدم ہے۔ اس بناپر اخلاقی مفاہیم کو کتاب وسنت میں موجود مطالب اور اُن کے سلسلہ میں پائی جانے والی تعبیرات اور نظریات پر توجہ کرتے ہوئے حاصل کرنا چاہئے۔

کبھی ممکن ہے عقلی اور وجدانی قاعدے اور دینی کتابوں کی تعبیریں ایک فریضہ کی دوسرے کے مقابلہ میں اہمیت اور برتری کو معین کرنے کے لئے موجود نہ ہوں تو ایسی جگہوں پر انسان کسی کو بھی حسب خواہش انتخاب کرسکتا ہے۔ اس طرح اسلام کے اخلاقی نظام نے اخلاق سے متعلق اچھائیوں اور برائیوں کی جزئیات اور مصادیق کو پہچنوانے کے سلسلہ میں ضروری تدبیروں پر غور وفکر سے کام لیا ہے جو ایک مفید اخلاقی نظام کے ارکان میں سے ہے اور اس سلسلہ میں بھی اس کی حیثیت بے مثال ہے۔

دوسرا حصّہ

اخلاق کے عام مفاہیم

مقدمہ۔ پہلی فصل: ہدایت کرنے والی نفسانی صفت۔ دوسری فصل: مؤثر نفسانی صفات۔تیسری فصل: مؤثر نفسانی صفات۔

چوتھی فصل: مؤثر نفسانی صفات

مقدمہ

ایک کامل انسان کی وہ خصوصیتیں جو موجودات وکائنات کی خلقت کی حکیمانہ توجیہ کے لئے شرط اور ضروری ہیں کون سی ہیں؟ایک خدا پسند انسان کس طرح سوچتاہے اور اس کے لئے اس کے پاس کون سے نفسانی معیار ہیں؟ اور کے مختلف حلقوں میں وہ کس طرح عمل کرتاہے؟ اخلاق اسلامی میں انسان کی رفتار، نفسیات اور فکر کے درمیان کے رشتوں کو کس طرح منظم کیاجائے؟ اخلاق کے مختلف مفاہیم کے درمیان کیا تقدم وتأخر پایا جاتا ہے؟

دوسرے لفظوں میں کیا اخلاق اسلامی کی نظر میں ہر ایک اخلاقی مفہوم خاص طور پر نفسانی مفاہیم،اُن کی کارکردگی پر توجہ کرتے ہوئے جو الٰہی انسان کے تحقق میں مؤثر ہیں، اسلام کے اخلاقی نظام میں اُن کا خاص مرتبہ ہے، اس طرح سے کہ اس کے ذریعہ اخلاق اسلامی کی منظم عمارت کی تصویر بنائی جا سکے؟ کیا اخلاقی مفاہیم اجنبی اور ناشناس مہرہ کی طرح اور ایک دوسرے سے جدا ہیں اور کسی خاص نظم وترتیب حامل نہیں ہیں ؟

جب اخلاقی فضیلتیں اسلامی اخلاق کی تعمیر میں کلی طور پر کچھ خاص مقاصد کو حاصل کرنے میں لگی ہوں تو ایسی صورت میں اسلام کے اخلاقی نظام کا مرکز ومحور کون سی فضیلت ہے جس تک پہنچنے کے لئے بقیہ تمام فضیلتیں مقدمہ کا عنوان رکھتی ہیں اور انہیں کی طرف

رُخ کئے ہوئے ہیں؟ مختصر یہ کہ گرانقدر اور خدا پسند انسان مختلف مرحلوں (اقتصاد، سیاست، معاشرت، جنسی روابط، خانوادگی زندگی، تعلیمی زندگی، معلمی زندگی، صحت و......) میں کن خصوصیات کا حامل ہے؟

اس کتاب کا یہ حصہ مندرجہ بالاسوالات کے ذیل میں خداپسند اور مثالی انسان کی توصیف وتعریف کرتا ہے۔ اس حصہ میں اخلاق کے وہ عام مفاہیم بیان کئے جائیں گے جو انسان کی زندگی سے اختصاص نہیں رکھتے خواہ فضائل ہوں یا رذائل۔ اس بحث میں وارد ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ ایسے کلیات اور مقدماتی موضوعات کی طرف اشارہ کیا جائے جو اخلاق اسلامی کے فلسفی، کلامی اور انسان شناسی فرضیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ فلسفی فرضیہ اور تصورات: اخلاق اسلامی کے فلسفی فرضیہ اور تصورات میں سے ایک یہ ہے کہ انسان دو جداگانہ جوہر روح اور بدن سے مرکب ہے۔ اِن دونوں کی پیدائش کی کیفیت کو نظرانداز کر کے دیکھا جائے تو بدن روح کی ترقی اور سعادت یا تنزلی اور شقاوت کے لئے ایک وسیلہ ہے۔ اس بنا پر انسانی وجود کی حقیقت اس کی روح کے ذریعہ تشکیل پاتی ہے۔ انسان کی روح[1] اس کے بدن سے جدا ہے اور موت کے وقت مادی بدن سے بے نیاز ہوتی ہے۔ یہ روح ہے جو دردو رنج اور لذت وسعادت کو محسوس کرتی ہے اور انسان کا کمال اسی کے کمال میں ہے۔ روح جاوید اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس کے کمال اور سعادت کو اس کی مجموعی دنیوی اوراخروی زندگی میں تلاش کرنا چاہئے[2]۔

۲۔ کلامی اصول: حضرت آدم ۔ اور عالم کی خلقت کا حکیمانہ ہونا اخلاق اسلامی کے کلامی اصولوں اور بنیادوں میں سے ہے۔ اس مقصد کے تحقق کے لئے علم اخلاق ایک نسخہ اور طریقۂ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ خلقت کے سلسلہ میں مقصد اور حکمت کے انکار سے اس مقصد کے تحقق کی کیفیت کوئی معنی نہیں رکھتی اور عقلی لحاظ سے اخلاق کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ خلقت کے

---

[1] اس کتاب میں روان، نفس، روح اور جان سبھی ایک مفہوم رکھتے ہیں۔
[2] صدرالدین شیرازی: الاسفا رالاربع، ج۸۔ ابن سینا: الاشارات والتنبیہا ت، ج۳، نمط ہفتم ۔ سہروردی، شہاب الدین: مجموعۂ آثار؛ج۲۔ علامہ حلی: کشف المراد، مقصددوم

بامقصد ہونے کا اثبات اوراس مقصدکی تفسیر علم کلام کے ذریعہ ہوتی ہے اور عالم اور حضرت آدم ۔ کی پیدائش کے بلند مقصدہو نے کے سلسلہ میں جواصول اور تفسیرپیش کی گئی ہے علم اخلاق اسے قبول کرکے اس کی وضاحت اور اس کے تحقق کے لئے علمی تجویزوں کو پیش کرتا ہے۔

حضرت آدم ۔ کی خلقت میں خدا کا جو مقصد تھا اس سے اخلاق اسلامی کے ستون کی تعمیر ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ قرآن وروایات کی تعبیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان زمین پرخدا کا خلیفہ اور جانشین ہے[1]۔

حکماء ا ورعقلاء کی عقلی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا کی خلقت کے سلسلہ میں خدا، اپنی ذات کے سواکوئی مقصد نہیں رکھتا ہے۔عارفوں اورسالکوں نے اپنے معنوی سیروسلوک کے ذریعہ جوکچھ حاصل کیا ہے اور جوکچھ دینی معارف میں موجود ہے، اس کی بنیاد پریہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخلاق اسلامی سے متعلق تمام عناصر اور فضیلتیں اس کوشش میں ہیں کہ انسان کائنات کے تمام امور میں خدا کے علاوہ کسی کو مؤثراور صاحب اختیار نہ سمجھے اورخود بھی جہاں تک ممکن ہو اپنے ارادہ اور اختیار سے اپنے وجود کے مختلف شعبوں میں خدا کے اسماء وصفات کی جلوہ گاہ بن جائے: مہربانی میں رحمت الٰہی کا مظہر، سخاوت میں خدا کے جودوسخا کا مظہر، خشم وغضب میں الٰہی انتقام کا مظہر وغیرہ۔ یہ وہی مقاصد ہیں جنھیں کبھی خلیفہ الٰہی کی منزلت اوربعض لقاوفنا کے مرتبے اور بعض مقام قرب الٰہی جیسے عناوین سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاق اسلامی کے کلامی اصولوں میں سے دوسری اصل، انسان کے ہمیشہ رہنے کا یقین اور آخرت کے حساب وکتاب اور اس کے بعد اُس دنیا میں جزا اور سزا کے ہونے پر اعتقاد رکھنا ہے۔قیامت، اُخروی حساب وکتاب، جنت وجہنم پر یقین کو خلقت سے متعلق مقاصد کے تحقق کے لئے اخلاق اسلامی کی تعمیل کا تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً اس طرح کے رکن کی موجودگی کے بغیر اخلاق اسلامی پائدار نہ ہوسکے گا بلکہ ایک مفید اخلاقی نظام کے سلسلہ میں گفتگو بھی نہیں کی جاسکتی ہے۔

---

[1] منجملہ ان کے سورۂ بقرہ آیت ۳۰ کی طرف رجوع کیجئے۔

اس دنیا میں انسانی رفتار کی اصلاح اور اُسے منظم کرنے میں قیامت پر یقین کرنے سے متعلق قرآن وروایات کی تاکیدیں تفسیر وتوضیح کے قابل ہیں حتیٰ اس پر گمان کی تأثیر بھی اسی ضمن میں ہے، البتہ قیامت کا اثبات، اس کی کیفیت اور اس دن کے حساب وکتاب اور جزاوسزا کے طریقوں سے متعلق گفتگو علم کلام میں ہوتی ہے اور یہ مسئلہ علم اخلاق میں ایک مسلّم اصول اور ایک مستحکم بنیاد کے عنوان سے قبول کیا گیا ہے[1]۔

۳۔انسان کے وجودی پہلو :ایک قدیم تقسیم کے لحاظ سے انسان کے وجودی پہلوؤں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: فکر، نفسانی صفات اور رفتار وعمل۔ انسانی وجود کا فکری حصہ حقائق اور واقعیات کی قسموں کو کشف کرنے کا ذمہ دار ہے۔ انسان کی نفسانی صفات وملکات والا حصہ اس کے اعمال ورفتار میں حرکت پیدا کرنے والی طاقت کے عنوان سے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجودی مراتب اور حقیقت کو بیان کرنے والا ہے۔ رفتاری حصّہ کی بھی تعریف یوں کی گئی ہے: انسانی وجود کا وہ حصہ جو ظاہری لحاظ سے واضح، نمایاں اور آشکار ہوتا ہے۔

اخلاق اسلامی، نفسانی صفات وملکات کے علاوہ انسانی فکر کی طرف بھی قیمتی اوراخلاقی نظر رکھتا ہے اور انسانی رفتار وعمل کے لئے بھی اخلاقی اوامر ونواہی اور وظائف وفرائض بیان کرتا ہے۔

۴۔ انسان کے وجودی پہلوؤں کا باہمی رابطہ : بے شک انسانی وجود کے تینوں پہلو آپس میں ایک محکم اور قریبی رابطہ رکھتے ہیں اور سبھی آپس میں تاثیر گذار اورتاثیرپذیر ہیں۔ مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں قرآن وسنت کی کچھ مثالوں کی طرف اشارہ کیا جائے :

الف ۔فکر اور نفسانی صفات میں رابطہ: اس رابطہ پر دو زاویوں سے توجہ دینی چاہئے: انسان کی فکر پر نفسانی صفات کی تأثیر اورنفسانی صفات کی کیفیت پر علم اور فکر کی تأثیر۔

---

[1] رک۔ صدرالدین شیرازی، الاسفار الاربعۃ، ج۹۔ ابن سینا: الاشارت والتنبیہات، ج۳، نمط۸ علامہ حلیؒ : کشف المراد، مقصد ششم۔

پہلا زاویہ: یہ ایسی واقعیت ہے جس پر قرآن وروایات میں بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ منجملہ ان کے رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

''حبّک للشّئ یُعمی ویصمّ'' (ایک شئے سے تمہاری محبت تم کو اس شئے کی نسبت اندھا اور گونگا بنا دیتی ہے۔)

حضرت علی ۔نے فرمایا: ''جو بھی کسی چیز کا عاشق ہوجائے وہ چیز اس کی آنکھوں کو اندھا اور اس کے دل کو بیمار بنا دیتی ہے۔ وہ بیمار آنکھوں سے دیکھتا اور بیمار کانوں سے سنتا ہے، جسمانی خواہشوں نے اس کی عقل کے پردہ کو پھاڑدیا ہے، دنیا کی دوستی نے اس کے دل کو مردہ کر دیا ہے، اس کی جان دنیا پر فریفتہ ہے اور وہ اس کا بندہ ہے اور جس کسی کے ہاتھ میں دنیا کی تھوڑی سی بھی چیز ہے وہ اس کے لئے پریشان ہے اور اس کی بھی بندگی کرتا ہے کہ جس کی طرف وہ دنیا جھکتی ہے۔

جہاں جاتاہے وہ بھی جھک جاتاہے اور جدھر وہ مڑتی ہے وہ بھی مڑ جاتا ہے [1] یہ عبارات اور اس طرح کے دوسرے بہت سے نمونے اس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں کہ فکر کی وابستگی نفسانی صفات وملکات سے ہے اور یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ صحیح معرفت صرف اخلاقی نظارت کے سایہ میں اور نفسانی مساعد کے ذریعہ میسر ہوگی۔

دوسرا زاویہ: نفسانی صفات وملکات میں کسی بھی طرح کی تغییر اور تبدیلی جود میں لانا ہر اختیاری عمل کے مانند خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی، فکر و علم کا محتاج ہے۔

ب۔ نفسانی صفات اور عمل میں رابطہ: یہ رابطہ بھی دو لحاظ سے قابل توجہ ہے: عمل پر نفسانی صفات کی تأثیر اور نفسانی صفات پر رفتار وعمل کی تاثیر۔

ایک: ہر ایک نفسانی ملکات اور حالات اپنے لحاظ سے عمل کا مطالبہ کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کے ساتھ ہی انسانی عمل کی بھی اصلاح ہوجائے گی۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ۱۰۹ (بعض نسخہ میں خ ۱۰۸)۔

قرآن کریم ظاہر سے باطن سے متاثر ہونے کے بارے میں فرماتا ہے'' :یہ ہیں (فرائض خدا) اور جو بھی شعائر الٰہی کی تعظیم کرے گا حقیقت میں وہ اس کے دل کے تقویٰ کی نشانی ہے[1] ۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں'' :ظاہر کی خرابی باطن کے فاسد ہونے سے وجود میں آتی ہے اور اگر کوئی اپنے باطن کی اصلاح کرے تو خدا اس کے ظاہر کی اصلاح کردے گا[2] ۔

دو: ایک عمل کی تکرار سے اسی کے مطابق نفسانی ملکہ اور صفت کو ایجاد کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے اور ظاہر کی اصلاح اگرچہ زحمت و مشقت کے ہمراہ ہو باطن کی اصلاح کی موجب ہوسکتی ہے اور اسی کے مطابق باطنی ملکہ اور صفت کی پیدائش کے اسباب کو بھی فراہم کرسکتی ہے۔

حضرت رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں :نیک عمل کی تکرار اور مداومت سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہیں: برائیوں کا ترک ہو جانا، پستی اور بے عقلی سے دور ہوجانا، گناہوں سے باہر آنا (گناہوں کا معاف ہونا) ،یقینی، آزادی اور کامیابی سے محبت کرنا، بخشنے والے خدا کا فرماں بردار ہوجانا، برہان وحجت(دلیل) کا احترام، شیطان سے کنارہ کشی، عدل اور حق بات کو قبول کرنا ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو نیک کاموں کی تکرار اور اُن کی مداومت سے عقلمند لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں[3] ۔

ج ۔ فکراور عمل میں رابطہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ عقلی لحاظ سے علم وآگاہی، اختیاری عمل کے مبادی اور مقدمات میں سے ہے اور اصولاً عملی علوم میں تعلیم و تعلم اسی اصول پر مبنی ہے۔

البتہ عمل کی علم وفکر پر تاثیر، تجربہ شدہ اور قابل اثبات مسئلہ ہے۔

---

[1] سورۂ حج، آیت۳۲۔
[2] عبدالرزاق گیلانی: مصباح الشریعۃ ترجمہ جلال الدین اُرموی، ص۴۴۶۔ اسی طرح نہج البلاغہ، خ۱۵۴ کی طرف رجوع کیا جائے
[3] ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، ص ۱۷۔

مشرق کے غیر الٰہی مذاہب اور عرفانی مسلکوں میں حقیقت و معرفت تک پہنچنے کے لئے تعلیم کے ساتھ تہذیب نفس، ریاضت، تعلّم اور مخلصانہ عمل ہمیشہ سے ایک طریقہ رہا ہے[1]۔

الٰہی ادیان مخصوصاً اسلامی تہذیب میں خدا شناس علماء ربانی اور کوئے حقیقت سائکین نے ہمیشہ مخلصانہ عمل اور شرعی ریاضتوں پر ایک مستحکم اور قابل اعتماد راستہ کے عنوان سے زور دیا ہے اور قرآن وروایات میں بھی اس سلسلہ میں تاکید کی گئی ہے۔

منجملہ ان کے قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے'' :خدا سے ڈرو اور خدا تم کو تعلیم دیتا ہے اور خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے''[2] اے ایمان لانے والو!اگر تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرتے ہو تو خدا تم کو (حق اور باطل کے درمیان) تشخیص دینے والی قوت عطا کردے گا[3]۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ انسانی وجود کے تینوں پہلو ایک نزدیکی معاملہ میں باہم عمل کرتے ہیں۔ ایک وسیع اخلاقی نظام کے لئے ضروری ہے کہ اوّلاً اس میں تینوں پہلوؤں کو اخلاقی لحاظ سے شامل ہوں اور ثانیاً انسانی وجود کے تینوں پہلوؤں کے درمیان پائی جانے والی باہمی تاثیر وتأثر پر بھی توجہ دے۔

اخلاق کے عام مفاہیم اخلاق کے عام مفاہیم سے مراد وہ اخلاقی فضائل ورذائل ہیں جو نفسانی صفت اور ملکہ کی صورت میں ہیں اور انسانی زندگی کے کسی خاص پہلو سے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ تمام پہلوؤں کو متأثر کرتے ہیں۔

---

[1] رک۔ جان بی ناس: تاریخ جامع ادیان، ص۲۵۴تا ۲۶۷۔
[2] سورۂبقرۃ، آیت۲۸۲۔
[3] سورۂ انفال، آیت۲۹۔

اس طرح اخلاقی مفاہیم بھی دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں: اُن میں سے بعض، انسان کے معنوی اور اخلاقی امور میں رہبری کا کردار ادا کرتے ہیں اور بعض، مؤثر نفسانی صفت ہیں جو ہدایت کرنے والی صفت کے تحت محقّق ہوتے ہیں اور عمل میں مخصوص آثار بھی رکھتے ہیں۔

اس طرح اخلاق اسلامی کے وسیع نقشہ کو الٰہی اور خدا پسند انسان کی تعریف کے لحاظ سے مندرجہ ذیل شکل میں کھینچا جا سکتا ہے۔

اخلاقی مفاہیم کا کلی نقشہ

پہلی فصل

ہدایت کرنے والی نفسانی صفت

جیساکہ ذکر ہوچکا ہے اس طرح کی نفسانی صفتیں، انسان میں تاثیر گذار قوتوں کے طریقوں کی وضاحت کرتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بنیادی اور اصلی مفاہیم یقین اور ایمان ہیں۔ جو ایک نیک اور قدر و قیمت والی نفسانی صفت کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔ یقین ایمان کی سرپرستی میں عمل کرتا ہے۔ البتہ ناپسندیدہ صفات اور منفی مفاہیم بھی ہیں جو اسی نفسانی صفت کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کتاب میں گفتگو کا محور فضیلتیں ہیں اس لئے رذائل کے بارے میں گفتگو آفات اور موانع کے عنوان سے فضائل کی تشریح کے بعد ہوگی۔

ایمانا خلاق اسلامی میں ''ایمان'' ہدایت کرنے والی سب سے زیادہ اہم نفسانی صفت کے عنوان سے بہت زیادہ مقبول ہے اور اس پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے علم ویقین کی طرح اس کے مبادی اور مقدمات کو حاصل کرنے کے لئے ترغیب و تشویق سے کام لیا گیا ہے اور اسلام کے اخلاقی نظام میں اُن ذرائع اور طریقوں کی خاص اہمیت ہے جو انسان کو ان نفسانی صفات تک پہنچاتے ہیں۔ جیسے پسندیدہ فکر، خاطرات وخیالات اور الہامات۔ نفسانی صفات کے سامنے ایسے موانع اور رکاوٹیں ہیں جو انسان کو باایمان ہونے سے روکتی ہیں جیسے جہل بسیط یا مرکب، شک اور حیرت، مکاری اور فریب کاری، ناپسندیدہ نفسانی خیالات اور شیطانی وسوسہ وغیرہ۔

اِن سب کی ہمیشہ سے مذمت ہوئی ہے اوران سے روکا گیا ہے ایمان کی حقیقت اور اس کی شرطوں کے سلسلہ میں زمانۂ قدیم سے الٰہی مکاتب کے پیرؤوں خاص طور سے مسلمان متکلمین کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہے[1]

اخلاق اسلامی کے دو اصلی منابع یعنی قرآن کریم اور روایات میں ایمان کی اہمیت اور اس کے مرتبہ کے بارے میں بہت زیادہ گفتگو کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ایمان کی اہمیت ایمان کے بلند مقام و منزلت کو بیان کرنے کے لئے یہ حدیث کفایت کرے گی کہ پیغمبر نے اپنی نصیحتوں میں جناب ابوذر سے فرمایا '' :اے ابوذر !خداوند متعال کے نزدیک اس پر ایمان رکھنے سے اور ان چیزوں سے پرہیز کرنے سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہے جن چیزوں سے منع کرتا ہے [2]۔

یہ بات واضح ہے کہ خدا کے ذریعہ منع کی گئی چیزوں سے پرہیز، صرف اس پر ایمان کے سایہ میں ممکن ہے اور حقیقت میں یہ ایمان کی برکتوں میں سے ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں'' :خداوند متعال دنیا کو، اُن لوگوں کے واسطے بھی قرار دیتا ہے جن کو دوست رکھتا ہے اور اُن لوگوں کے واسطے بھی جن پر غضبناک ہے لیکن ایمان نہیں دیتا مگر اُن لوگوں کو جنہیں دوست رکھتا ہے [3]۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ مومن کے مقام و منزلت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں'' :جب بھی لوگوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے گا اور وہ لوگ خدا اور بندۂ مومن کے درمیان وصال ورابطہ پر نظر کریں گے اس وقت اُن کی گردنیں مومنین کے

[1] رکـجواد محسن، نظریہ ایمان درعرصہ کلام وقرآن، ص۱۹تا ۱۸۰۔
[2] شیخ طوسیؒ : امالی، ص ۵۳۱، ح۱۱۶۲۔
[3] کافی، ج۲، ص۲۱۵، ح۴،اور ح۳ بھی دیکھئے۔

سامنے جھک جائیں گی، مومنین کے امور اُن کے لئے آسان ہوجائیں گے اور اُن کے لئے مومنین کی اطاعت کرنا سہل اور آسان ہوجائے گا[1]۔

یہ تمام بلند درجات جو روایتوں میں ایمان کے لئے بیان ہوئے ہیں اس اثر کی وجہ سے ہیں جو ایمان انسان کے کمال اور سعادت میں رکھتا ہے۔ ایمان ایک طرف خلیفۂ الٰہی کی منزلت پانے کے لئے سب سے آخری کڑی اور قرب معنوی کا وسیلہ ہے اور دوسری طرف قرآن وروایات کے مطابق تمام پسندیدہ نفسانی صفات اور عملی نیکیوں کے لئے مبدأ اور کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ ایمان کی ماہیتاگرچہ ایمان کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں مسلمان متکلمین کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتاہے پھر بھی اُس کی اہم خصوصیتیں یہ ہیں :

ایک۔ ایمان وہ قلبی یقین، تصدیق اور اقرار ہے جو ایک طرف سے کسی امر کی نسبت نفسانی صفت اور حالت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے خالص شناخت اور معرفت سے فرق رکھتا ہے[2]۔

دو۔ ایمان کے محقق ہونے کی جگہ نفس اور قلب ہے اور اگرچہ اس کا قولی اور فعلی اثر ہے لیکن اس کا محقق ہونا قول یا عمل پر منحصر نہیں ہے۔

تین۔ اسلام اور ایمان کے درمیان کی نسبت عام وخاص مطلق جیسی ہے یعنی ہر مومن مسلمان ہے لیکن ممکن ہے بعض مسلمان صرف ظاہر میں حق کو تسلیم کئے ہوں۔

۳۔ایمان کے اقسام اور درجات اوّلاً: ایک قسم کے لحاظ سے ایمان کی دو قسمیں ہیں: ''مستقر''اور ''مستودع''(مستودع یعنی وہ ایمان جو عاریت اور امانت کے طور پر لیا گیا ہو)۔

---

[1] کافی، ج۸، ص۳۶۵، ح۵۵۶۔
[2] رک: سید مرتضیٰ: الذخیرۃ، ص ۵۳۶۔ شیرازی، صدرالدین: تفسیر القرآن، ج۱، ص۲۴۹۔ شیخ مفید: اوائل المقالات، ص۴۸۔

قرآن کریم میں ارشاد ہورہاہے'' :وہ وہی ہے جس نے تم کو ایک بدن سے پیدا کیا ہے۔ پھر تمہارے لئے قرارگاہ اورامانت کی جگہ مقرر کردی۔ بے شک ہم نے اپنی نشانیوں کو اہل بصیرت اور سمجھدار لوگوں کے لئے واضح طور سے بیان کردی ہیں[۱]۔

حضرت امام موسیٰ کاظم ۔ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں'' :مستقر ایمان وہ ایمان ہے جو قیامت تک ثابت وپائدار ہے اور مستودع ایمان وہ ایمان ہے جسے خداوند موت سے پہلے انسان سے لے لے گا[۲]۔

۳۔ حضرت علی ۔ ایمان کی قسموں کے بارے میں فرماتے ہیں'' :کچھ ایمان دل کے اندر ثابت ہوتے ہیں اور کچھ، دل اور سینہ کے درمیان، مرتے وقت تک بطور عاریت اور ناپائدار ہوتے ہیں لہٰذا اگر کسی سے بیزار ہو تو اتنی دیر انتظار کرو کہ اس کی موت آجائے۔ اس وقت میں اس سے بیزار ہونا بر محل ہوگا[۳]۔

ثانیاً : ایمان کی حقیقت کے مراتب اور درجات ہیں اور اس میں نقصان اور کمی کا بھی امکان ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نے اس حقیقت پر تاکید کرنے کے علاوہ ایمان کو زیادہ کرنے یا اس کے کم ہونے کے اسباب کو بھی کثرت سے بیان کیا ہے، منجملہ ان کے قرآن کریم میں آیا ہ'مومنین وہی لوگ ہیں جن کے دل اس وقت ڈرنے اور لرزنے لگتے ہیں جب خدا کا ذکر ہوتا ہے اور جب اُن پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تواُن کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں[۴]۔

حضرت امام جعفر صادق ۔نے اپنے ایک شیعہ سے فرمایا'' :اے عبدالعزیز! حقیقت یہ ہے کہ ایمان کے دس درجے ہیں سیڑھی کی طرح کہ اسے زینہ بہ زینہ طے کرنا چاہئے اور بلندی پر پہنچنا چاہئے۔ لہٰذا جس کا ایمان دوسرے درجہ پر ہے اسے پہلے درجہ والے مومن سے نہیں کہنا چاہئے کہ تمہارے پاس ایمان نہیں ہے اور اسی طرح تیسرے درجہ والا دوسرے درجہ والے کو یہاں تک کہ

---

[۱] سورۂ انعام، آیت ۹۸۔

[۲] تفسیر عیاشی، ج۱، ص۳۷۱، ح۷۲۔ تفسیر قمی، ج۱، ص ۲۱۲، ح۱۔

[۳] نہج البلاغہ، خ۱۸۹ چاپ انصاریان ص: ۳۶۸۔

[۴] سورۂ انفال آیت۲ ۔ سورۂ توبہ آیت ۱۲۴۔ مدثر۳۱، آل عمران ۱۷۱تا۱۷۳۔ احزاب ۲۲کی طرف رجوع کیجئے

دسویں درجہ والے تک کو بھی یہی چاہئے کہ ایسا نہ کہے اور جس کا ایمان تم سے کم ہے اسے ایمان سے جدا (بغیر ایمان کے) نہ سمجھو اگر ایسا ہوا تو جس کا ایمان تم سے بڑھ کر ہوگا اسے چاہئے کہ وہ تم کو ایمان سے جدا سمجھے۔

بلکہ اگر کسی کو اپنے سے کم دیکھو تو تمہیں چاہئے کہ اسے مہر و محبت کے ساتھ اپنے درجہ تک لے آؤ اور جو کچھ اس سے ممکن نہ ہو اسے اس پر بار نہ کرو کہ اس کی کمر ٹوٹ جائے گی اور حق کی قسم اگر کوئی کسی مومن کی دل شکنی کرے تو اس پر لازم ہے کہ اس کا جبران کرے اور اس کی دلجوئی کرے[1]۔

شیخ صدوقؒ کتاب خصال میں اس روایت کے تمام ہونے پر تحریر فرماتے ہیں کہ مقداد ایمان کے آٹھویں درجہ پر، ابوذر نویں درجہ پر اور سلمان دسویں درجہ پر فائز تھے۔ البتہ اس بات پر توجہ ہونی چاہئے کہ اس روایت میں ایمان کے دس درجہ کو معین کرنا صرف دس مرتبہ تک منحصر کردینے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف ایمان کے درجات کی کثرت کو بیان کرنا ہے۔ اسی وجہ سے دوسری روایتوں میں ایمان کے لئے کمتر یا بیشتر درجات بھی بیان کئے گئے ہیں[2]۔

۴۔ ایمان کے متعلقات اسلام کے اخلاقی نظام میں، ایمان کس چیز کے ذریعہ سے ہدایت، اخلاقی فضائل کی آراستگی اور معنوی رفتار کا سبب بنتا ہے؟ قرآن کریم اور معصومین ؑ کی سیرت میں ایمان کے اصلی ترین متعلقات کے بارے میں جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ایک۔ عالم غیب پر ایمان: قرآن کریم نے غیب اور غیبی طاقتوں یعنی ملائکہ (وغیرہ) پر ایمان کو کتاب الٰہی سے بہرہ مند ہونے اور ہدایت پانے کی شرطوں میں سے شمار کیا ہے۔

---

[1] کلینی: کافی، ج: ۲،ص۴۵، ح۲؛ صدوقؒ ، خصال، ص۴۴۷، ح۴۸۔
[2] رجوع کیجئے: صدوقؒ : خصال، ص۳۵۲، ح۳۱، کلینیؒ : کافی، ج۲، ص۴۲، ح۱، جن میں ایمان کے لئے سات درجہ بیان کئے گئے ہیں۔

اس سلسلہ میں ارشاد ہورہاہے ''یہ وہ کتاب ہے جس کی حقانیت میں کوئی شک نہیں اور یہ ان متقین اور پرہیزگاروں کے لئے ہدایت کا وسیلہ ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں[1].....

عالم غیب سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جنھیں ظاہری حواس کے ذریعہ درک نہیں کیا جاسکتا ہے،بلکہ عقلی سیر اور باطنی شہود کے ذریعہ ان تک رسائی ہوسکتی ہے، اصولی طور پر ایمان سے مشرف ہونے اور کفر والحاد ومادہ پرستی کی غلاظت و گندگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے غیب اور غیبی حقیقتوں، قوتوں اورامدادوں پر اعتقاد رکھنا ایک شرط ہے[2]۔

صرف اسی شرط کے تحت حصول کے ذریعہ کتاب ہدایت کو پڑھا جاسکتا ہے اور اس کے نور کے پرتو میں کامیابی کی منزلوں کو طے کیا جاسکتا ہے۔

دو۔ خدا اور اس کی وحدانیت پر ایمان: قرآن کریم متعدد آیتوں میں خدا وند متعال پر ایمان کی ضرورت کو یاد دلاتا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے: ''بس خدا اور اس کے پیغمبر اور اس نور پر جسے ہم نے نازل کیا ہے ایمان لاؤ اور تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے[3]۔

رسول خدا ؐنے ایمان کی علامتوں کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں فرمایا ' :ایمان کی نشانیاں چار ہیں: خدا کی وحدانیت کا اقرار، اس پر ایمان، اس کی کتاب پر ایمان اور خدا کے پیغمبروں پر ایمان[4]۔

تین۔ قیامت اور اس کی کیفیت پر ایمان: قیامت اور اس کی کیفیت پر ایمان اخلاق اسلامی کی افادیت اور اس کے اجرا ہونے کی ضمانت ہے۔ قرآن کریم نے خدا اور اس کی وحدانیت پر ایمان کے بعد سب سے زیادہ تاکید قیامت اور اس کی کیفیت پر کی ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت۲۔
[2] سورۂ بقرہ، آیت: ۱۷۷ ، ۲۸۵۔
[3] سورۂ تغابن، آیت: ۸۔ اسی طرح سورۂ اخلاص آیت: ۱، سورۂ بقرہ، آیات ۱۳۶ ، ۲۸۵۔ سورۂآل عمران، آیت: ۸۴۔ سورۂ مائدہ، آیات ۶۹، ۱۱۱۔ سورۂ نساء آیت: ۱۳۶، ۱۶۲۔ سورۂ انعام، آیت: ۹۲۔ سورۂ شوریٰ، آیت: ۱۵ کی طرف رجوع کیجئے۔
[4] ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، ص: ۱۹۔

جیسے قبر میں ہونے والے سوالات، عذاب قبر، قیامت کا دن اور قیامت کا حساب و کتاب، اعمال کو پرکھنے کے لئے میزان کا وجود، پل صراط سے عبور اور جنت و جہنم پر اعتقاد و ایمان۔

ذیل میں بعض آیتوں اور روایتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے '' :جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جو لوگ یہودی، صابی اور عیسائی ہیں ان میں جو خدا و قیامت پر واقعاً ایمان لائے ہیں اور نیک کام انجام دیتے ہیں ان کے لئے کچھ بھی ڈر اور خوف نہیں ہے[1]۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں '' :ایمان یہ ہے کہ انسان دین حق کو دل سے پہچانے اور زبان سے اقرار کرے اور اپنے اعضاء بدن سے اس کے فرائض کو انجام دے اور عذاب قبر، منکر و نکیر، موت کے بعد زندہ ہونے، حساب و کتاب، صراط اور میزان کو قبول کرے اور اگر خدا کے دشمنوں سے بیزاری نہ ہو تو ایمان موجود نہیں ہے[2]۔

دوسری حدیث میں پیغمبر خدا ۔کی فرمائش کے مطابق جنت و جہنم پر ایمان بھی معاد کے دو اہم رکن ہیں[3] اس بنا پر اخلاق اسلامی کی نظر میں معاد اور اس کے اساسی ارکان پر ایمان، رہنمائی کرنے والے دو اہم رکن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چار۔ انبیاء ٢٢٢ کی رسالت اور آسمانی کتابوں پر ایمان: دینی تعلیم سے بہرہ مند ہونے اور دین بالخصوص اخلاق اسلامی کی طرف متوجہ ہونے کے لئے انسان کا یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اپنے صحیح کمال اور سعادت کو پہچاننے اور ان تک پہنچنے کے لئے مناسب وسیلوں اور طریقوں کو انتخاب کرنے میں عاجز اور قاصر ہے، ایک بنیادی مسئلہ ہے قطعی طور پر جسے بھی اس حقیقت میں شک ہے وہ انبیاء کی رسالت اور ان کی دعوت کے مطالب پر ایمان و اطمینان حاصل نہیں کر سکتا اور اسی کے ساتھ اعتماد اور اطمینان کے بغیر کسی کی خیر خواہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت: ۶۹ اسی طرح سورۂ بقرہ، آیت: ۴، کی طرف رجوع کیجئے۔
[2] صدوق: خصال، ص: ۶۰۹ ، ح۹۔
[3] رجوع کیجئے: بیہقی: شعب الایمان، ج: ۱، ص: ۲۵۷، ح: ۲۷۸۔

اس وجہ سے اخلاق اسلامی میں رسولوں کی رسالت اور ان کی کتابوں پر ایمان رکھنے کے لئے بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ چونکہ سبھی انبیاء صرف ایک رسالت اور ایک ہی مقصد کے لئے کام کررہے تھے لہٰذا ان تمام انبیاء پر ایمان رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے: ''خدا کے پیغمبر اُن کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں اور تمام مومنین بھی خدا اور فرشتے اور کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اس کی طرف سے بھیجے گئے پیغمبروں میں سے کسی کے ساتھ فرق نہیں کریں گے۔ اور ان کا کہنا ہے کہ ہم نے پیغام الٰہی کو سنا اور اس کی اطاعت کی۔ اے پروردگار! ہم تیری بخشش کے محتاج ہیں اور ہم کو تیری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے[1]۔

پانچ۔ امامت اور ائمہ ؑ پر ایمان: شیعوں کے اصول عقائد کے مطابق امامت پر ایمان رکھنا اخلاق اسلامی کی بنیادوں اور کامیابی کی شرطوں میں سے ہے۔ اس سلسلہ میں شیعہ حدیثی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں۔

۲۔ ان روایتوں کے علاوہ یہ بات قرآن کے ذریعہ اور اس کی تفسیر کے سلسلہ میں مسلّم الثّبوت تاریخی واقعات سے ثابت ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہورہا ہے :الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِينًا[2]

آج کفار تمہارے دین سے نا امید ہوگئے ہیں لہٰذا ان سے خوف نہ کھاؤ اور مجھ سے خوف کھاؤ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کردیا ہے اور اسلام کو تمہارے لئے دین کی حیثیت سے پسند کرلیا ہے ۔

اس آیت کے سلسلہ میں دو سوال قابل غور ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ خاص دن کون سا دن ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ واقعہ جو اس دن رونما ہوا اور اکمال دین اور بندوں پر خدا کی نعمت کے تمام ہونے کا سبب بنا، کیا تھا؟ نا قابل انکار تاریخی شواہد اور تمام

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت: ۲۸۵، ۱۳۶۔ اور اسی طرح سورۂآل عمران، آیت: ۸۴ کی طرف رجوع کیجئے۔

[2] سورۂ، مائدہ، آیت: ۳۔

اسلامی فرقوں کے نزدیک وہ ۱۸، ذی الحجہ ۱۰ ہجری کا دن تھا اور وہ واقعہ اس دن غدیر میں پیش آیا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حضرت علی ـ کو اپنی جانشینی کے لئے انتخاب کرنا اور سلسلۂ امامت کا شروع ہونا تھا[1]۔

ہم انبیاء ۲۲۲ کی رسالت اور ان کی کتابوں پر ایمان کی ضرورت کو اصطلاح میں دین کے نام سے یاد کرتے ہیں اور مذکورہ آیت کی روشنی میں امامت کا سلسلہ دین کی تکمیل کے لئے ہے اور اس کے بغیر دین ناقص رہے گا لہٰذا قرآن کریم کی نظر میں امامت پر ایمان بھی ایک لازمی بات ہے اور اخلاق اسلامی کے مستحکم اور مضبوط پایوں میں شمار ہوتا ہے۔

۵ ـ ایمان کی شرط قرآن و راویات کے مطابق نیک عمل کا انجام دینا ایمان کی بہترین شرط ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ایمان کو نیک عمل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اکثر آیتوں میں ایمان کے بعد بلا فاصلہ پسندیدہ اور صالح عمل کی گفتگو ہوئی ہے۔

اگر چہ نیک عمل ایمان کے بنیادی عناصر میں سے نہیں ہے لیکن نیک عمل کے بغیر ایمان سے مطلوب اور مناسب فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا ـ اس بنا پر شائستہ اور نیک عمل کو ایمان سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے شرط کے طور پر مانا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے '' :اور جو کوئی ایمان لائے اور نیک عمل کو انجام دے اس کے لئے بہترین جزا ہے اور ہم بھی اس سے اپنے امور میں آسانی کے بارے میں کہیں گے[2]۔

قرآن مجید نے نیک عمل کے بغیر، مومن ہونے کے دعوے کو جھوٹا قرار دیا ہے'' :اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم خدا اور اس کے پیغمبر پر ایا ن لائے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور وہ لوگ واقعاً مومن نہیں ہیں[3]۔

---

[1] مزید معلومات کے لئے علامہ امینی کی کتاب '' الغدیر ، ، کی طرف رجوع کریں

[2] سورۂ کہف، آیت: ۸۸۔ اسی طرح سورۂ طٰہٰ، آیت: ۸۲۔ سورۂ فرقان، آیت: ۷۰۔ سورۂ قصص، آیت: ۶۷۔ سورۂ انفال، آیت:

[3] سورۂ نور، آیت: ۴۷۔

حضرت علی ۔نے بھی اس مطلب کو یوں بیان فرمایا ہے '' :جو خدا کے احکام پر عمل کرتا ہے فقط وہی مومن ہے ۔[1]

اس بنا پر اخلاق اسلامی کی نظر میں خدا کے احکام کی پابندی کے بغیر ایمان کا دعویٰ کرنا جھوٹ اور فریب ہے مگر یہ کہ مومن شخص عمل کرنے کی قدرت اور موقع نہ رکھتا ہو ۔

۶۔ ایمان کے اسباب دینی کتابوں میں ایمان کے وجود میں آنے، اور اس کے ثبات و کمال کے لئے مختلف عوامل بیان کئے گئے ہیں ۔ ان میں سے بعض معرفت وشناخت کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جیسے علم، عقل اور دین میں غور و فکر کرنا ۔

یہ سب ایمان کے نظری مقدمات کو فراہم کرتے ہیں اور وہ عوامل علم کلام میں پائے جاتے ہیں ۔ کچھ دوسرے عوامل ایسے ہیں جو ایک اعتبار سے نفسیانی صفت اور ملکہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جیسے تقویٰ، راہ خدا میں دوستی اور دشمنی، صبر، توکل، رضا وغیرہ اور کچھ ایسے ہیں جو انسان کے عمل سے مربوط ہیں ۔ جیسے انفاق، نماز کے لئے اہتمام کرنا، دوسروں کے ساتھ احسان کرنا، گناہوں سے پرہیز کرنا وغیرہ ۔

خاص نظری معارف جیسے دین میں غور وفکر، انسان کی مختلف نفسیانی صفتیں اور اعمال، ایمان کی آفرینش اور اس کے ثبات و کمال میں مؤثر ہو سکتے ہیں اور یہ بات اس حقیقت سے نہیں ٹکراتی ہے کہ ایمان اپنے لحاظ سے عمل صالح کی انجام دہی کے لئے مقدمہ فراہم کرتا ہے اور بہت سے نفسانی ملکات اور صفات کے وجود میں لانے کا موجب قرار پاتا ہے اور یہاں تک کہ انسان میں بعض نظری معارف کی پیدائش کے لئے باعث بنتا ہے ۔ کیونکہ انسانی وجود کے تینوں شعبوں کے درمیان آپس میں تأثیر اور تأثر پایا جاتا ہے ۔ اس بنا پر ایمان ایک واضح نفسانی حالت کی حیثیت سے دوسرے شعبوں پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور ان سے تأثیر بھی قبول کرتا ہے ۔

---

[1] کلینی، کافی، ج: ۲، ص: ۳۸ ،ح: ۴۔

۷۔ایمان کے فوائد یہ آثار اور فوائدایمان کے اسباب اور موجبات کی طرح علمی ماہیت بھی رکھتے ہیں۔ اور نفسانی حالات بھی اور بعض اعمال و عادات سے بھی متعلق ہیں۔ یہاں ان میں سے بعض اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

ایک۔ روحی تسکین: انسان کے لئے اہم لذتوں میں سے ایک نفسانی تسکین اور اس کا آرام پانا ہے۔ بنی آدم کے لئے پریشانی اور اضطراب، سب سے بڑی تکلیف اور بہت سی گمراہیوں اور ناکامیوں کا سبب ہے۔ انسانی کوششیں اس جانکاہ درد سے نجات پانے کے لئے اس بارے میں تلخ تجربہ کی نشاندہی کررہی ہیں۔

خداوند متعال کی نظر میں انسان کو ایمان کے سایہ میں آرام و سکون میسّر ہوگا۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے'' :وہی ہے جس نے مومنین کے قلوب کو سکون دیا تاکہ وہ اپنے ایمان میں مزید (ایمان کا) اضافہ کریں[۱]''باخبر رہو کہ خدا کے دوستوں کے لئے نہ کچھ خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور پرہیزگاری سے کام لیتے ہیں[۲]۔

خدا نے اس سے زیادہ واضح انداز میں قلبی سکون واطمینان کو اپنے ذکر اور یاد کے ذریعہ قابل تحصیل بتایا ہے اور اس سلسلہ میں وہ فرماتا ہے: '' وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور ان کے قلوب یاد خدا سے سکون حاصل کرتے ہیں آگاہ رہو کہ یاد خدا سے ہی دلوں کو آرام ملتا ہے[۳]۔

ب۔ بصیرت: قرآن کی نظر میں ایمان، حق وباطل کے درمیان تمیز دینے کے لئے انسان کو بصیرت اور سمجھداری عطا کرتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہورہا ہے '' :اے ایمان لانے والو!اگر خوف خدا رکھوگے تو خدا تم کو (حق وباطل کے درمیان) فرق کرنے کی قدرت وقوت عطا کرے گا[۴]۔

[۱] سورۂ فتح، آیت: ۴۔
[۲] سورۂ یونس، آیت: ۶۲ ،۶۳۔ اور اسی طرح سورۂ مائدہ، آیت: ۶۹ کی طرف رجوع کیجئے۔
[۳] سورۂ رعد، آیت: ۲۸۔
[۴] سورۂ انفال، آیت: ۲۹۔

دوسری طرف ایمان نہ رکھنے والوں کو نابینا قرار دیتا ہے " :جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کے کرداروں اور کارناموں کو ان کی نظر میں خوبصورت اور آراستہ بنا دیا ہے تا کہ وہ اسی طرح گمراہ و سرگرداں رہیں[۱]۔

ان دو آیتوں کا مقایسہ کرنے سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ایمان اور تقویٰ ایک طرف خود خواہی اور خود پسندی کو ختم کرنے کا سبب ہے تو دوسری طرف خدائی نور اور الٰہی ہدایت سے متصل ہونے کی وجہ سے بصیرت اور سمجھداری عطا کرتے ہیں[۲]۔

تین۔ خدا پر بھروسہ: خدا پر اعتماد اور بھروسہ کرنا کامیاب اور مفید زندگی کے ارکان میں سے ایک نادر اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اس حالت کے ذریعہ انسان کی بہت سی الجھنیں اپنا بستر لپیٹ لیتی ہیں۔ اور حوادث کے ہولناک طوفان پیچھے ہٹ جاتے ہیں حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: "بندہ کا ایمان اس وقت تک سچّا نہیں ہوسکتا جب تک کہ خدائی خزانہ پر خود اپنے ہاتھ کی دولت سے زیادہ اعتماد نہیں رکھتا ہے[۳]۔

چار۔ دنیوی برکتیں: قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے: "اور اگر شہروں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم قطعی طور پر ان کے لئے آسمان و زمین سے برکتیں نازل کرتے"[٤] یعنی ایمان نہ صرف اخروی مثبت آثار و فوائد کا حامل ہے بلکہ دنیاوی نعمتیں اور برکتیں بھی فراہم کرتا ہے۔ اگر کوئی صحیح طریقہ سے دنیاوی نعمتوں کی تلاش میں ہے تو اسے چاہئے کہ ایمان کی جستجو کرے۔ پانچ۔نیک اعمال کی انجام دہی: اس بات کے علاوہ کہ عمل صالح کی انجام دہی ایمان کی بنیادی شرط ہے، خود ایمان کے فوائد میں سے بھی ہے۔ کیونکہ ایمان، عمل کے لئے ظرف اور نیک عمل باطنی ایمان کا پھل اور نتیجہ ہے۔

علامہ طبا طبائیؒ فرماتے ہیں :ایمان عمل کے لئے مقدمہ فراہم کرتا ہے اور اس کے لئے لازمی شرط ہے اور عمل صالح کی سہولت یا دشواری انسان کے ایمان کے قوی یا ضعیف ہونے پر منحصر ہے اور اسی کے مقابلہ میں عمل صالح اور اس کی تکرار، ایمان کے

---

[۱] سورۂ نمل، آیت: ۴۔
[۲] علامہ طبا طبائی: المیزان، ج: ۱۵، ص: ۳۴۔ ناصر مکارم شیرازی: تفسیر نمونہ، ج: ۷، ص: ۴۰ کی طرف رجوع کریں۔
[۳] نہج البلاغہ، حکمت: ۳۱۰۔
[٤] وَ لَو اَنَّ اَهلَ القریٰ آمَنُوا وَالتَّقَوا لفَتَحنا عَلَیهِم بَرکات مِنَ السّماءِ وَ الاَرضِ(سورۂ اعراف، آیت: ۹۶)۔

عمیق اور زیادہ ہونے میں مفید اور مدد گار ثابت ہوتی ہے اور یہ دونوں اپنے اپنے لحاظ سے ان اخلاقی ملکات کے وجود میں آنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں جو بے شک انسان سے صادر ہونے والے اعمال صالحہ کے انجام پانے کا سبب ہیں۔

چھ۔ عوام میں محبوبیت:ایمان کا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ ایماندار انسان لوگوں کے دلوں میں محبوب ہوتا ہے۔ لوگوں کے درمیان قلبی لحاظ سے محبوب ہونا سبھی پسند کرتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ لوگ انھیں محبت بھری نگاہوں سے دیکھیں اور لوگ اپنے لئے محبت کے آثار کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔

اپنے لئے دوسروں کے اظہار محبت کی لذت کو اتنا زیادہ شیرین پاتے ہیں کہ کسی چیز کے مقابلہ میں اس کا سودا کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ بیشک محبت ایک ایسی دنیاوی نعمت ہے کہ یہ ہر مشکل کو آسان اور ہر تلخی کو شیرین اور ہر کانٹے کو پھول میں تبدیل کر دیتی ہے[۱]۔

خدا وند عالم فرماتا ہے: اگر خالص محبت کی تلاش میں ہو تو مومنین کی وادی میں داخل ہوجاؤ ''جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام انجام دیتے ہیں، جلد ہی (وہ) خدا (جو رحمن ہے) ان کے لئے لوگوں کے دلوں میں محبت قرار دے دے گا[۲]۔ (۲)

سات۔ اُخروی فلاح اور کامیابی :ایمان کے فوائد کی انتہا مومنین کی اُخروی کامیابی پر ہوتی ہے اس سے بہتر انجام اور کیا ہوسکتا ہے؟

---

[۱] علامہ طبا طبائی، فرازہا ئی از اسلام، ص۲۳۸۔

[۲] سورۂ مریم، آیت: ۹۶۔

خدا وند متعال مومنین سے ایک معنی دار سوال کرتے ہوئے فرماتا ہے" :اے ایمان لانے والو!کیا تمھیں ایک ایسی تجارت کی راہ دکھاؤں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دلائے گی؟ خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤاور خدا کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو۔

اس فداکاری کو اگر تم جان لوگے اور سمجھ لوگے تو تمھارے لئے بہتر ہوگا[1]حکیم لقمان اپنے فرزند کی خیرخواہانہ نصیحت میں فرماتے ہیں" :اے میرے بیٹے!سچ ہے کہ یہ دنیا گہرے سمندر کی طرح ہے جس میں بہت سے علماء اور دانشور ہلاک ہوگئے ہیں۔ بس اس میں اپنی نجات کی کشتی، خدا پر ایمان ہونے کو قرار دو[2]۔

۸۔ ایمان کے موانع ایمان کے وجود میں آنے کے اسباب اور عوامل کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا گیا اس کے پیش نظر ایمان پر تاثیر ڈالنے والے عوامل بہت ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا ایمان کے لئے رکاوٹ کا باعث ہوگا۔لیکن یہاں پر ایمان کے موانع سے مراد تنہا وہ عوامل ہیں جو ایمان کے ہادیانہ جوہر سے ٹکراتے ہیں اور مشہور اسلامی کتابوں میں عقلی قوت سے مربوط صفتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔اس طرح کی مشہور موانع مندرجہ ذیل ہیں:

ایک۔ جہل: جہل چاہے بسیط ہو یا مرکب، ایمان کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ جہل بسیط سے مراد یہ ہے کہ انسان علم نہ رکھتا ہواور اسے اپنے عالم نہ ہونے اور نہ جاننے کا یقین بھی ہواس طرح کی جہالت شروع میں مذموم اور قابل مذمت نہیں ہے۔کیونکہ یہ علم حاصل کرنے کے لئے مقدمہ ہے اور جب تک انسان خود کو جاہل نہ جانے اس وقت تک علم حاصل کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا لیکن اس جہالت پر باقی رہنا اخلاقی لحاظ سے برا اور قابل مذمت ہے[3]۔

---

[1] سورۂ صف، آیت: ۱۰ ، ۱۱۔
[2] شیخ صدوق: فقیہ، ج: ۲، ص: ۲۸۲، ح: ۲۴۵۷۔
[3] نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج: ۱، ص: ۱۰۰۔

لیکن جہل مرکب سے مراد یہ ہے کہ انسان عالم نہیں ہے اور اس کے ذہن میں واقعیت اور حقیقت سے متعلق کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا خیال یہ ہے کہ وہ واقعاً حقیقت تک پہنچ گیا ہے جبکہ سچ یہ ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا ہے (یعنی وہ اپنے جاہل ہونے سے بھی بے خبر ہے)۔

اس طرح وہ دو امر میں جاہل ہے۔ اسی وجہ سے اسے جہل مرکب کہا گیا ہے۔ اس طرح کی جہالت کو اخلاقی لحاظ سے سب سے بڑی برائیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں انسان اصلاً اپنی بیماری کے بارے میں نہیں جانتا بلکہ وہ خود کو صحیح وسالم تصور کرتا ہے حالانکہ اصلاح کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم فساد اور خرابی کا یقین ہونا ہے[1]۔

اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ ۔ نے فرمایا ہے: ''بے شک میں پیدائشی اندھے انسان اور سفید داغ کا علاج کرنے سے عاجز نہیں ہوں لیکن احمق انسان کا علاج کرنے سے عاجز ہوں[2]''۔

دو۔ شک وتردید: ابتدائی شک، علم ویقین تک پہنچنے کے لئے ایک مبارک قدم ہو سکتا ہے۔انسان جب تک کسی چیز کو پوری طرح جانتا ہے اور وہ کسی بھی گوشہ کو پنہان اور پوشیدہ نہیں سمجھتا اس کی کوئی خاص جستجو نہیں کرتا ہے بہت سی گرانقدر حقیقتیں صرف ایک ابتدائی شک وتردید کی وجہ سے منظر عام پر آئی ہیں۔

اس بنا پر شک، علم ویقین اور ایمان تک پہنچنے کے لئے ایک با اہمیت اور بے مثال پل کی حیثیت رکھتا ہے اس طرح یہ اخلاقی لحاظ سے برا نہیں ہے۔ لیکن شک وتردید، کسی بھی حالت میں منزل نہیں ہے شک ،مقصد اور منزل کے عنوان سے قطعی طور پر ایک اخلاقی برائی ہے اور یقین وایمان کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق اور باطل کی پہچان کرنے اور حق وباطل کو جدا کرنے کے لئے کمزور انسان کا نفس حیران وسرگرداں ہو جاتا ہے۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات ، ج: ۱، ص: ۱۱۶۔
[2] مفید: اختصاص،ص: ۲۲۱۔

اسی بنیاد پر حضرت علی ـ نے سختی کے ساتھ شک وتردید سے منع فرمایا ہے اور اسے ایمان کے خلاف اور کفر کا سبب قرار دیا ہے۔ مولائے متقیان حضرت علی ـ ارشاد فرماتے ہیں'' :لا ترتابوا فتشکّوا ،ولا تشکّوا فتکفروا''[1] (یعنی شک و تردید کو اپنے پاس جگہ نہ دو کہ شک میں پڑ جاؤ گے اور شک نہ کرو کہ کافر ہوجاؤ گے۔)

تین۔ نفسانی خیالات اور شیطانی وسوسہ: خیالات سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کے قلب پر عارض ہوتی ہے اور اگر وہ انسان کو شر کی طرف دعوت دے تو وسوسہ ہے اوراگر وہ خیر کی طرف ہدایت کرے تو اسے الہام کہا جاتا ہے۔ شیطانی وسوسہ جو ایمان کی رکاوٹوں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی مختلف قسمیں اور متعدد اسباب ہیں اور ہر ایک سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس سے متعلق گفتگو اخلاق علمی یا تربیت اخلاقی کے ذیل میں ہونی چاہئے[2]۔

قرآن کریم، شیطانی وسوسہ کے بارے میں خود شیطان کی زبانی ارشاد فرما رہا ہے '' :میں تیرے بندوں کو سیدھے راستے سے گمراہ کروں گا اس وقت ان کے سامنے سے پیچھے سے، داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے پہنچ جاؤں گا[3]''

چار۔ علمی وسواس: یہ دقت، جستجو، تحقیق اور عقلانیت میں افراط کی ایک قسم ہے جو ایمان کے لئے آفت اور اسے برباد کر دینے کا سبب ہے۔ یہ بات کبھی عقلی دقت کے عنوان سے اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ سب سے ابتدائی بدیہیات وواضحات میں بھی خدشہ وارد ہوجائے یہاں تک کہ انسان کو سفسطہ اور واقعیات وحقائق سے انکار کے گڑھے میں بھی گرا دیتا ہے۔ واضح ہے کہ اس طرح کا وسوسہ ہلاکت اور نابودی کو ہمراہ لاتا ہے اور ہر طرح کے ایما ن اور اطمینان سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے[4]۔

پانچ۔ کفر اور شرک: یہ دونوں ایمان وتوحید کے مقابلہ میں ہیں اور ایمان میں رکاوٹ کا باعث شمار کئے جاتے ہیں۔ کفر اور شرک کی

---

[1] کلینی: کافی،ج: ۱،ص: ۴۸، ح: ۶۔
[2] نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج: ۱، ص: ۱۴۲، ۱۵۸۔
[3] سورۂ 'اعراف' آیت: ۱۶،۱۷۔
[4] نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج: ۱، ص ۱۰۰ کی طرف رجوع کریں۔

ماہیت اور ان کے دوسرے ابعاد و جوانب کے متعلق بہت زیادہ بحثیں پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض کو عقائد و کلام کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، ان سبھی کے بارے میں گفتگو کرنا اس مختصر کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔

دوسری فصل

مؤثر نفسانی صفتیں

گزشتہ بحث میں ان نفسانی صفات کے بارے میں جو انسان کی ہدایت کی ذمہ دار ہیں نیز اخلاق اسلامی کے معروف مآخذ میں قوۂ عاقلہ سے متعلق قوت کے عنوان سے ان کا تذکرہ ہواہے، ہم نے اختصار سے گفتگو کی ہے۔ اس حصہ نیز بعد کے دو حصوں کی گفتگو میں صفات نفسانی کے دوسرے گروہ کے بارے میں جو انسانی نفس میں مؤثر قوت کے عنوان سے اپنا کردار ادا کرتی ہیں ہم ان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

اس طرح کے نفسانی صفات اخلاق اسلامی کے معتبر مآخذ اور مشہور کتابوں میں قوت غضبیہ اور قوت شہویہ سے متعلق صفات کے عنوان سے ذکر ہوتے ہیں۔ یہاں سب سے پہلے اس نکتہ کی تاکید کی جاتی ہے کہ نفسانی صفات ان موارد میں جن کو ہم شمار کریں گے منحصر نہیں ہیں۔

مؤثر نفسانی صفات کی طبقہ بندی: مؤثر نفسانی صفات کی بھی مختلف گروہوں میں طبقہ بندی کی جاسکتی ہے، ایک تقسیم بندی میں ان میں سے ہر ایک کے رجحان پر نظر کرتے ہوئے ان کو درج ذیل گروہوں میں جگہ دی جاسکتی ہے :

۱۔ وہ صفات جو خدا وند عالم اور مبدأ ہستی کی نسبت انسان کے باطنی رجحان پر ناظر ہیں جیسے توکل، تسلیم، اور رضا و.....۔

۲۔ وہ صفات جو معاد اور انسانی زندگی کے انجام کی نسبت اس کے باطنی رجحان کی طرف ناظر ہیں جیسے خوف، امید و رجاء، مایوسی اور ناامیدی......

۳۔ وہ صفات اور ملکات جو ہمارے رجحان کا تعلق خود ہماری ہی نسبت بتاتے ہیں ؛ جیسے عجب، خود پسندی، افتخار، عزت نفس، صیبت، تعصب وغیرہ ۔

۴۔ وہ صفات جو کل اور آئندہ کی نسبت ہمارے رجحان کو بتاتے ہیں؛ جیسے امیدیں، جلد بازی، ہمت، تسویف (ٹال مٹول) وغیرہ۔

۵ ۔ وہ صفات جو دنیوی مواہب پر ناظر ہوتے ہیں؛ جیسے زہد، حرص، حسرت اور قناعت وغیرہ.....

٦۔ وہ صفات جو دوسروں کی نسبت انسان کا رجحان کو بتاتے ہیں ؛ جیسے خیر خواہی، حسد کرنا، کینہ، انصاف وغیرہ.....

۷۔وہ صفات جو نفس کی طبیعی اور متعادل آرایش کو بیان کرنے والے اور اس کے تحفظ میں کردارادا کرتے ہیں جیسے سکون، وقار، عفت، حیا وغیرہ وغیرہ ۔

اخلاق اسلامی میں ان گروہوں میں سے ہر ایک کی حیثیت سے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے مبدأ و معاد سے متعلق رجحان کا سرچشمہ اس کا ایمان ہے اور تمام نفسانی رجحانات خود اس کی نسبت، دوسروں کی نسبت، طبیعی مواہب کی نسبت، آئندہ کی نسبت اور نفس کی مطلوب حالت کی نسبت، عالم کے آغاز و انجام کی نسبت نفس کے رجحان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہدایت کرنے والے نفسانی صفات اور اثر کرنے والے نفسانی صفات کا خاکہ.

الف۔ خدا کی طرف نفس کا مائل ہونا بعض وہ نفسانی صفات جو خداوند متعال سے متعلق انسان کے باطنی رجحان اور مطلوب رابطہ کا کام کرتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ خداوندعالم کی محبت بغیر کسی شک و تردید انسان کی قوت جاذبہ (جذب کرنے والی قوت) اور دافعہ (دفع کرنے والی قوت) محبتوں اور نفرتوں کے زیر اثر وجود میںآتے ہیں۔ جب انسان محبت و عشق کرتا ہے، تو لذت اور نیک بختی کا احساس کرتا

ہے اور جب کراہت و نفرت کے عالم میں ہوتا ہے تو پریشانی، رنج و الم، درد و غم، کا احساس کرتا ہے۔ شاید اسی بنا پر اخلاق کے بعض بڑے حکماء اور فلاسفر نے انسان کی غایت اور اخلاق کا مقصد سعادت و خوش بختی یعنی لذت بخش حیات اور رنج والم سے دور زندگی کو جانا ہے۔

اس ہدف کی تکمیل صرف اور صرف محبت آمیز زندگی کے سایہ میں بالخصوص اس کے عالی مرحلہ یعنی عاشقانہ زندگی میں میسر اور ممکن تصور کرتے ہیں، ان تمام فضیلتوں کا راز ''محبت'' اور ''عشق'' کے الفاظ کے لئے اسی حقیقت میں تلاش کرنا چاہیے لیکن جو چیز اصل عشق و محبت سے بھی زیادہ اہم ہے محبوب اور معشوق کی شان و منزلت ہے۔

انسان کی سعادت کا معیار اس کے درجہ محبت سے وابستہ ہے اور محبت و عشق کے درجہ کو محبوب کے کمال و جمال کے اندازوں میں تلاش کرنا چاہیے نیز اس کے دوام وبقا کو بھی جمالِ محبوب کا ظہور اور غروب معین کرتا ہے۔ اب اصلی سوال یہ ہے کہ سر و جان کا سودا کس حقیقت جمال و جلال کے عشق میں کرنا چاہیے تاکہ ابدی محبت اور بلند وبالا عشق مثمر ثمر ہو اور پایدار لذت اور دائمی نیک بختی حاصل ہو؟

خدا پر اعتماد رکھنے والوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس سوال کا جواب خود اپنے خدا سے طلب کریں۔ اخلاق اسلامی کے نقطۂ نظر سے وہ وجود جو ایسی محبت کا حقدار ہے خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس کی محبت تخلیق عالم کی توجیہ کرنے والی اور عالم و بنی آدم کے اہداف و مقاصد کو پورا کرنے والی نیز ان کی آرزؤں کی تکمیل کرنے والی ہے، اسی وجہ سے خداوند عالم فرماتا ہے: ''والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ[1] ''جو لوگ ایمان لاچکے ہیں وہ خدا سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں'' اور یہ اعلان کرتا ہے ''یحبھم و یحبونہ[2]'' ''خدا انہیں دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ (بھی) خدا کو دوست رکھتے ہیں''۔

---

[1] سورۂ بقرہ ,۱۶۵۔
[2] سورۂ مائدہ آیت ۵۴

۔ دوسری طرف، خدا کی محبت ایک ایسی جزا ہے کہ خدا وند عالم قرآن میں اپنے خاص بندوں کو جس کی بشارت دیتا ہے، جیسے مجاہدین جو اس کے لئے اپنے سرا ورجان کو فدا کردیتے ہیں ''ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص[1] ۔ ''بے شک اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف باندھ کر جہاد کرتے ہیں جس طرح سیسہ پلائی ہوئی دیواریں''۔ اور جس طرح محسنین، توابین، مطھرین، مقسطین، صابرین اور متوکلین (احسان کرنے والے، توبہ کرنے والے، پاکیزہ افراد، عدل وانصاف کے خوگر، خدا پر توکل و بھروسہ کرنے والے) قرآن کریم میں خدا کے محبوب قرار دئیے گئے ہیں یہاں پر ہماری گفتگو کا موضوع انسان کا خدا وند سبحان سے محبت کرنا ہے، لیکن چونکہ در حقیقت بندوں کی اپنے پروردگار سے محبت اور خدا کی ان سے، محبت کے درمیان ایک قسم کا ملازمہ پایا جاتا ہے لہٰذا ناگزیر دونوں ہی نظرسے موضوع کو دیکھنا چاہئے۔

پہلی نظر: بندوں کی خدا سے محبت الف۔ صرف خدا حقیقی محبوب ہے: در حقیقت صرف خدا ہے جو حقیقی محبت اور واقعی عشق کرنے کا سزاوار ہے دیگر اشیاء اور اشخاص اپنے اس رابطہ کے اعتبار سے جو اس سے رکھتے ہیں محبوب واقع ہوتے ہیں۔

محبت کی پیدائش کے اسباب: علماء اخلاق کا نظریہ ہے کہ محبت اور اس کے شدید مراتب یعنی عشق درج ذیل اسباب ووجوہ کی بنا پر وجود میںآتے ہیں :

ا۔ جو چیزیں انسان کی بقاء اور کمال کا سبب ہوتی ہیں: اسی بنیاد پر، انسان اپنے وجود کو عزیز اور دوست رکھتا ہے اور اس کی بقاء اور دوام کا خواہاں ہوتا ہے اور جو چیز بھی اسے اس بات میں معاون و مدد گار ثابت ہوتی ہے وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے، اور وہ موت کے اسباب سے کراہت رکھتا ہے[2]۔

---

[1] سورۂ صف آیت۴۔
[2] فیض کاشانی، محسن ؛المحجۃ البیضاء، ج۸، ص۹تا ۱۱۔ نراقی، محمدمہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۱۳۴، ۱۳۵۔

۲۔ لذت: لذت مادی ہو یا معنوی محبت کا سبب ہوتی ہے یعنی انسان جو کچھ لذت کا سبب ہوتا ہے اس کے لذت آور ہونے کی وجہ سے اسے دوست رکھتا ہے نہ کہ خود اس لذت مادی کی وجہ سے ؛ جیسے انسان کی لذت کھانے پینے کی اشیاء سے متعلق نیز وہ تمام چیزیں جو اس کے تمام غرائز وخواہشات پورا کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔

اس طرح کی محبت آسانی کے ساتھ ہاتھ آجاتی ہے لیکن تیزی سے ختم بھی ہوجاتی ہے اس طرح کی محبتیں پست مادی اور سریع الزوال ہونے کی وجہ سے محبت کا سب سے ادنی درجہ شمار ہوتی ہیں[1] اور معنوی لذت ؛ جیسے انسان کا ایک فدا کار مجاہد سے محبت کرنا، اس لذت کی بناء پر جو اس کی دلاوری اور اس کے مظاہرہ جنگ سے محسوس کرتا ہے اور ایک فنکار اور ورزش کرنے والے انسان سے محبت اس لذّت کی وجہ سے جو ہنر نمائی کے میدان میں محسوس کرتا ہے اور امانت و پاکدامنی سے محبت اس لذّت کی وجہ سے جو انسان امانت داری اور پاکیزگی سے محسوس کرتا ہے نیز خداوندعالم کی یاد اوراس سے راز و نیاز اس بناپر کہ وہ اس بات سے سرشار لذت محسوس کرتا ہے۔

اس طرح کی لذتوں کی ان لوگوں کے لئے محبت آفرینی جو اس کے ایک گھونٹ سے سیراب ہوئے ہیں ایک واضح اور استدلال و برہان سے بے نیاز امر ہے، اس طرح کی لذتیں دراز عمر ہوتی ہیں، اگر چہ اس اعتبار سے خود مختلف درجات اور مراتب کی حامل ہیں، لیکن باقی اور دائم محبت کے خواہاں افراد اس کے پانے کی تمنا میں مادی لذتوں اور فانی محبتوں کا یکسر سودا کرتے ہیں۔

۳۔ احسان: انسان احسان اور نیکی کا اسیر اور بندہ ہے اور فطری طور سے جو بھی اس کے ساتھ احسان کرتا ہے وہ اسے دوست رکھتا ہے اور جو انسان اس کے ساتھ برائی کرتا ہے وہ اس سے رنجیدہ خاطر اور بیزار ہوتا ہے اس بناء پر نیکی، منفعت اور احسان انسان سے محبت کرنے کا سبب بنتے ہیں[2]۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۱۳۶۔
[2] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۱۳۶۔

۴۔ ظاہری و باطنی حسن و جمال: خوبصورتی اور حسن و جمال کا ادراک محبت کا باعث ہوتا ہے ؛ یعنی انسان خواہ مادی خوبصورتی ہو یا معنوی اسے دوست رکھتا ہے اور اس کی یہ محبت خوبصورتی اور حسن کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، نہ یہ کہ اس کے علائم اور لوازم سے اور وہ فطری اور باطنی سرچشمہ رکھتی ہے۔

۵۔ باطنی اور روحی توافق و مناسب: کبھی انسان دوسروں سے محبت کرتا ہے، لیکن نہ اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور نہ ہی اس کے مال و مرتبہ سے امید اور لالچ رکھنے کے سبب بلکہ صرف اور صرف اس باطنی اور روحی تناسب اور توافق کے لحاظ سے جو اس کی روح و جان کے ساتھ رکھتا ہے۔

۶۔ الفت و اجتماع: افراد کا اجتماع اور آپس میں معاشرت رکھنا اور ایک ساتھ زندگی گذارنا آپسی میل جول، اتحاد و الفت اور انس و محبت کا باعث بنتا ہے۔ انس و محبت کا سرچشمہ انسان کی طبیعت اور سرشت میں ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لفظ ''انسان'' اُنس سے ماخوذ ہے نہ کلمۂ ''نسیان'' سے[1]۔

۷۔ ظاہری اوصاف میں شباہت: ایک یا چند ظاہری خصوصیات میں اشتراک محبت کے پیدا ہونے کا باعث ہوتا ہے۔ بچوں کا ایک دوسروں سے لگاؤ اور بوڑھوں کا آپس میں تعلق نیز ہم پیشہ اور ہم صنعت افراد کا ایک دوسرے سے محبت رکھنا اسی وجہ سے ہے۔

۸۔ علیت کا رابطہ: چونکہ معلول کا سرچشمہ علت ہے اور اس سے تناسب اور سنخیت اور جنسیت رکھتا ہے، لہٰذا علت محبوب واقع ہوتی ہے کیونکہ علت کے بعض اجزاء اور اس کے بعض ٹکڑوں کے مانند ہے، معلول بھی علت کو اس لئے دوست رکھتا ہے کہ

---

[1] راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ قرآن، ص۹۴ ملاحظہ ہو۔

درحقیقت علت اس کی اصل و اساس ہے، اس بنا پر ان میں سبھی ایک دوسرے سے محبت کرنے میں درواقع اپنے آپ سے عشق کرتے ہیں[1].

اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ محبت ایجاد کرنے کے تمام اسباب وعلل مذکورہ موارد میں خلاصہ ہو سکتے ہیں یا نہیں، اور مذکورہ اسباب میں سے ہرایک کے استقلال یا تداخل سے چشم پوشی کرتے ہوئے حقیقی طور پر محبت آفرین تمام اسباب و علل صرف خدا وند سبحان میں پائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ میں ان کا تصور کرنا ایک وہم اور خیال سے زیادہ نہیں ہے، اس حقیقت کے بیان میں کہا جاسکتاہے: ہرانسان کاوجود خداوند سبحان کے وجود کی فرع وشاخ ہے اور خداوندعالم کے وجود سے جدا کوئی ہستی اور وجود نہیں رکھتا، اور اس کے وجود کا کمال اس کے ذریعہ اور اس کی طرف سے ہے نیز لذت و احسان کا سرچشمہ خداوندعالم ہی کی ذات ہے، احسان کا خالق وہ ہے اور ہر احسان اس کے قدرت اور فعل کی خوبیوں میں سے ایک خوبی و حسن کا بیان کرنے و الا ہے۔

بے شک کمال وجمال بالذات کامالک صرف اور صرف وہ ہے اور یہ صرف اسی میں پایا جاتاہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل بصیرت کے لئے معنوی جمال زیادہ دوست رکھنے کے لائق اور خوبصورت ترین شئی ہے۔ اسی طرح انسان کی روح وجان اپنے پروردگار سے ایک مخفی اور باطنی راز و رمز کے ساتھ رابطہ رکھتی ہے، اور شاید آیۂ ''قل الروح من امر ربی[2]

(، روح ہمارے رب کے امر سے ہے '') اسی باطنی رابطہ کی طرف اشارہ ہو۔ خدا اور انسان کے درمیان رابطۂ علیت کا وجود آشکار اور توضیح سے بے نیاز ہے۔ لیکن دو دیگر اسباب یعنی ''مادی اجتماع '' اور ''ظاہری اوصاف میں اشتراک ''، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں اسباب محبت آفرینی میں معمولی کردار ادا کرتے ہیں اور دوسرے ۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات،، ج۳، ص۱۳۹۔
[2] سورۂ اسراء، آیت ۸۵۔

یہ کہ ان کا خدا وند سبحان کی طرف نسبت دینا نقص کا باعث ہے، اور در حقیقت محال ہے لہٰذا حقیقی طور پر اور عالی ترین درجات میں محبت کے تمام اسباب خدا وند عالم میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ اس کے اوصاف میں کوئی شریک نہیں ہے لہٰذا کسی قسم کا شریک اس کی محبت میں بھی وجود نہیں رکھتا[1]۔

ب۔ خدا وند عالم سے محبت کی نشانیاں: بلند و بالا، مقدس و پاکیزہ فضائل ہمیشہ جھوٹے دعویداروں سے روبرو رہے ہیں، یہ غیر واقعی خیالات اور دعوے کبھی کبھی اس طرح پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ حقیقت امر خود اشخاص پر بھی پوشیدہ ہوگئی، بہت سے طفل صفت ایسے ہیں جنھوں نے ابھی محبت خداوندی کا الفباء بھی نہیں سیکھا ہے، لیکن خود کو اللہ کے دوستوں میں شمار کرتے اور اس سے عشق و محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

خدا وند عالم کے دوستوں کی ظاہری اور ملموس نشانیوں کا بیان خود شناسی اور دیگر شناسی کے لئے ایک مناسب راستہ اور خدا کی محبت ودوستی کے جھوٹے اور سچے دعوؤں کا ایک معیار ہے۔ ان علامتوں میں اہم ترین علامتیں اخلاق اسلامی کی اوّلین کتابوں کی روایت کے اعتبار سے درج ذیل ہیں :

ا۔ موت کو دوست رکھنا: سچا چاہنے والا اور حقیقی دوست اپنے محبوب کے دیدار کا مشتاق ہوتا ہے۔ اگر چہ موت خداوندعالم سے ملاقات کرنے اور اس کے جمال کے دیدار کی تنہا راہ نہیں ہے، لیکن عام طور پر اس ہدف کا تحقق اس راہ مرگ سے گذرے بغیر ممکن و میسر نہیں ہے اگر کوئی انسان کسی مقصد سے عشق کرے، تو جو کچھ اس راہ میں راہنما واقع ہوگا وہ اس کا محبوب بنتا چلاجائے گا، قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے: ''کہو: اے وہ لوگوں جو یہودی ہوگئے ہو اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم لوگ خدا کے دوست ہو

---

[1] فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج۸ ص ۱۶، ؛نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ص ۱۴۲، اور ۱۴۶ ملاحظہ ہو۔

اور دوسرے لوگ دوست نہیں ہیں تو اگر اپنے قول میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو [۱] البتہ جیسا کہ خدا وند سبحان کی محبت کے درجات ومراتب ہیں، موت کا چاہنا یا نہ چاہنا بھی افراد کی نظر میں درجات و مراتب رکھتا ہے۔

موت کو ناپسند کرنا خدا وند عالم کی محبت سے اس وقت سازگار نہیں ہے جب اس محبت کا سرچشمہ دنیاوی مظاہر جیسے اموال، اولاد، خاندان اور مقام و منصب ہو، لیکن جب دنیا میں باقی رہنے کا تعلق و لگاؤ پروردگار عالم سے ملاقات کے لئے آمادگی کا حصول اور نیک اعمال انجام دینا ہو تو خدا وند عالم کی دوستی سے منافات نہیں رکھتا [۲]۔

۲۔ خداوندعالم کی خواہش کو مقدم کرنا: خداوندعالم کا حقیقی دوست اس کے ارادہ کواپنے ارادہ پر مقدم رکھتا ہے حتی کہ اگر محبوب فراق اور جدائی کاارادہ کرے تووہ اسے وصال پر ترجیح دے۔ اللہ کی محبت اس کے دستور اور قوانین کی پیروی کی طالب ہے اور محبوب کی رضایت کاحاصل کرنااس کے لوازمات میں سے ہے۔

''کہو: اگر خداکو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو تاکہ خدا تمہیں دوست رکھے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے خدا وند بخشنے والا مہربان ہے''۔

۳۔ یاد خدا وندی سے غافل نہ ہونا: محبوب کا ذکر،اس کی یاد اور جوکچھ اس سے مربوط و متعلق ہے اس کا تذکرہ ہمیشہ محب کے لئے لذت بخش اور دوست رکھنے کے قابل ہے، خدا کے دوست ہمیشہ اس کی اور اس کے دوستوں کی بات کرتے ہیں اور اس کی یاد کے ساتھ زندگی گذارتے ہیں اور اس کے کلام کی تلاوت سے لذت حاصل کرتے ہیں اور خلوت میں اس سے مناجات اور راز و نیاز کرکے انس حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ خدا نے موسیٰ ۔ سے فرمایا: ''اے عمران کے فرزند! جھوٹ بولتا ہے وہ انسان جو خیال کرتا

---

[۱] سورۂ جمعہ، آیت ۶۔
[۲] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳ ، ص ۱۷۴ ،۱۷۵۔

ہے کہ وہ مجھے دوست رکھتا ہے لیکن جب رات ہوتی ہے تو میری عبادت سے چشم پوشی کرتا ہے کیا ایسا نہیں ہے کہ ہر عاشق و دلدادہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ وہ اپنے دلدار و عاشق سے خلوت کرے [1]؟

۴۔خوشی و غم خدا کے لئے: خدا کے چاہنے والے محزون و مغموم نہیں ہوتے مگر اس چیز کے لئے جو انھیں محبوب سے دور کردے اور خوشحال و مسرور نہیں ہوتے جز اس چیز سے جو انھیں ان کی مراد اور مقصد سے نزدیک کردے۔ وہ لوگ اطاعت سے شاد و مسرور اور معصیت سے محزون و غمزدہ ہوتے ہیں اور دنیا کا ہونا اور نہ ہونا ان کے لئے خوشی اور غم کا باعث نہیں ہوتا '' جوکچھ تمہارے ہاتھ سے ضائع ہو گیاہے اس پر رنجیدہ خاطر نہ ہو اور جو تمہیں دیا گیا ہے اس کی (وجہ) سے شاد و مسرور نہ ہو[2]

۵۔خدا کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے دشمنی: ''محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم ''محمد '' خدا کے پیغمبر ہیں اور وہ لوگ کہ جو ان کے ساتھ ہیں کافروں کے ساتھ سخت اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مہربان ہیں [3]۔

۶۔ محبت و امید کے ساتھ خوف: خدا کے دوست اس کے جمال کے شیفتہ ہونے کے باوجود اس کی عظمت کے ادراک کے نتیجہ میں خوفزدہ اور ہراساں رہتے ہیں کیونکہ جس طرح اللہ کے جمال کا ادراک محبت کا پیش خیمہ ہے اسی طرح اس کی عظمت کا ادراک بھی ہیبت اور ہراس کا سبب ہوتا ہے، یہ خوف و رجاء پروردگار کی بندگی میں مکمل تکمیل کا کردار ادا کرتے ہیں راہ الٰہی کے بعض راہرؤوں نے کہا ہے: ''خدا کی بندگی صرف محبت کے ساتھ اور بغیر خوف کے،امید کی زیادتی اور حد درجہ انبساط و سرور کی وجہ سے آدمی کی ہلاکت کا باعث ہوجاتی ہے۔

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۳۱۔
[2] شیخ صدوق، امالی، ص ۳۳۸، ح ۵۷۷۔ دیلمی، حسن ابی الحسن: اعلام الدین، ص۲۶۳۔ ارشاد القلوب، ص۹۳۔
[3] سورۂ فتح، آیت ۲۹۔

نیز عبودیت صرف خوف وہراس کے ساتھ بغیر امید کے وحشت کی وجہ سے پروردگار سے دوری اور ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے، خدا وند ذوا لجلال کی بندگی خوف و محبت دونوں کے ساتھ اس کی محبت اور تقرب کا سبب ہوتی ہے[1]۔

۷۔اللہ کی محبت کا کتمان اور اس کا دعویٰ نہ کرنا: محبت محبوب کے اسرار میں سے ایک سر ہے اور بسا اوقات اس کے اظہار میں کوئی ایسی چیز کہی جاتی ہے جو واقع کے برخلاف اور محبوب پر افترا پردازی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ انسان کی محبت پروردگار کے خاص دوستوں یعنی عظیم ملائکہ اور ان انبیاء و اولیاء کی محبت واشتیاق کے مراتب کی نسبت قابل ذکر تحفہ نہیں ہے جو خود کو خدا کے شائستہ عشق و محبت میں ناکام تصور کرتے تھے،بلکہ حقیقی محبت کی علامت یہ ہے کہ اپنی محبت کے درجات کو ہیچ خیال کرے اور اسے قابل ذکر نہ سمجھے اور خود کو ہمیشہ اس سلسلہ میں قاصر اور عاجز خیال کرے۔

ج۔ خداوند عالم کی محبت کے علائم: خداوند عالم کی محبت کے علائم کثرت اور فراوانی کے ساتھ انسان کے مختلف وجودی پہلوؤں میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر ان علائم کی طرف جو کہ نفسانی صفت کے عنوان سے ذکر کئے گئے ہیں، اشارہ کیا جاتا ہے :

ا۔ پروردگار سے انس: جب انسان کا دل اللہ کے قرب اور محبوب کے جمال مکشوف کے مشاہدہ سے شاد ومسرور ہوتا ہے تو انسان کے قلب میں ایک بشارت داخل ہوتی ہے کہ جسے ''انس'' کہا جاتا ہے۔ خداوندعالم سے انس کی علامت یہ ہے کہ گوشہ نشینی، خلوت اور اس کے ذکر میں مشغول ہونا خلائق سے انس اور ہم نشینی کرنے سے کہیں زیادہ بہتر اور خوشگوار ہے ایسا شخص لوگوں کے درمیان ہونے کے باوجود بھی در حقیقت تنہا ہے۔

اور جس وقت وہ خلوت میں ہوتا ہے، حقیقت میں وہ اپنے محبوب کے ساتھ ہمنشین ہوتا ہے۔ اس کا جسم تو لوگوں کے درمیان ہوتا ہے لیکن اس کا دل ان سے الگ اور جدا ہوتا ہے[1]۔

---

[1] ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج ۸، ص ۷۶ ، ۷۷۔

۲۔ حضرت امیر المومنین علی ۔ نے ایسے صفات کے حامل افراد کے متعلق فرمایا ہے: ''انھیں علم نے بصیرت کی حقیقت تک پہنچا دیا ہے اور یہ یقین کی روح کے ساتھ گھل مل گئے ہیں، انھوں نے ان چیزوں کو آسان بنالیا ہے جنھیں راحت پسندوں نے مشکل بنا رکھا تھا اور ان چیزوں سے انھیں حاصل کیا ہے جن سے جاہل وحشت زدہ تھے اور اس دنیا میں ان اجسام کے ساتھ رہے ہیں جن کی روحیں ملأ اعلیٰ سے وابستہ ہیں، یہی روئے زمین پر اللہ کے خلیفہ اور اس کے دین کے داعی ہیں[۲]۔

۲۔ خداوند عالم کی جانب اشتیاق: جمال الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے خواہاں افراد جب وہ غیب کے پردوں کے پیچھے محبوب کے رخسار کا نظارہ کرنے بیٹھے ہوں اور اس حقیقت تک پہونچ چکے ہیں کہ اس کے جلال و عظمت کی حقیقی رویت سے قاصر و عاجز ہیں تو جو کچھ انہوں نے نہیں دیکھا ہے اس کے مشاہدہ کے لئے ان کی تشنگی اور شوق بڑھتا جاتا ہے، اس حالت کو ''مقام شوق'' کہا جاتا ہے بر خلاف مقام انس، جو محبوب کے کھلے چہرے کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے، مقام اشتیاق، محبوب کے محجوب (درپردہ) جمال و جلال کے ادراک کے شوق کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے[۳]۔

۳۔ قضائے الٰہی سے راضی ہونا: ''رضا'' ''سخط'' یعنی ناراضگی کے مقابلہ میں ہے اور ''رضا'' سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے مقدر فرمایا ہے اس پر ظاہر و باطن، رفتار وگفتار میں اعتراض نہ کرنا ۔ رضااللہ کی محبت کے علائم و لوازم میں شمار ہوتی۔

کیونکہ محب جو کچھ محبوب سے صادر ہوتا ہے اسے خوبصورت اور بہتر سمجھتا ہے جو انسان مقام رضا کا مالک ہوجاتا ہے اس کے نزدیک فقر و غنا، آرام و تکلیف، تندرستی اور بیماری، موت اور زندگی وغیرہ وغیرہ یکساں ہوتی ہے اوران میں سے کسی ایک کا تحمل بھی دشوار نہیں ہوتا ہے، کیونکہ سب ہی کو محبوب کی طرف سے خیا ل کر تا ہے وہ ہمیشہ خود کو فرحت و سرور، آرام وآسائش میں محسوس کرتے ہوئے زندگی گذارتا ہے کیونکہ تمام چیزوں کو نگاہ رضایت سے دیکھتا ہے اور در حقیقت تمام امور اس کی مراد کے مطابق

---

[۱] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۱۲۴، ۱۸۹، ۱۹۰۔

[۲] ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج ۸، ص ۵۵۔

[۳] مجادلہ ، ۲۲ ؛ بینہ ، ۸، ملاحظہ ہو۔

واقع ہوتے ہیں، نتیجہ کے طور پر ہر قسم کے غم و اندوہ سے دور ہوگا، قرآن کریم میں کئی جگہ اس مرتبہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، منجملہ ان کے ''حزب اللہ'' کی شناخت کراتے ہوئے فرماتا ہے: ''خدا وند رحمان ان سے راضی و خوشنود اور وہ اس سے راضی و خوشنود ہیں، یہ لوگ خدا کے گروہ ہیں، حزب خدا ہی کامیاب ہے''۔

حضرت امام زین العابدین ۔ مقام رضا کی عظیم شان و منزلت کے بیان میں فرماتے ہیں: ''زہد کا سب سے بلند درجہ ورع کا پست ترین درجہ ہے اور فدع کا بلند ترین درجہ یقین کا پست ترین درجہ ہے اوریقین کا بلند ترین درجہ رضا کا سب سے پست مقام و درجہ ہے[۱]۔

اس وجہ سے خدا کے دوست جو کچھ وہ مقدر فرماتا ہے اس پر رضامندی کے ساتھ ہر قسم کے غم و اندوہ سے دور ہوتے ہیں اور نہایت سرور شادمانی کے ساتھ خوشگوار زندگی گذارتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے: ''آگاہ ہوکہ خدا کے دوستوں کو نہ کوئی غم و اندوہ ہے اور نہ ہی کوئی خوف و ہراس انہوں نے اپنے تمام امور خدا کے حوالے کردئیے ہیں اور اس کے ارادہ کے سامنے سراپا تسلیم ہیں[۲]۔

د ۔ محبت پروردگار کا انجام: محبت الٰہی کا خاتمہ دیگر ساری محبتوں کی طرح محبوب کے وصال پر منحصر نہیں ہے۔ اس رویت کا تحقق خداوندعالم کی معرفت پر موقوف ہے، جو خود ہی تطہیر باطن اور دنیوی لگاؤ سے دل کو پاک وصاف رکھنے کا محتاج ہے، محبت الٰہی کی راہ میں سیر وسلوک کرنے والوں کے لئے دنیا میں اس کا حصول ہوتا ہے۔

اس ملاقات کی حقیقت کا سمجھنا ہمیشہ انسانی اذہان کے لئے دشوار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے راہ انکار اختیار کرلی ہے۔

---

[۱] اصول کافی، کلینی، ج۲، ص۱۲۸، ح۴۔
[۲] یونس ، ۶۲

حضرت علی ـ سے خوارج میں سے ایک شخص نے سوال کیا: ''کیا آپ نے اپنے رب کو اس کی عبادت کرتے وقت دیکھا ہے؟''آپ نے صراحت کے ساتھ فرمایا: ''تم پر وائے ہو! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنھوں نے پروردگار کو نہ دیکھا ہو اور اس کی عبادت وپرستش کرتے ہوں'' اس وقت سوال کرنے والے نے اس ملاقات کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں سوال کیا: کس طرح آپ نے اسے دیکھا ہے؟ آپ نے جواب دیا! ''تم پر وائے ہو! نگاہیں دیکھنے کے وقت اس کا ادراک نہ کرسکیں لیکن قلوب حقایق ایمان کے ساتھ اسے دیکھتے ہیں[1]۔

دوسری نظر: خدا وند سبحان کی بندوں سے محبت قرآن و روایات اہل بیت ۲۲۲ ان آیات وروایات کے حامل ہیں جو پروردگار کی اپنے بعض بندوں سے خاص محبت ودوستی کی عکاسی کرتی ہیں، اس محبت کے خاص علائم ہیں جو صرف اور صرف خاص بندوں کو شامل ہوتے ہیں

البتہ خداوند سبحان کی عام رحمت و محبت، دنیوی مواہب و احکام شرعی کے قالب میں سب کو شامل ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوچکا ہے کہ خدا وندعالم قرآن میں اپنی دوستی کو مجاہدین، نیکو کار افراد، زیادہ توبہ کرنے والوں، پرہیزگاروں، عدالت پیشہ افراد، صابروں، پاک وپاکیزہ افراد اور پروردگار پر اعتماد و بھروسہ کرنے والوں کی نسبت اعلان کرتا ہے[2]۔

جمال الٰہی کا دیداراور اس کا مشاہدہ اتنا لذت بخش اور سرور آور ہے جو ناقابل توصیف وتشریح ہے جن لوگوں نے اس کے ادنیٰ مراتب کو بھی چکھا ہے وہ کبھی دیگر خیالی لذتوں سے اس کا سودا نہیں کرتے اسی وجہ سے انبیاء اور اولیائے الٰہی نے اپنے محبوب سے اپنی مناجات میں مسلسل اپنے اشتیاق کااس کی بہ نسبت آشکار طور پر اظہار کیا ہے اور عرفاء اور سالکین نے اپنے اشعار اور قصائد

[1] اصول کافی، کلینی، باب ابطال الروۓۃ، ح ۶

[2] ترتیب وار رجوع کیجئے: سورۂ صف، ۴ ؛ بقرہ ۱۹۵ ، ۲۲۲ ۔ آل عمران ۷۶، ۱۴۶، ۱۵۹ ؛ مائدہ ۴۲، اور توبہ ۱۰۸۔ منجملہ ان کے میرزاجواد ملکی تبریزی کارسالہ، ''لقاء اللہ''ملاحظہ ہو ۔

میں جو انھوں نے بطور یادگار چھوڑے ہیں اپنے آتش عشق کے دلکش اور جاذب نظر مناظر کی، جمال محبوب کی مراد و ملاقات و شہود سے متعلق اظہار خیال کیا ہے نیز دوست کے فراق و جدائی کے غم انگیز اور حزن آور حالات کی منظر کشی کی ہے۔

ان کے نزدیک خدا کی ملاقات عرفان کی بلند ترین چوٹی اور سالکین کی سیر کا منتہیٰ ہے انھوں نے ایسی بہت سی کتابیں بھی تحریر فرمائی ہیں جن میں اس مقصد تک رسائی کے اسباب و ذرائع اور ان منازل و مراحل کو بیان کیا ہے جو اس راہ کے سالکوں کے لئے سرراہ پائے جاتے ہیں اور جو خطرات اس راہ میں ہیں ان سے بھی آگاہ کیا ہے نیز اس راہ میں جو زاد و توشہ کام آسکتا ہے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

خدا وند عالم کی داؤد پیغمبر سے گفتگو کے درمیان مذکور ہے: ''اے داؤد! ہمارے زمین میں رہنے والے بندوں سے کہو! میں اس کا دوست ہوں جو مجھے دوست رکھتا ہے اور اس کا ہمنشین ہوں جو مجھ سے ہمنشینی کرتا ہے اور اس کا ہمدم ہوں جو میری یاد اور نام سے انسیت حاصل کرتا ہے اور اس کے ہمراہ ہوں جو میرے ہمراہ ہے، میں اس کا انتخاب کرتا ہوں جو میرا انتخاب کرتا ہے اور اس کا فرمانبردار ہوں جو میرا فرمانبردار ہے۔

جو انسان مجھے قلبی اعتبار سے دوست رکھتا ہے اور میں اس پر یقین کرلوں تو اسے اپنے ساتھ قبول کرلوں گا (اور اسے ایسا دوست رکھوں گا) کہ میرے بندوں میں سے کوئی بندہ اس پر سبقت نہ کر پائے، جو انسان واقعی مجھے تلاش کرے تو پالے گا اور جو کوئی میرے علاوہ کسی دوسرے کو تلاش کرے تو مجھے نہیں پائے گا، لہذا اے اہل زمین! دنیا کے فریبوں اور اس کی باطل چیزوں کو چھوڑ دو، اور میری کرامت، مصاحبت، ہمنشینی کے لئے جلدی کرو اور مجھ سے انس اختیار کرو تاکہ میں بھی تم سے انس اختیار کروں اور تم سے دوستی کے لئے جلدی کروں[1]۔

[1] سید بن طاؤوس، مسکن الفواد، ص ۲۷۔

۲۔ توکل اخلاق اسلامی میں ایک دوسرا عام مفہوم جو نفسانی صفت پر ناظر اور انسان و خدا کے درمیان رابطہ کا بیان کرنے والا ہے ''توکل'' کا مفہوم ہے۔ اس مختصر کتاب میں اس کے مقام و منزلت، ماہیت و درجات اور سعی و کوشش کے ساتھ اس کی نسبت کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

ایک۔ توکل کی حقیقت و ماہیت: توکل کی حقیقت و ماہیت کس طرح بیان کی جائے؟ علماء اخلاق نے اس کی تعریف کے باب میں یہ ذکر کیا ہے: توکل یعنی اپنے تمام امور میں انسان کا خدا پر قلبی اطمینان اور اعتماد کرنا نیز تمام قدرتوں سے بیزاری اختیار کرنا ہے، البتہ انسان کے اندر اس حالت کا تحقق اس بات پر موقوف ہے کہ اس کا ایمان و یقین اور قوت قلب اس بات کو قبول کرے کہ عالم و بنی آدم کے کسی کام میں خدا کے علاوہ کوئی قوت اور طاقت موثر و کار ساز نہیں ہے اور تمام اسباب و علل قدرت الٰہی کے مقہور اور زیر اثر ہیں اور اسی کے ارادہ کے تحت عمل کرتے ہیں کہ یہ خود توحید کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔ اس وجہ سے ''توکل'' کی اصل واساس توحید ہے اور حصول توحید کے بغیر وہ وجود میں نہیں آسکتا[1]۔

یہ اس اعتبار سے ہے کہ خداوند عالم نے امور کو ان کے اسباب و علل کی طرف اور کاموں کو ان کے فاعل کی طرف منسوب کرنے کی اجازت دے رکھی ہے ایک طرح سے ہے اور علل اور فاعلوں کو حوادث اور افعال پر مسلّط کیا ہے؛ اگر چہ یہ تسلط اور غلبہ اصلی اور ذاتی نہیں ہے اور طبیعی علل اور انسانی فاعل تاثیر گذاری میں استقلال نہیں رکھتے، صرف خدا وند عالم ہے جو مستقل سبب اور تمام اسباب سے بالا تر ہے۔

اس بنا ء پر جب ایک عاقل اور رشید انسان نے کسی کام کا ارادہ کیا اور اس کے عادی و معمول کے مطابق اسباب و وسائل کو فراہم کیا تو وہ جانتا ہے کہ تدبیر امور میں مستقل سبب تنہا خدا ہے اور کسی قسم کی اصالت اور استقلال کا اپنے لئے نیز ان اسباب و

[1] اسی لئے بعض علماء اخلاق نے توکل اور توحید کو ایک ردیف میں ذکرکیا ہے، رجوع کیجئے: فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج ۷، ص ۳۷۷۔

علل کے لئے جن کا وہ استعمال کرتا ہے قائل نہیں ہے، لہٰذا وہ خداوند سبحان پر توکل کرتا ہے، اس بناء پر توکل کے معنی انسان یا طبیعی اسباب و علل کی جانب امور کے انتساب کی نفی کرنا اوراصالت و استقلال کو خدا سے مخصوص سمجھنا ہے۔[1]

دو۔ توکل کے درجات: اخلاق اسلامی بعض علماء خداوند عالم پر توکل کے لئے تین درجات کے قائل ہیں کہ ان کا مختصر بیان درج ذیل ہے :خداوند ذوالجلال پرتوکل کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اس پر اعتماد و اطمینان رکھے۔ بعینہ اس اعتماد کی طرح جو کسی وکیل پر اپنے امور کی انجام دہی میں انتخاب کرکے رکھتا ہے۔

درحقیقت یہ توکل کا سب سے ادنی درجہ ہے اور آسانی کے ساتھ دسترسی کے قابل ہے اور زیادہ دن تک باقی رہتا ہے نیز انسان کے اختیار اور تدبیر سے بھی منافات نہیں رکھتا۔

توکل کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اصل توکل سے غافل اور اپنے وکیل یعنی خداوند سبحان کے بارے میں فانی ہے، بر خلاف پہلی قسم کے کہ انسان کی توجہ زیادہ تر وکالت کے قرار دادی رابطہ کی طرف ہوتی ہے۔ توکل کا یہ درجہ کم محقق ہوتا ہے اور جلد ختم ہوجاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک دو دن سے زیادہ باقی نہیں رہتا ہے اور صرف خاص افراد کو حاصل ہوتا ہے انسان اس حالت میں اپنی بہتر سے بہتر کوشش گریہ اور خدا وند عالم سے دعا ودرخواست میں صرف کرتا ہے۔

توکل کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی تمام حرکات و سکنات کو خداوند عالم کے اختیار میں سمجھتا ہے۔ اس قسم اور قسم دوم میں فرق یہ ہے کہ اس میں انسان حتیٰ التماس، درخواست، تضرع و زاری اور دعا کو بھی نظر انداز کردیتا ہے اور اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ خداوند عالم اپنی حکمت سے امور کی تدبیر کرتا ہے اگر چہ وہ درخواست والتماس نہ کرے اس توکل کا واقعی نمونہ حضرت ابراہیم ـ کا (خداپر) توکل کرنا ہے۔

---

[1] علامہ طباطبائی کی المیزان، ج ۱۱، ص ۲۱۶ ، ۲۱۷ ملاحظہ ہو۔

کیونکہ جب نمرودیوں نے انھیں منجنیق میں رکھ کر آگ میں ڈالا تو الٰہی فرشتہ انھیںیاد آوری کرتا ہے کہ وہ خدا سے امداد کی درخواست کریں، لیکن وہ جواب میں کہتے ہیں: ''خدا وند عالم کا میرے حال سے آگاہ ہونا مجھے اس سے نجات کی درخواست کرنے سے بے نیاز کرتا ہے[۱]''۔

البتہ ایسی قسم ندرت سے دیکھنے میں آتی ہے اور نہایت کمیاب ہے۔ یہ صدیقین کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتی ہے اور اگر واقع ہو بھی گئی تو جلد ہی زائل ہوجاتی ہے اور چند لحظہ سے زیادہ اس کو دوام نہیں رہتا[۲]۔

دوسرے رخ سے، لوگ خداوند عالم پر توکل و اعتماد کرنے میںیکساں مراتب و درجات نہیں رکھتے۔ ہر ایک کو چاہئے کہ اپنے توکل کے بقدر اپنے مقاصد تک پہنچنے میں اسباب و علل سے چارہ جوئی کرے۔ خداوند عالم ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے بالکل اسباب و علل طبیعی سے اپنا قطع تعلق کرلیا ہے اسی اعتماد کے تناسب سے برتاؤ کرے گا۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق ـ نے فرمایا ہے: ''خدا نہیں چاہتا ہے کہ مومنین کی روزی اس جگہ سے فراہم کرے جہاں سے وہ گمان نہیں رکھتے[۳]'' خداوند عالم کا یہ برتاؤ ان مومنین سے مخصوص ہے جو توکل کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں؛ لیکن جو لوگ اس درجہ پر فائز نہیں ہوئے ہیں اور ان کا خدا وند عالم پر اعتماد کے ساتھ ساتھ طبیعی اسباب و علل پر بھی اعتماد باقی ہے، خداوند عالم بھی اسباب و علل کے ذریعہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرے گا[۴]۔

---

[۱] تفسیر قمی، ج۲، ص ۷۳ ملاحظہ ہو۔
[۲] فیض کاشانی المحجۃ البیضاء، ج۷، ص ۴۰۸، ۴۰۹ ؛نراقی، ج۳، ص ۲۲۳تا ۲۲۵۔

[۳] کلینی، کافی، ج۵، ص۸۳، ح۱۔ ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، ص۶۰۔شیخ طوسی، امالی، ص۳۰۰، ح۵۹۳۔
[۴] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۲۲۹، ۲۳۰۔

تین ۔ توکل کی اہمیت: قرآن کریم نے دسیوں بار صراحت اور کنایہ کے ساتھ انسان بالخصوص مومنین کو خداوند عالم پر توکل کی دعوت دی ہے اور بندوں کے اس اعتماد و اطمینان کے مقابل ان کے امور کی کفالت سے متعلق خداوند عالم کے وعدہ کا اعلان کیا ہے۔ منجملہ ان کے قرآن میں ذکر ہے: ''مومنین کو چاہئے کہ صرف اور صرف خدا پر توکل کریں[1]''۔

''خداوند عالم توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''[2] اسی طرح خدا پر اعتماد اور توکل کے انجام کی نسبت اطمینان حاصل ہونے کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: ''جو خدا پر اعتماد کرتا ہے اس کے لئے وہی کافی ہے[3]''

احادیث نبوی اور اہل بیت ۲۲۲ کے ارشادات ان عبارتوں سے بھرے پڑے ہیں جن میں توکل کی اہمیت اور فضیلت بیان ہوئی ہے، مثال کے طور پر حضرت امام جعفر صادق ۔ نے فرمایا: ''بے شک بے نیازی اور عزت گردش کی حالت میں ہیں وہ جیسے ہی توکل کی منزل سے گذرتی ہیں اس جگہ کو اپنا ٹھکانہ اور وطن بنالیتی ہیں[4]''۔

چار۔ سعی وکوشش اور توکل: اگر چہ توکل کی حقیقت کے بارے میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ توکل سعی وتلاش اور اسباب ووسائل سے استفادہ کرنے سے منافات نہیں رکھتا لیکن کبھی ایسا شبہہ پیش آتا ہے کہ اس کی جانب اشارہ کرنا مفید ہے۔

انسان ان امور کی نسبت جن کے اسباب و علل اس کے ارادہ سے خارج ہیں وہ توکل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رکھتا لیکن ان حوادث کی نسبت جن کے اسباب و علل کی ایجاد اس کے ہاتھ میں ہے باوجودیکہ توکل کے سبب اسباب ووسائل کے لئے مستقل تاثیر کا قائل نہیں ہے، لیکن اس کا فریضہ ہے کہ ان کی فراہمی کے لئے کوشش کرے اور جس چیز کی سببیت کے لئے یقین یا گمان رکھتا ہے اس کا استعمال کرے اور اس حیثیت میں اپنی عقل و ہوش سے استفادہ کرے۔

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۲۲، ۱۶۰۔ مائدہ ، آیت ۱۲، ۲۶۔ توبہ آیت ۵۲۔ ابراہیم، آیت ۱۱۔ مجادلہ، آیت ۱۰۔ تغابن، ۱۳۔
[2] سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹۔
[3] سورۂ طلاق، آیت ۳۔
[4] کلینی، کافی ج۲، ص ۶۵، ح۳۔

کیونکہ خدا کی سنت اس بات پر قائم ہے کہ امور عالم اپنے خاص اسباب و علل کے ساتھ آگے بڑھیں، اسی بنیاد پر اس نے فرمایا ہے:

''جنگ کے موقع پر خاص طریقہ اور اسلحہ کے ساتھ نماز پڑھو[۱]'' ''اور اپنے لئے دفاعی قوت پیدا کرو[۲]''۔ موسیٰ ۔ کو حکم دیا کہ

''ہمارے بندوں کو شب (کے سناٹے) میں فرعونیوں کی نگاہوں سے بچا کر شہر سے نکال لو[۳]''۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ایک اعرابی کو دیکھا کہ اس نے خداوند عالم پر توکل کے بہانہ اپنے اونٹوں کو جنگل میں چھوڑ دیا تو فرمایا:

''اعقلھا و توکّل[۴]'' ''اونٹ کو باندھ دو اور خدا پر توکل کرو''

ایک۔ شکر کی ماہیت اور درجات: شکر کی ماہیت کے سلسلہ میں متعدد عبارتیں استعمال کی گئی ہیں ''نعمت کا تصور اور اس کا اظہار[۵]''

''منعم کی نعمت کی شناخت اور اس کی بہ نسبت سرور و شادمانی، اس سرور کے مقتضیٰ کے مطابق عمل کرنا امور خیر پر عزم کے ساتھ، منعم کی شکرگذاری اور خداوند عالم کی راہ بندگی میں نعمت کا استعمال[۶]'' اور ''اظہار نعمت'' یہ ساری تعریفیں شکر کے لئے بیان کی گئی ہیں ان تمام تعریفوں کو یکجا کرکے کہا جا سکتا ہے کہ در حقیقت شکر وہی ''نعمت کا اظہار'' ہے۔

نعمت کا اظہار ایک طرف اس کے تصور و ادراک کا مستلزم ہے اور دوسری طرف یہ اظہار مختلف مراتب اور پہلوؤں کا حامل ہے کیونکہ نعمت کے اظہار سے مراد اس کا ایسی راہ میں استعمال کرنا ہے جس میں منعم نے ارادہ کیا ہو، اسی طرح اس کی کا ذکر اور اس کی نعمت کے لئے اس کی مدح و ثنا کرنا ہے اس وجہ سے شکر سہ گانہ مراتب کا حامل ہے قلبی: (یاد کرنا)، زبانی (مدح و ثنا) اور عملی۔

شکر خداوندی سے مراد یہ ہے کہ انسان پہلے دل میں ہمیشہ اس کی نعمتوں کی طرف متوجہ ہو اور اس کی نعمتوں کو یاد رکھتا ہو۔

---

[۱] سورۂ نساء ۱۰۱
[۲] سورۂ انفال ۶۱۔
[۳] سورۂ دخان ۲۳۔
[۴] طوسی، امالی، ص ۱۹۳، ح ۳۲۹۔
[۵] راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ قرآن، ص ۲۷۲۔
[۶] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص ۲۳۳۔ اسی طرح ملاحظہ ہو فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج۷، ص۴۴تا ۱۴۶۔
[۷] علامہ طباطبائی، المیزان، ج۴، ص ۳۸، اور ج۶، ص ۲۱۵۔

دوسرے یہ کہ اللہ کی بیکراں نعمتوں سے استفادہ کرنے کے وقت اللہ کی حمد و ستائش کے لئے زبان کھولے۔ تیسرے خدا کی نعمتوں اور اس کی برکتوں کواس راہ میں استعمال کرے جس میں اس کی مرضی اور خواہش ہو[۱]۔

شکر کے مقابل کفر ہے جو کہ اللہ کی نعمتوں کو پوشیدہ و مخفی کرنے کے معنی میں ہے البتہ واضح ہے کہ اللہ کی بے شمار نعمتوں کی بہ نسبت اللہ کے شاکر بندے بھی شکر گزاری سے عہدہ بر نہیں ہو سکتے، اس کے باوجود ادب بندگی اقتضاء کرتا ہے کہ اس راہ میں اپنی انتھک کوشش کرے۔

قرآن اللہ کی نعمتوں کی وسعت اور نوع بشر کے میزان شکر کے بارے میں فرماتا ہے: ''اور تم نے جو کچھ مانگا اس نے عطا کیا، اور اگر خدا کی نعمتوں کو شمار کرو تو ان کا شمار نہیں کر سکتے یقیناً انسان بڑا ظالم اور ناشکرا ہے[۲]''۔

دو۔ شکر کی اہمیت: آیات و روایات میں شکر کی شرح میں ذکر ہوا ہے: شکر گزاری خدا کے صفات میں سے ہے ''اور خدا شکر گزار اور بردبار ہے[۳]''، شکر گزاری جنت میں رہنے والوں کے کلام کی ابتدا و انتہا ہے: ''شکر اس خدا کا جس نے ہم سے کئے گئے اپنے وعدہ کو ہم پر سچ کر دکھایا[۴]'' اور ان کی مناجات کا آخری کلام یہ ہے: ''الحمد للہ رب العالمین[۵]'' خداوند عالم نے شکر گزاری کو ایمان کے ساتھ ساتھ عذاب سے روکنے کا باعث قرار دیا ہے: ''اگر شکر گذار بنو اور ایمان لے آؤ تو خدا تم پر عذاب کر کے کیا کرے گا؟[٦]''

---

[۱] شکر کے مراتب کو معتبر و مستند احادیث کے مضامین سے استنباط کیا جا سکتا ہے ؛ جیسے کافی، ج۲، ص ۹۶، ح ۱۵، اور ص ۹۵، ح۹، ۱۱۔
[۲] سورۂ ابراہیم، آیت ۳۴، اسی طرح ملاحظہ ہو سورۂ اعراف، آیت ۱۰ اور ۱۷، سورۂ یونس، آیت ۶۰ اور سورۂ غافر، آیت ۶۱۔
[۳] سورۂ تغابن، آیت۱۷ اسی طرح ملاحظہ ہوسورۂ نساء آیت ۱۴۷۔
[٤] سورۂ زمر ، ۷۴۔
[٥] یونس ، ۱۰۔
[٦] نساء ، ۱۴۷۔

شکر گزاری کی فضیلت میں اتنا ہی کافی ہے کہ خداوندعالم صریحی طور پر بندوں کو اس کا حکم دیتا ہے: ''اور میرا شکر بجا لاؤ اور میرے ساتھ ناشکری نہ کرو''[1] حضرت امام زین العابدین ۔ کے بقول خداوند عالم کا شکر ادا کرنا انسان کو اللہ کی خاص محبت کے دائرہ میں قرار دیتا ہے: ''حقیقت میں خداوندعالم ہر محزون وغمزدہ دل اور ہر شکر گذار و قدرداں بندہ کودوست رکھتا ہے[2]'' ۔ اس وجہ سے حق شناسی اور شکر گزاری خداوند عالم اور انسان کے درمیان رابطہ بر قرار کرنے والے اساسی وبنیادی عناصر میں سے ہے یہ انسان کا خدا کے ساتھ رابطہ ہے جس کی اصل الٰہی نعمتوں اور برکتوں کے ادراک اور ان کی نسبت قلبی اعتراف میں پوشیدہ ہے۔

قابل ذکر بات ہے کہ ''شکر ''اپنے مجموعی مفہوم کے اعتبار سے لوگوں کی شکر گزاری بھی لوگوں کی خدمتوں کے سلسلہ میں شامل ہے اس طرح کے شکر کے سلسلہ میں اخلاق معاشرت کی بحث میں گفتگو کی جاتی ہے۔

تین ۔ شکر خداوندی کا دنیوی نتیجہ: سب سے اہم دنیوی اثر جو دینی کتابوں میں شکر گزاری کے لئے بیان کیا گیا ہے، پروردگار کی نعمتوں کا زیادہ ہونا ہے۔ قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے: ''جب کہ تمہارے رب نے اعلان کیا کہ اگر شکر کروگے تو (نعمت) کو تم پر زیادہ کردوں گا اور اگرناشکری کروگے تو یقیناً میرا عذاب سخت ہے[3]'' ۔

یہ حقیقت بہت سی روایات میں بیان ہوئی ہے ؛ منجملہ ان کے حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''خداوند عالم کسی بندہ پر شکر گذاری کا دروازہ نہیں کھولتا،اس حال میں کہ نعمت کا دروازہ اس پر بند کردے[4]'' یہ سوال ہمیشہ ہوتا رہتا ہے کہ آیا خداوند سبحان کی شکر گزاری بندوں کے لئے مقدور ہے؟کیونکہ سپاس گذار ی کی توفیق اور اس کی قوت خود خدا کی ایک نعمت ہے اور دوسرے شکر کا مستلزم ہے۔

[1] بقرہ ۱۵۲ اسی طرح ملاحظہ ہو سورۂ اعراف ۱۴۴ اور سورۂ زمر ۶۶۔
[2] کافی، کلینی، ج۲، ص۹۹ح۳۰۔

[3] ۳۔ ابراہیم ۷۔
[4] نہج البلاغہ، حکمت ۴۳۵؛ کافی، ج ۲، ص ۹۴، ح۲اورص ۹۵، ح ۹ ؛ امالی، ص ۵۹۔

اگراس فریضہ کا انجام دینا انسان کے امکان سے خارج ہے، توپھر کس طرح انسان کو اس کے کرنے کا حکم دیتا ہے؟اس سوال کے جواب میں حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں: ''وہ باتیں جن کی خداوند عالم نے موسیٰ ۔ کووحی کی تھی ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ موسیٰ میرا شکر ایسا اداکرو، جو میرے شایان شان ہو '' موسیٰ ۔ نے جواب میں پوچھا: خدایا! کس طرح تیری شکرگذاری کا حق ادا کروں جب کہ ہر طرح میری شکرگذاری خود ہی ایک دوسری نعمت ہے ؟

خدا نے جواب میں فرمایا: اب (جب کہ تم نے جان لیا کہ تمہارا شکر کرنا خود ہی ایک دوسری نعمت ہے) تم نے میرے شکر کا حق ادا کردیا [1]'' یعنی شکر الہی کا حق یہ ہے کہ انسان اپنی آخری کوشش کو اس راہ میں صرف کرے، اسی کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ کے شایان شان شکر ادا نہیں ہوسکتا ۔

ب۔ نفس کا اپنی عاقبت کی طرف رجحان بعض عام اخلاقی مفاہیم انسان کے نفسانی حالات کے نظام کو اپنی عاقبت اور انجام کار کے لئے وجود میں لاتے ہیں وہ اہم ترین مفاہیم جو اس باب میں ذکر ہوئے ہیں یہ ہیں: خوف، رجاء، مایوسی، نا امیدی اور تدبیر خداوندی سے حفاظت۔ چونکہ یاس و ناامیدی ''خوف وخشیت '' کے لئے نقصاندہ اور تدبیر خداوندی سے حفاظت، امید و رجاء کے لئے بلا شمار ہوتی ہے، نتیجہ کے طور پر بحث و گفتگو کا موضوع اس حصہ میں '' خوف و امید '' ہے اور دیگر مفاہیم انھیں دو عنوانوں کے تحت زیر بحث قرار پائیں گے۔

ا۔خوف الف۔ خوف کا مفہوم: خوف یعنی مستقبل میں یقینی یا ظنّی علامتوں کی بنیاد پر انسان کے لئے کسی ایسے ناگوار واقعہ کے پیش آنے کا احتمال [2] جو فطری طور پر درد مندی اور پریشانی کا باعث ہے [3] اس بنا پر ''خوف'' ''بزدلی'' سے اساسی فرق رکھتا ہے

---

[1] کافی، کلینی، ج۲، ص۹۸، ص۹۸، ح۲۷ملاحظہ ہو۔

[2] راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ قرآن، ص ۱۶۱۔

[3] ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج ۷، ص ۲۴۹؛ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص۲۰۹۔

کیونکہ ''جبن (بزدلی)'' سے مراد ہے خود کو دفاع اور انتقام وغیرہ سے ایسی جگہوں پر روکنا جہاں شرعی اور عقلی دونوں لحاظ سے اس کا اقدام کرنا جائز اور بہتر ہے[1]۔

علماء اخلاق نے پہلی تقسیم میں خوف کو دو پسندیدہ اور ناپسندیدہ قسم میں تقسیم کیا ہے۔ ناپسند خوف وہی خدا کے علاوہ کسی دوسری چیز سے خوف کھانا ہے اور خوف پسندیدہ عذاب خداوندی اور برے انجام سے خوف کھانا ہے اور حقیقت میں اپنی بری رفتار اور اعمال کے ناگوار عواقب سے خوف کھانا ہے۔ یہاں پر ہماری بحث کا موضوع پسندیدہ خوف ہے۔

ب۔ خوف کے درجات: اخلاق اسلامی کی مشہور کتابوں میں ''ورع'' ''تقویٰ'' اور ''صدق'' کو ''خوف'' کے درجات میں شمار کیا گیا ہے اس طرح سے خوف کا سب سے معمولی درجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا باعث ہو کہ انسان اخلاقی ممنوعات و منہیات کے ارتکاب سے پرہیز کرے ''خوف'' کے اس درجہ کو ''ورع'' کہتے ہیں۔

اور جب خوف کی قوت اور طاقت میں اضافہ ہوجائے اور وہ اس بات کا باعث ہو کہ انسان محرمات کے ارتکاب کے علاوہ مشکوک و مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرے تو اسے تقویٰ'' کہتے ہیں تقویٰ میں صداقت یہ ہے کہ حتی بعض جائز و مباح امور کے ارتکاب سے بھی پرہیز کرے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ حرام کے ارتکاب کی راہ ہموار کردے اور آخر کار جب انسان خدا سے شدت خوف کی وجہ سے سراپا آمادۂ خدمت ہوتا ہے اور ضرورت سے زیادہ کوئی گھر نہیں بناتا اور نہ کوئی مال ذخیرہ کرتا ہے

اور اس مال کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا جس کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ اسے ایک دن چھوڑ جائے گا اور کوئی سانس بھی غیر خدا کی راہ میں نہیں لیتا تو در حقیقت اس نے ''صدق'' کی وادی میں قدم رکھ دیا ہے اور ایسے مرتبہ کے مالک کو صدیق کہتے ہیں اس بنا پر مقام ''صدق'' اپنے اندر تقویٰ و ورع بھی رکھتا ہے اور تقویٰ و ورع کا حامل بھی ہے البتہ ''ورع'' عفّت کے

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۱، ص ۲۰۹۔

ساتھ بھی ہے کیونکہ عفت نفسانی شہوات و خواہشات سے پرہیز کرنے کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے لیکن اس کے برعکس صادق نہیں ہے[1]۔

ج۔ خوف کی اہمیت: اولاً خدا کا خوف انسان کے لئے سعادت حاصل کرنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ پہلے بیان کئے گئے مباحث کی روشنی میں انسان کی سعادت پروردگار سے ملاقات اور اس کے جوار میں سکونت اختیار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ بات انس و محبت الٰہی کے سایہ ہی میں ممکن و میسر ہے اور وہ خود معرفت الٰہی پر منحصر ہے اور معرفت خود فکر کی مرہون منت ہے اور انس محبت وذکر پر منحصر ہے۔

فکر وذکر الٰہی اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے دل کو دنیاوی محبت سے الگ کر لے اور دنیا سے قلبی لگاؤ کو قطع کرنے کے لئے شہوتوں اور لذتوں سے کنارہ کشی کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور خوف خداوندی کی آگ لذتوں اور شہوتوں کی راہ میں ایک کارآمد اسلحہ ہے[2]نتیجۃً خوف الٰہی انسان کا مقصد کی طرف حرکت کرنے کا پہلا سنگ بنیاد ہے۔

ثانیاً، بہت سی آیات وروایات مختلف انداز سے خدا کے خوف کی اہمیت و منزلت پر تاکید کرتی ہیں۔ منجملہ ان کے قرآن نے خدا سے خوف کرنے والوں کو رحمت و رضوان و ہدایت کا وعدہ دیا ہے: ''ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب کا خوف رکھتے تھے ہدایت و رحمت تھی[3]''۔

''خدا ان لوگوں سے راضی و خوشنود ہے اور وہ لوگ بھی اس سے راضی و خوشنود ہیں یہ جزا اس کی ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے[1]''اسی طرح قرآن خوف کا دعوی صرف حقیقی عالموں سے قبول کرتا ہے: ''خدا کے بندوں میں صرف علماء ہیں جو اس سے ڈرتے ہیں[2]''۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج ۷، ص ۲۷۰ ، ۱ ۲۷۔
[2] ایضاً۔
[3] اعراف ، ۱۵۴۔

دوسری جگہ خوف کو ایمان کے لوازم میں شمار کیا ہے: ''مومنین وہی لوگ ہیں کہ جب خدا کا ذکر ہو تو ان کے دل خوفزدہ ہوں''

سرانجام قرآن نے خدا ترس لوگوں سے بہشت کا وعدہ کیا ہے: ''اور رہے وہ جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے[۳] ہراساں ہیں اور اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے روک رکھا ہے، اس کا ٹھکانہ بہشت ہے[۴]''۔

خداوند عالم کی حضرت عیسیٰ ـ سے گفتگو میں مذکور ہے: ''اے عیسیٰ! مجھ سے ڈرو اور میرے بندوں کو میری نسبت خوف دلاؤ، شاید گناہگار لوگ جو وہ گناہ کرتے ہیں اس سے باز آجائیں اور نتیجہ کے طور پر ہلاک نہ ہوں سوائے ان کے جو جانتے ہیں[۵]''۔

د ـ خوف کے بارے میں ہوشیاری: خداوند ذو الجلال سے خوف کھانا وادی قرب الٰہی میں بندوں کے سلوک کے لئے ایک تازیانہ ہے ـ جیسا کہ اس تازیانہ کا کمزور ہونا یا فقدان، الٰہی راہ کے سالکوں کے لئے بے زاد و راحلہ بنا دیتا ہے، حد سے زیادہ اس کی زیادتی بھی امید کی کرن کو اس کے دل میں منزل مقصود تک پہونچنے کے امکان میں خاموش کردے گی اور حرکت کرنے کی طاقت بھی اس سے سلب کرلے گی ـ لہٰذا خدا وند عالم سے خوف میں افراط کرنا رحمت الٰہی سے قنوط ومایوسی ہے جو خوف خدا کی عظیم آفت ہے ـ اور اخلاقی برائی شمار ہوتی ہے[۶] بعض ارباب لغت نے قنوط کو مایوسی کا شدید درجہ سمجھتے ہیں[۶]۔

اسی بنیاد پر قرآن کریم رحمت خداوندی سے مایوسی کو محض گمراہی تصور کرتا ہے: ''کون ہے جز گمراہوں کے جو رحمت خداوندی سے مایوس ہوتا ہے؟[۷]'' اور دوسری جگہ رحمت خداوندی سے مایوسی کو کافروں کا شیوہ تصور کرتا ہے: ''یقیناً کافروں کے سوا کوئی رحمت الٰہی سے مایوس نہیں ہوتا[۸]''۔

---

[۱] بینہ ، ۸۔

[۲] فاطر ، ۲۸۔
[۳] انفال ، ۲ ـ آل عمران ، ۱۷۵۔
[۴] نازعات ، ۴۰، ۴۱۔
[۵] کافی، ج ۸، ص ۱۳۸، ح ۱۰۳۔
[۶] ملاحظہ ہو ابو ہلال عسکری اور نور الدین جزائری کی کتاب معجم الفروق اللغوےۃ، ص ۴۳۵، ۴۳۶۔
[۷] سورۂ حجر، آیت ۵۶ـ ۳ـ سورۂ یوسف، آیت ۸۷۔
[۸] ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج ۷، ص۲۴۹ـ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۱، ص ۲۴۴۔

بہت سے موارد میں انسان کا خوف زندگی کے برے انجام اور شوم عاقبت سے ہوتا ہے ؛ خوف اس بات کا کہ کہیں انسان کفر کی حالت یا خدا کے انکار یا شک وتردید کی حالت میں دنیا سے چلا جائے یا ایسے حال میں دنیا چھوڑے کہ اس کا دل خدا کی محبت اور اس کے انس سے خالی ہو، نتیجہ کے طور پر اپنے اعمال سے شرمندہ اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہو۔ واضح ہے کہ جو بھی ایسا خوف و ہراس دل میں رکھے گا اسی وقت سے اپنی راہ وروش اور گفتار کو بدلنا چاہے گا اور یہ وہی خدا سے خوف رکھنے کی فضیلت کا رمز ہے۔

۲۔ امید **الف۔** امید کا مفہوم: ''رجاء'' (''امید '') سے مراد قلبی سکون کا احساس ہے اور وہ کسی ایسے امر کے تحقق کے انتظار کے نتیجہ میں ہے جو محبوب اور خوش آیند ہے، البتہ ایسی صورت میں جبکہ اس محبوب امر کے اکثر اسباب اور موجبات محقق وثابت ہوں۔ لیکن جب اسباب کا وجود یا عدم معلوم نہ ہو تو ایسے انتظار کو ''تمنا'' اور ''آرزو'' کہا جاتا ہے۔

اگر امر محبوب کے وجود کے اسباب و علل فراہم نہ ہوں اور اس کے باوجود انسان اس کے تحقق کا انتظار رکھتا ہو تو ایسے انتظار کو '' فریب'' اور ''حماقت'' کہتے ہیں اور کبھی اس پر رجاء وامید کا مفہوم صادق نہیں آتا ہے ''امید ''بھی ''خوف وہراس'' کے مانند ایسی جگہ ذکر کی جاتی ہے جہاں واقعہ کا ظاہر ہونا عام طور سے محتمل ہو نہ کہ قطعی اس وجہ سے امید سورج کے طلوع یا غروب کے متعلق جس کا تحقق قطعی ہے، صحیح نہیں ہے[1]۔

ب۔ امید کی اہمیت: قرآن وروایات میں رحمت خداوندی اور نیک انجام سے امید مختلف جہات اور اسالیب میں مورد تاکید وترغیب واقع ہوا ہے کہ ذیل میں ان کے صرف اصلی محور کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

---

[1] ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج ۷، ص۲۴۹۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۱، ص ۲۴۴۔

۱۔ وہ آیات وروایات جو رحمت خداوندی سے اس مایوسی اور نا امیدی کی مذمت میں ہے جو ''امید '' کے مقابل ہے، وارد ہوئی ہیں، ان میں سے بعض بیان ہو چکی ہیں۔

۲۔ وہ آیات وروایات جو بندوں کو واضح طور پر فضل خداوندی کا امید وار بناتی ہیں اور اس کی تشویق وترغیب کرتی ہیں؛ منجملہ ان کے یہ ہے کہ خداوند ذوا الجلال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے: ''عمل کرنے والے (مومنین) ان اعمال پر اعتماد نہ کریں جو میرے ثواب کے حصول کے لئے انجام دیتے ہیں، کیونکہ اگر اپنی تمام عمر میری عبادت کے لئے کوشاں ہوں اور زحمت کریں اس کے بعد بھی کوتاہی کی ہو اور میری عبادت کی کنہ و حقیقت کو کہ جس کے سبب سے وہ کرامت جو میرے نزدیک ہے اور میری بہشت کی نعمتوں کو تلاش کرتے ہیں، نہیں پہونچ سکتے، بلکہ انھیں چاہئے کہ میری رحمت پر اعتماد کریں اور میری بخشش کے امید وار رہیں[1]''۔

۳۔ قرآن وروایات میں مذکور ہے کہ فرشتے اور اللہ کے انبیاء ہمیشہ مومنین کے لئے خداوند عالم سے عفو و بخشش طلب کرتے رہتے ہیں اور یہ خود رحمت خداوندی سے امید رکھنے کا باعث ہے۔

قرآن میں مذکور ہے: ''فرشتے اپنے پروردگار کی حمد میں تسبیح پڑھتے ہیں اوران لوگوں کے لئے جو زمین میں ہیں عفو و بخشش طلب کرتے ہیں[2]''۔

۴۔ وہ آیات وروایات جو اللہ کے بے کراں عفو ومغفرت پر دلالت کرتی ہیں: ''یقیناً تمہارا رب لوگوں کی نسبت ان کے ستم کے باوجود بخشنے والاہے[3]''اسی طرح جو کچھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے بارے میں ان کی امت کی نسبت وارد ہوا ہے، یا وہ آیات وروایات جو اس بات کو بیان کرنے والی ہیں کہ جہنم صرف اور صرف کافروں کے لئے فراہم کی گئی ہے، یا مومنین کے آتش

---

[1] کافی، ج۲، ص۷۱، ح ۱۔ ۳۔
[2] سورۂ شوری، آیت۵۔
[3] سورۂ رعد، آیت ۶۔

(جہنم) میں ہمیشہ رہنے کی نفی کرتی ہیں، اسی طرح گناہگاروں کو عفو وگذشت کی درخواست میں جلدی کرنے کی دعوت دیتی ہیں یہ تمام آیات وروایات درحقیقت خداوندعالم سے امید رکھنے اور حسن عاقبت کی تشویق کرتی ہیں[1]۔

ج۔ امید کے نقصانات: خداوندعالم کی رحمت سے امید اور نیک انجام کی توقع رکھنے سے دو لحاظ سے شدت کے ساتھ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ ذیل میں ان کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

ا۔ بغیر عمل کے امید وارہونا: ''امید '' کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ کسی خوش آیند امر کے تحقق کے انتظار کے نتیجہ میں قلبی کو اس صورت میں امید واری کا نام دیا جاتا ہے کہ جب اس کے اکثر وبیشتر اسباب وعلل فراہم ہوں ورنہ خوش آیند سرانجام کا انتظار بغیر اس کے اسباب کے تحقق کے ''حماقت ''اور ''غرور '' کے سوا کوئی چیز نہیں ہوگی۔

امیدواری کی ایک اہم ترین مشکل درواقع جھوٹی اور بے بنیاد امیدیں ہیں، اسلام کے اخلاقی نظام میں سعادتمندی اور نیک بختی صرف عمل صالح کی راہ سے گذرتی ہے لیکن بہت سے ایسے افراد ہیں جو بغیر کوشش اور نیک عمل کے، نیک اور اچھے انجام کی امید کے داعیدار ہیں۔

حضرت علی ۔ اس گروہ کو ہوشیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''کیا تم امید رکھتے ہو کہ تمہیں خدا متواضع افراد جیسا اجر دے دیگا جب کہ تم اس کے نزدیک سرکشوں میں شمار سے ہو اور صدقہ دینے والوں کے ثواب کی آرزو رکھتے ہو جب کہ تم نعمت سے مالامال ہو اوراسے بے چاروں اور بیوہ عورتوں پر خرچ کرنے سے دریغ کرتے ہو !آدمی نے جو کچھ کیا ہے وہ اسی کی جزا پاتا ہے اور جو اس نے پہلے روانہ کیا ہے اسی پر وارد ہوتا ہے[2]''۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۴۷ تا ۲۵۴۔
[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۲۱، اور ملاحظہ ہو خطبہ ۱۶۰، حکمت۱۵۰ حرانی، تحف العقول، ص ۲ ۔ کافی، کلینی، ج۲، ص ۶۸، ح۵۔

۲۔ تدبیر خداوندی سے اپنے کو محفوظ سمجھنا: خداوند رحمان کی بخشش کا حد درجہ امیدوار ہونا تدبیر خداوندی (سزائے الٰہی) سے بے خوفی کا احساس دلاتا ہے جو کہ اخلاقی رزائل میں سے ایک ہے۔ خود کو اللہ کے عذاب سے محفوظ سمجھنا خوف الٰہی سے منافات رکھتا ہے، نیز تدبیر الٰہی سے امان کا احساس انسان کو گناہ و عصیان میں غوطہ لگانے کا آغاز ہے۔

اسی بنیاد پر انبیاء واولیاء خود کو امن وامان میں نہیں سمجھتے تھے اور ہمیشہ عذاب خداوندی سے خوفزدہ رہتے تھے۔ قرآن کریم تدبیر خداوندی سے امان کے احساس کی مذمت میں فرماتا ہے: ''آیا انہوں نے خود کو تدبیر خداوندی سے امان میں خیال کیا ہے ؟ (باوجودیکہ) خسارہ اٹھانے والے لوگوں کے علاوہ کوئی بھی خود کو تدبیر الٰہی سے محفوظ نہیں سمجھتا[1]''۔

د۔ خوف ورجاء کے درمیان مناسبتیں: اس سلسلہ میں دو رخ سے توجہ کی جا سکتی ہے: ایک قلب انسان پر ان میں سے ہر ایک کی کیفیت اور اثر کے اعتبار سے، دوسرے یہ کہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کیا مقام و منزلت اور کیا اہمیت رکھتے ہیں یعنی یہ کہ آیا امید، خوف سے زیادہ اہم چیز ہے یا اس کے عکس (خوف امید سے زیادہ اہم ہے؟)

پہلی بات تو یہ ہے کہ خوف ورجاء گذشتہ مفہوم کے اعتبار سے اصل وجود میں ایک دوسرے کی نسبت لازم وملزوم ہیں ؛ کیونکہ ''خوف'' کسی ناگوار امر کے وقوع اور آئندہ ممکن الحصول چیز کے انتظار کے نتیجہ میں قلبی گھبراہٹ اور پریشانی ہے، اس وجہ سے جس طرح اس کا واقع ہونا احتمال رکھتا ہے اسی طرح اس کا واقع نہ ہونا بھی احتمال رکھتا ہے نیز جس طرح اس کا واقع ہونا ناگوار اور نا خوش آیند ہے اسی طرح اس کا واقع نہ ہونا بھی خوش آیند اور اس کے عدم کا انتظار خود ہی مایۂ امید ہوگا۔ اس وجہ سے ہر امید اپنے دامن میں خوف و ہراس رکھتی ہے اور اس کے برعکس ہر خوف و ہراس بھی اپنے دامن میں امید رکھتا ہے۔

---

[1] اعراف، ۹۹۔

رہا اس سوال کا جواب کہ ان دونوں کا اثر انسان پر کس درجہ ہے؟ کہا جا سکتا ہے: یہ نسبت اسی اندازہ اور میزان کے ساتھ ہونی چاہیے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کے اثر حرکت اور کارآمد ہونے کو کم نہ کرے، کیونکہ خوف و رجاء عمل صالح اور خداوند عالم سے تقرب کا ذریعہ ہیں، اور یہ اس وقت ثابت ہوگا جب دونوں ہی تعادل وتوازن کے ساتھ(میانہ حالت پر) ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہمیت کے اعتبار سے جب دونوں کا ایک دوسرے سے مقایسہ کیا جائے تو یہی ذہن میں آتا ہے کہ اس قیاس کو دو سطح میں انجام دیا جا سکتا ہے:۱۔ فرداًفرداًافراد اور مصادیق کے اعتبار سے، ۲۔ مصادیق سے صرف نظر کرکے تنہا خوف ورجاء کی حقیقت پر غور کرتے ہوئے افراد کی نسبت ان دونوں میں سے ہر ایک کا مقدم ہونا فرد کی حالت سے وابستہ ہے۔

بعض کو ''امید '' متحرک کردیتی ہے تو بعض کو ''خوف '' متحرک بنادیتا ہے۔ واضح ہے کہ مناسب دوا ہرایک کے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن معین افراد واشخاص سے قطع نظر اور خوف و رجاء کی حقیقت کے پیش نظر بعض آیات [1] و روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اگر عمل خداوندرحمان پر امید کے ذریعہ انجام پائے تو اس عمل پر جو خوف کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ برتری رکھتا ہے۔ منجملہ ان کے حضرت علی ۔سے نقل ہوا ہے: ''رحمت الٰہی کی امید خوف الٰہی سے زیادہ قوی ہے۔کیونکہ خداوندعالم سے تمہارا خوف کھانا تمہارے گناہوں سے پیدا ہوتا ہے لیکن خدا سے تمہاری امید اس کی بخشش سے پیدا ہوتی ہے، لہٰذا خوف تمہاری طرف سے ہےاور امید اس کی طرف سے[2]'' دعائے جوشن کبیر میں وارد ہوا ہے: ''یا من سبقت رحمتہ غضبہ''اے وہ ذات جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

ج۔ نفس کا خود اپنی طرف رجحان نفس انسانی کے اپنی نسبت رجحان کا تعادل وتوازن بعبارت دیگر اپنے کام سے متعلق صحیح جانچ پڑتال رکھنا اخلاق اسلامی میں عام مفاہیم کے دوسرے گروہ کا ہدف ومقصد ہے۔ سب سے اہم وہ مفہوم جو انسانی کے اپنی نسبت

[1] فصلت ، ۲۳ اور فتح ، ۱۲۔

[2] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدیدمعتزلی، ج۲۰، ص ۳۱۹ ،ح ۶۶۶۔

مثبت رجحان اور صحیح جانچ پڑتال کا ذریعہ بیان کرتا ہے وہ '' انکساری '' یا '' خود شکنی '' اور '' تواضع '' ہے۔

ا۔ انکسار نفس نفس کی انکساری اور خود شکنی سے مراد یہ ہے کہ انسان بغیر اس کے کہ اپنا کسی غیر سے مقایسہ کرے خود کو سب سے حقیر چھوٹا سمجھے نیز خود پسند اور اپنے آپ سے راضی نہ ہو، خود شکنی تواضع کا سرچشمہ ہے اور بغیر اس کے تواضع محقق نہیں ہوتی۔ اس بنا پر جو کچھ تواضع کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں بیان کیا جائے گا وہ سب فروتنی اور خود شکنی کی فضیلت پر بھی دلالت کرے گا، اور شاید اسی وجہ سے آیات و روایات میں زیادہ تر ''تواضع '' کے سلسلہ میں تاکید کی گئی ہے اور انکساری نفس اور خود کو حقیر شمار کرنے کے بارے میں کم ذکر آیا ہے۔ انکساری نفس کی فضیلت کے مختلف پہلوؤں کو جب اس کے موانع سے مقایسہ کریں اور ان کے متضاد مفاہیم پر غور کریں تو بخوبی دریافت کر سکتے ہیں، یہ موانع درج ذیل ہیں!:

پہلی نظر عُجب(خود پسندی) عُجب خود ستائی اور غرور فروتنی اور خودکو حقیر شمار کرنے کے اصلی و بنیادی موانع میں سے ایک ہے، چونکہ خودستائی حقیقت میں خود پسندی کی علامت اور اس کے ملحقات میں سے ہے لہذا ہم موانع کی بحث کو خود پسندی اور غرور کے محور پر بیان کریں گے۔

الف۔ عُجب کا مفہوم: عُجب یعنی خود کو اس کمال کی وجہ سے عظیم اور بلند سمجھنا ا جو وہ اپنے اندر سمجھتا ہے خواہ وہ کمال واقعاً اس میں پایا جاتا ہو یا نہ پایا جاتا ہو، نیز جس چیز کو وہ کمال تصور کر رہا ہے واقعاً بھی کمال ہو یا نہ ہو اس وجہ سے خود پسندی میں بھی انکسار نفس اور فروتنی کے مانند دوسرے سے مقایسہ نہیں پایا جاتا ہے اور بغیر اس کے کہ انسان اپنا دوسروں سے مقایسہ کرے اپنے اندرپائے جانے والے واقعی یا خیالی کمال کے تصور کی وجہ سے نیز اس بات سے غفلت کے سبب کہ ہر کمال خدا کی جانب سے ہے، اپنے آپ پر مغرور اور راضی و خوشنود ہے اور اپنی حالت کوپسند کرتا ہے۔ بر خلاف ''کبر '' کے کہ متکبر انسان اپنے آپ

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۳۴۳ملاحظہ ہو۔

سے راضی و خوشنود ہونے کے علاوہ خود کو دوسروں سے مقایسہ کرکے اور اپنے آپ کو غیروں سے بہتر سمجھتا ہے نیز اپنے لئے دوسروں کے مقابل حق اور اہمیت و امتیاز کا قائل ہے[۱]

اس بنا پر، ''کبر''کا محقق ہونا اس بات کا مستلزم ہے کہ ''عُجب'' بھی پایا جائے، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں عُجب و خود پسندی ہو وہاں کبر بھی ضروری ہو۔ کبھی انسان کی خود پسندی اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ جو اس کے اندر کمال پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے اپنے لئے خدا وند عالم سے حقوق اور مطالبات کا انتظار کرتا ہے اور اپنے لئے خدا کے نزدیک حیثیت و مرتبہ کا قائل ہو جاتا ہے،اس طرح سے کہ ناگوار حوادث کا وقوع اپنے لئے بعید سمجھتا ہے ایسی حالت کو ''ادلال''کہا جاتا ہے،در حقیقت یہ حالت خود پسندی کا سب سے بڑا اور بدترین درجہ ہے[۲]۔

ب۔ خود پسندی کی مذمت: قرآن کریم میں بارہا خود پسندی کی مذمت کی گئی ہے، منجملہ ان کے جنگ حنین میں مسلمانوں کی شکست کی علت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے'' یقیناً خداوندرحمان نے تمہاری بہت سے مواقع پر مدد کی ہے اور حنین کے روز بھی جب کہ تمہاری کثرت تعداد نے تمہیں فخر وناز میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور زمین اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم دشمن کی طرف پیٹھ کر کے فرار کر گئے[۳]''۔

اس آیت میں خود پسندی کا ذکر اخلاقی برائی کے عنوان سے ہوا ہے جو کہ لشکر اسلام کی شکست کا باعث بن گئی ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ خدا وند عالم نے حضرت داؤد ۔ سے فرمایا: ''اے داؤد! گناہگاروں کو بشارت دے دو اور صدیقین (سچے اور پاک باز لوگوں کو) ڈراؤ۔

---

[۱] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۳۲۱، ۳۲۲ملاحظہ ہو۔ ۲۔ ایضاً، ص۳۲۲۔۳۔ سورۂ توبہ، آیت۲۵۔ اسی طرح ملاحظہ ہو
[۲] سورۂ حشر، آیت
[۳]سورۂ کہف، آیت ۴۰۔ اور سورۂ فاطر، آیت ۸۔

داؤد ـ نے عرض کی: گنا ہگاروں کو کس طرح مژدہ سناؤں اور صدیقین کو کیسے ڈراؤں ؟ خدا نے فرمایا : اے داؤد! گنہگاروں کو اس بات کی خوش خبری دو کہ میں توبہ قبول کروں گا اوران کے گناہوں کو معاف کر دوں گا اور صدیقین کو ڈراؤ کہ اپنے اعمال پر اترائیں نہیں، کیونکہ کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس کا محاسبہ کروں مگر یہ کہ وہ ہلاک ہو[1]۔

بے شک خود پسندی اور خود بینی اخلاق اسلامی کی رو سے نہ صرف ایک غیر اخلاقی عمل ہے بلکہ اخلاقی رذائل کی ایک شاہراہ ہے اور جو تعبیریں دینی کتابوں میں اس کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں وہ اس مختصر کتاب کی گنجائش سے باہر ہیں[2]۔

ج۔ خود پسندی کے اسباب: اسلامی اخلاق کے عالموں نےخود پسندی کے بہت سے اسباب و عوامل ذکر کئے ہیں کہ ان میں سے اہم ترین درج ذیل ہیں :

۱۔ جسمانی بنیاد پر خود پسندی، جیسے خوبصورتی، جسم کا تناسب، اس کی صحت اور اس کا قوی ہونا، خوش آواز ہونا اور اس کے مانند۔

۲۔ اقتداراور قدرت کے احساس کی بنا پر خود پسندی، جیسا کہ خدا وندعالم قوم عاد کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ لوگ اسی طرح کے توہم کا شکار ہوکر بولے: ''ہم سے زیادہ قوی کون ہے[3]؟'' اس طرح کی خود پسندی عام طور پر جنگ اور ظلم وستم ایجاد کرتی ہے۔

۳۔ عقل ودانش، ذہانت وآگاہی اور دینی اور دنیوی امور کے بارے میں دقیق اور وسیع علم رکھنے کی بنیاد پر خود پسندی۔ اس طرح کی خود پسندی کا نتیجہ خود رائی، ہٹ دھرمی، مشورہ سے بے نیازی کا احساس، دوسروں کو جاہل خیال کرنا اور عالموں اور دانشوروں کی باتوں کو سننے سے پرہیز کرنا ہے۔

---

[1] اصول کافی، کلینی، ج۲، ص ۳۱۴، ح۸۔

[2] علامہ مجلسی ؒ،بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۲۲۸تا ص ۲۳۵۔ کافی، ج ۲، ص ۳۱۳، ۳۱۴۔

[3] سورۂ فصلت، آیت ۱۵۔

۴۔ انتساب کی وجہ سے خود پسندی یعنی با شرف نسب اور با عظمت بزرگوں کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر جیسے بنی ہاشم کی طرف منسوب ہونا اور سید ہونا یا بزرگ خاندان سے تعلق یا شاہان وسلاطین کی طرف انتساب۔ انسان کا ایسا خیال اپنے لئے لوگوں کی خدمت گذاری کی چاہت پیدا کرتا ہے۔

۵۔ اولاد غلام، قبیلہ وخاندان، رشتہ دار اور پیروی کرنے والوں کی کثرت سے اترانا، چنانچہ خدا وند عالم نے کافروں کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''انہوں نے کہا ہماری دولت اور اولاد سب سے زیادہ ہے اور ہم عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے[1]

٦۔ ایسی خود پسندی جو مال و دولت کی فراوانی سے پیدا ہو۔

قرآن دو مالکین باغ میں سے ایک کی زبانی نقل کرتا ہے: ''میرا مال تم سے زیادہ ہے اور افراد کے اعتبار سے بھی میں تم سے قوی ہوں[2]'' اس نے اپنے مال و متاع کو اپنی جانب سے خیال کیا اور اسے اپنی برتری کا سبب جانا خدا وند عالم نے بھی جو کچھ اسے دیا تھا چھین لیا مجموعی طور پر جب بھی انسان خود کو صاحب کمال خیال کرے، خواہ جسے اس نے کمال سمجھا ہے واقعاً کمال ہو یا نہ ہو اور اس بات کو بھول جائے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے خدا کا دیا ہوا ہے اور اسی کی رحمت و توفیق سے میسر ہوا ہے تو یہ امر اس کے اندر خود پسندی کا سبب بن سکتا ہے، حتی اگر خدا کی عبادت اور تقوی سے فیضیاب ہونے اور خدا سے ڈرنے کا احساس بھی ہو[3]۔

د۔ خود پسندی کے نقصان دہ اثرات: جیسا کہ اشارہ ہوا، خود پسندی بہت سی اخلاقی برائیوں کی کنجی ہے ذیل میں ان میں سے بعض اہم ترین برائیوں کی طرف اشارہ کررہے ہیں :

---

[1] سورۂ سباء، آیت۳۵۔

[2] سورۂ کہف، آیت ۳۴۔

[3] ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، ج ۶، ص۲۸۲تا۲۸۹۔

١۔ خود پسندی ''کبر'' کا سرچشمہ نیز اس کے علاوہ بہت سے دوسرے رذائل کا بھی منبع ہے۔ اور کبر خود بینی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا ۔

٢۔ خود بینی گناہوں کے فراموش کرنے کا باعث ہے۔ اگر انسان اپنے بعض گناہوں کی طرف متوجہ بھی ہو، تو انھیں معمولی اورقابل مغفرت شمار کرکے ان کی تلافی کی کوشش نہیں کرتا ۔

٣۔ خود پسند انسان خود بینی کے بالا ترین مراحل میں اپنے کو بہت زیادہ خدا سے نزدیک سمجھتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود کو عذاب الٰہی سے محفوظ جانتاہے، اسی وجہ سے وہ اپنے اعمال کی اصلاح اور اس کے نقائص کو برطرف کرنے کی کوشش نہیں کرتا آخر کار اپنے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔

٤۔ خود پسند انسان چونکہ خداوند عالم سے اپنے لئے کچھ مطالبات رکھتا ہے لہذا شکر گذاری اور قدر شناسی کو اپنا فریضہ نہیں سمجھتا اور اللہ کی نعمتوں کی نسبت نا شکرا ہو جاتا ہے۔

٥۔ خود پسند انسان چونکہ اپنے اعمال سے خوش بین رہتا ہے اس لئے وہ اپنی کمزوری اور احتیاج کا احساس نہیں کرتا نتیجہ یہ ہوتاہے کہ خود کو سوال کرنے اور مشورہ سے بے نیاز سمجھتا ہے۔

٦۔ خود پسند انسان چونکہ اپنے اندر کوئی کمی اور نقص اور عیب نہیں سمجھتا، لہٰذا خود کو دوسروں کی نصیحت اور خیر خواہی سے بے نیاز تصور کرتا ہے اور ان کی نصیحتوں پر توجہ نہیں کرتا[1]۔

---

[1] المحجۃ البیضاء، ص٢٧٥، ٢٧٦ ملاحظہ ہو۔

۷۔ خود ستائی یعنی اپنی آپ تعریف کرنا خود پسندی کا ایک دوسرا اثر ہے۔ خود بین انسان کو جو بھی موقع ہاتھ لگتا ہے وہ صرف اپنی تعریف میں زبان کھولتا ہے اور جو کچھ اس سے متعلق ہے اسے اچھے عنوان سے ذکر کرتا ہے[1]۔

جب کہ آدمی کا حسن اور اس کی خوبی یہ ہے کہ خود کو نقائص، عیوب، گناہوں اور خطاؤں سے بری نہ جانے اور ہمیشہ بارگاہ خداوندی میں اپنے جرم و گناہ کی معذرت کرتا رہے۔ قرآن کریم میں خود ستائی کی مذمت میں ارشاد ہوتا ہے: ''لہٰذا اپنے آپ کو پاکیزہ خیال نہ کرو وہ اس انسان (کے حال) سے جس نے پرہیزگاری اختیار کی ہے زیادہ آگاہ ہے[2]''۔

ھ۔ خود پسندی کا علاج: ہر درد کا علاج اس کے اسباب و علل کو برطرف کرنا ہے، لہٰذا جو انسان اپنے حسن و جمال اور جسمانی صحت پر مغرور ہوگیا ہے، اسے چاہئے کہ وہ اپنے آغاز پیدائش اور اپنے انجام پر نظر کرے اور یہ جان لے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ سریع الزوال اور فانی ہے۔ صاحب قدرت کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ ایک روز کی بیماری میں نابود ہوجائے گا اور ہر آن اس بات کا امکان ہے کہ جو کچھ خدا نے اسے دیا ہے واپس لے لے گا۔

صاحب علم و عقل بھی جان لے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اللہ کی امانت ہے لہٰذا ممکن ہے کہ ایک معمولی حادثہ کے زیر اثر اپنے تمام علم و شعور کو کھو دے اسی طرح صاحبان حسب و نسب بھی جان لیں کہ دوسروں کے کمال کے سبب اظہار فضیلت و بلندی عین جہالت اور بیوقوفی ہے کیونکہ خدا کی بارگاہ میں کرامت و بزرگی تقویٰ و پرہیزگاری کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۳۔ مال و دولت کے مضر اثرات کے بارے میں غور و فکر کرنا کافی ہے تاکہ دولتمندوں کو خود پسندی کے خواب سے بیدار کر دے۔ اہل عبادت اور تقویٰ کو بھی توجہ کرنی چاہئے کہ عبودیت کی غایت خدا کے سامنے تواضع و انکساری کے سوا کچھ نہیں ہے اور عبودیت خود بینی، خود پسندی سے میل نہیں کھاتی۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۱، ص ۳۶۵، ۳۶۶۔
[2] سورۂ نجم، آیت ۳۲۔

دوسری نظر۔ غرور

'' غرور ''جوکچھ نفسانی خواہشات کے موافق ہے اس کی نسبت قلبی سکون و اطمینان نیز انسانی طبیعت کا اس کی طرف مائل ہونا ہے۔ اس صفت کا سر چشمہ یا تو جہالت ہے یا شیطانی وسوسہ ہے۔ اس وجہ سے جو شخص اوہام اور شبہات کی بنیاد پر خود کو خیر و صلاح پر تصورکرتا ہے حقیقت میں وہ دھوکہ کھا گیا ہے اور مغرور ہوگیا ہے، وہ اپنا اور اپنے امور کا صحیح اندازہ لگانے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔

جیسے کوئی حرام طریقہ سے مال حاصل کرے اوروہ اسے راہ خیر مثلاً مسجد بنانے، مدرسہ تعمیر کرنے اور بھوکوں کو سیر کرنے میں خرچ کرے اس خیال سے کہ وہ راہ خیر اور نیکی میں قدم اٹھا رہاہے، جب کہ وہ مغرور اور دھوکہ کھایا ہوا ہے۔ اس وجہ سے '' غرور '' کے دو اساسی رکن ہیں :

۱۔ جہل مرکب: یعنی اس کا قلبی اعتقاد یہ ہے کہ اس کا عمل نیک ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

۲۔ برخلاف اس کے کہ جو وہ ظاہر میں دعویٰ کرتا ہے اس کا اصلی سبب خیر و سعادت نہیں ہے، بلکہ خواہشات و غضب کی پیروی اور انتقام جوئی ہے۔ قرآن و روایات میں غرور کی شدت سے مذمت کی گئی ہے۔

قرآن اس سلسلہ میں انسان کو ہوشیار کرتا ہے: ''تمہیں یہ دنیاوی زندگی دھوکہ ہرگز نہ دے اور شیطان تمہیں ہر گز مغرور (فریب خوردہ) نہ بنائے[1]''۔

[1] سورۂ لقمان، آیت ۳۳۔ اسی طرح ملاحظہ ہو سورۂ حدید، آیت ۱۴۔

دوسری جگہ غرور کا سبب دنیا دوستی اور دنیا طلبی جانتا ہے: ''دنیوی زندگی ماۓ فریب کے سوا کچھ اور نہیں ہے[1]'' اگر چہ لوگوں کے تمام گروہوں میں فریب خوردہ اور مغرور لوگ پائے جاتے ہیں، لیکن بعض گروہ کچھ زیادہ ہی غرور میں مبتلا ہیں یا بعبارت دیگر بعض امور زیادہ تر غرور کا باعث بنتے ہیں۔

اسی وجہ سے علماء اخلاق سب سے اہم ان گروہوں کو جو غرور میں مبتلا ہوتے ہیں، درج ذیل گروہ جانتے ہیں :الف۔ کفار: کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا کا نقد آخرت کے ادھار سے بہتر ہے۔ اسی طرح دنیا کی یقینی لذت آخرت کی وعدہ شدہ لذت سے بہتر ہے۔

ب۔ فاسق اور گناہگار مومنین: کیونکہ یہ لوگ اس بہانہ سے کہ خداوند عالم عظیم اور وسیع رحمت کا مالک ہے، ان کے گناہ اس کے عفو ورحمت کے مقابل ناچیز ہیں، لہٰذا یقیناً رحمت خداوندی ان کے شامل حال ہوگی۔

ج۔ علماء: کیونکہ ممکن ہے کہ یہ تصور کریں کہ علم ودانش، نجات وکامیابی کا ذریعہ ہے اور یہ سوچ کر اپنے علم پر عمل نہ کریں۔

د۔ مبلغین اور واعظین: کیونکہ شاید یہ گمان کریں کہ ان کی نیت لوگوں کی ہدایت ہے جب کہ وہ اپنے نفس کو راضی کرنے کے چکر میں ہیں اور اس راہ میں خلاف واقع امور کی دین کی طرف نسبت دینے سے بھی گریز نہ کریں۔

ہ۔ اہل عبادت اور عمل: چونکہ ممکن ہے کہ حقیقت میں وہ ریا اور خود نمائی کر رہے ہوں، لیکن تصور کریں کہ ان کی غرض اللہ کی رضا اور اس کے معنوی تقرب کا حصول ہے۔

و۔ عرفان کے دعویدار افراد: کیونکہ شاید یہ تصور کریں کہ صرف اہل معرفت کا لباس پہن کر اور ان کی اصطلاحیں استعمال کر کے (بغیر اس کے کہ وہ اپنی حقیقت اور باطن کو تبدیل کریں) سعادت و حقیقت تک پہونچ گئے ہیں۔

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۵ ۔ سورۂ حدید، آیت ۲۰۔

ز۔ مالدار اور ثروت مند افراد: کیونکہ یہ لوگ کبھی راہ حرام سے تحصیل کر کے لوگوں کو دکھانے کے لئے امور خیریہ میں اس کا مصرف کرتے ہیں اور اس کو اپنی سعادت ونیک بختی کا ذریعہ سمجھ کر اپنے دل کو خوش رکھتے ہیں[۱]۔

۲۔ تواضع تواضع کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دوسروں کے مقابل اپنے امتیاز اور فوقیت کا قائل نہ ہو۔ کسی انسان میں اس حالت کا وجود باعث ہوتا ہے کہ دوسروں کو بزرگ اور مکرم سمجھے[۲] تواضع کبر وتکبر کے مقابل ہے اور یہ دونوں تواضع کے لئے مانع کے عنوان سے زیر بحث واقع ہوں گے۔

ایک۔ تواضع کی اہمیت: خدا وند عالم قرآن کریم میں تواضع وفروتنی کو اپنے واقعی مومن بندوں کی خصوصیات میں جانتا ہے اور فرماتا ہے'' :اور خدا وند رحمان کے بندے وہ لوگ ہیں جو روئے زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ونادان لوگ ان سے خطاب کر تے ہیں تو وہ سلامتی کا پیغام دیتے ہیں[۳]'' دوسری جگہ خدا وند عالم پیغمبر اکرم ﷺ سے فرماتا ہے: اپنے ماننے والوں کے ساتھ خاضعانہ رفتار رکھیں'' :اور ان مومنین کے لئے جنھوں نے آپ کی پیروی کی ہے اپنے شانوں کوان کے لئے جھکا دیجئے[۴]''

حضرت امام جعفر صادق ۔ نے فرمایا: خداوند عالم نے موسیٰ کو وحی کی: اے موسیٰ ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اپنی تمام مخلوقات میں تم کو اپنے سے بات کرنے کے لئے کیوں انتخاب کیا ؟ موسیٰ ۔ نے عرض کی: خدا یا !اس کی علت کیا ہے ؟ خدا نے جواب دیا : ''اے موسیٰ! میں نے اپنے بندوں میں اپنے سامنے تم سے زیادہ کسی کو متواضع اور منکسر نہیں دیکھا۔ اے موسیٰ ! جب تم نماز پڑھتے ہو تو اپنے رخسار کو خاک پر رکھتے ہو[۵]''۔

---

[۱] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص ۲۳، ۳۳۔
[۲] ایضاً ، ج۱، ص ۳۵۸، ۳۵۹۔
[۳] سورۂ فرقان، آیت ۶۳ ۔ اسی طرح ملاحظہ ہو سورۂ مائدہ، آیت ۵۴۔
[۴] سورۂ شعراء، آیت ۲۱۵۔
[۵] کافی، کلینی، ج۲، ۱۲۳، ح۷۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: ''کیا بات ہے کہ تم میں عبادت کی شیرینی نہیں دیکھتا؟ ''انہوں نے سوال کیا: عبادت کی شیرینی کیا ہے؟ فرمایا: ''عاجزی وانکساری[1]''۔

دو۔ تواضع کی علامتیں: بعض روایات میں متواضع اور خاکسار انسان کے لئے نشانیاں بیان کی گئی ہیں اگر چہ یہ نشانیاں نمونہ کے طور پر ہیں اور اس کا مفہوم صرف انھیں نشانیوں میں منحصر ہونا نہیں ہے،

انھیں نشانیوں میں سے بعض درج ذیل ہیں :

۱۔ متواضع اور خاکسار انسان بیٹھنے میں بزم کے آخری حصہ میں بیٹھتا ہے[2]۔

۲۔ متواضع انسان سلام کرنے میں دوسروں پر سبقت کرتا ہے[3]۔

۳۔ جنگ وجدال سے باز رہتا ہے خواہ حق اس کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو[4]۔

۴۔ وہ اس بات کو دوست نہیں رکھتا کہ اس کی پرہیزگاری کی تعریف کی جائے۔

تین۔ فروتنی کے موانع : کبر و تکبر، فخر و مباہات، تعصب، طغیانی و سرکشی، ذلت و رسوائی، فروتنی کے سب سے اہم موانع میں شمار ہوتے ہیں، اختصار کے ساتھ ان میں سے بعض کی توضیح دے رہے ہیں۔

الف) کبر: فروتنی کی راہ میں سب سے بنیادی و اساسی مانع ''کبر'' ہے۔

---

[1] ورام بن ابو فراس: تنبیہ الخواطر، ج۱، ص۲۰۱۔

[2] کافی، ج۲، ص ۱۲۳، ح۹۔

[3] علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج۷۵، ص۱۲۰، ح۹۔

[4] ایضاً ، ص۱۱۸، ح۳۔

کبر کا مفہوم: کبر یہ ہے کہ انسان عُجب و خود پسندی کے نتیجہ میں مقابلہ و مقایسہ کے موقع پر خود کو سب سے برتر اور بہتر خیال کرے اس وجہ سے کبر خود پسندی اور عُجب کا معلول ہے (یعنی کبر عُجب و خودپسندی کی وجہ سے وجود میں آتا ہے) اور اس میں دوسروں سے مقایسہ پوشیدہ ہے۔ اگر خود کو بڑا اور برتر سمجھنے کی کیفیت ایک حالت کے عنوان سے فقط انسان کے اندر باطن میں پائی جائے تو اسے ''کبر '' کہتے ہیں، لیکن اگر خارجی اعمال و رفتار میں ظاہر ہو تو اسے ''تکبر '' کہتے ہیں، جیسے کسی کے ساتھ بیٹھنے یا کھانا کھانے سے پرہیز کرے، اور دوسروں سے سلام کا انتظار کرے اور گفتگو کرتے وقت مخاطب کی طرف نگاہ کرنے سے اجتناب کرے وغیرہ[1]...

تکبّر کی مذمت: خداوند عالم نے قرآن کریم میں ان لوگوں کی نسبت جو اللہ کی عبادت میں تکبّر کرتے ہیں، جہنم کا وعدہ دیا ہے ''در حقیقت جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب وہ لوگ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں چلے جائیں گے[2]''۔

دوسری جگہ اعلان کرتا ہے کہ سرائے آخرت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو زمین میں فوقیت و برتری کے خواہاں نہ ہوں:

''اس دارآخرت کو ہم ان لوگوں سے مخصوص کردتے ہیں جو زمین میں فوقیت وبرتری اور فساد کے طالب نہ ہوں[3]''۔

تکبّر کی قسمیں: جس کی نسبت تکبّر کیا جاتا ہے اس کے اعتبار سے تکبّر کی تین قسمیں کی جا سکتی ہیں :

ایک۔ خداوندعالم کے مقابل تکبّر کرنا: جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے: ''جو انسان اس کی پرستش سے امتناع کرے اور کبر کا اظہار کرے عنقریب ان سب کو اپنی بارگاہ میں محشور کرے گا[4]''۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۱، ص ۳۴۴۔
[2] سورۂ مومن، آیت ۶۰۔

[3] سورۂ قصص ، ۸۳ ۔ جاثیہ ، ۳۷ ۔ اعراف ،۱۳، ۱۴۶ ۔ ص ، ۷۳ ، ۷۴ ۔ سورۂ اسراء، آیت ۳۷ ۔ لقمان ،۱۸۔ فرقان ، ۶۳ ۔ نحل ، ۲۹ اور ۲۳ ۔ غافر، آیت ۳۰، ۵۶، ۶۰ ۔ انعام، آیت ۹۳ ،سورۂ زمر، آیت ۷۲۔
[4] سورۂ نساء، آیت ۱۷۲ ۔ سورۂ مریم، آیت ۶۹ ۔ نحل، آیت ۲۳۔ ۵۔سورۂ مومنون، آیت ۴۷۔

دو۔ پیغمبر کے مقابل تکبّر کرنا: پیغمبر کے مقابل تکبّر اس معنی میں ہے کہ انسان اپنی شان و منزلت کو اس بات سے افضل وبرتر تصور کرے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت اور فرامین پر گردن جھکائے۔ جیسا کہ قرآن کفار کے ایک گروہ کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے: ''آیا ان دو بشر پر جو کہ ہمارے ہی جیسے ہیں ایمان لے آئیں''۔

تین۔ لوگوں کے مقابل تکبّر: یعنی خود کو عظیم اور دوسرے لوگوں کو معمولی اور ذلیل و خوار سمجھنا ایک روایت میں اس طرح کے تکبّر کو واقعی جنون سے تعبیر کیا گیا ہے[۱]۔

تکبّر کا علاج: علماء اخلاق نے تکبّر کے علاج کے لئے علمی اور بعض عملی راہیں بتائی ہیں کہ وہ اسباب تکبّر سے اجتناب یا ان کا برطرف کرنا ہے۔ چونکہ حقیقت میں تکبّر کے اسباب وہی خودپسندی کے اسباب ہیں، لہذا جوکچھ خودپسندی کے علاج سے متعلق بیان کیا گیا ہے، وہی تکبّر کے علاج کے لئے بھی کارآمد ہوگا۔

ب) ذلت وخواری: جس طرح بزرگ طلبی اور برتری جوئی (کبر وتکبّر) تواضع کے لئے مانع ہے اسی طرح ذلت وخواری بھی تواضع کے لئے مانع ہے اور عزت نفس سے بھی منافات رکھتی ہے اگر تکبّر اپنی اہمیت جتانے میں افراط اورزیادتی تو ذلت خواری بھی اس امر میں تفریط ہے[۲] اسی بنیاد پر اخلاق اسلامی میں متکبّرین کے مقابل تواضع اور خاکساری کرنے کو شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے کیونکہ متکبّر انسان ہر طرح کی خاکساری و فروتنی کو مقابل شخص کی پستی اور خواری شمار کرتا ہے[۳]۔

---

[۱] شیخ صدوق، خصال، ص ۳۳۲، ح ۳۱۔
[۲] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۱، ص ۳۶۲۔
[۳] ورام بن ابی فراس، تنبیہ الخواطر، ج ۱، ص ۲۰۱ ملاحظہ ہو۔

تیسری فصل

مؤثر نفسانی صفات

د۔ **نفس کی توجہ آئندہ کی نسبت** اخلاق اسلامی کے مفاہیم میں سے بعض یہ ہیں جو انسان کے نفس کی توجہ کو آئندہ سے متعلق بتاتا ہے۔ سب سے پہلے آئندہ کے متعلق نفس کے پسندیدہ رجحان پھر اس کے بعد اس کے موانع کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

۱۔ **آئندہ کی نسبت نفس کا مطلوب رجحان** یہ رجحان درج ذیل شرح کے ساتھ چند مفاہیم کے قالب میں بیان ہوگا :الف۔ حزم:
حزم لغت میں محکم و استوار کام کرنے اور امور کو متقن و محکم بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے[1]۔ روایات میں بھی حزم اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس کے مصادیق کثرت سے بیان کئے گئے ہیں، منجملہ آج کی اصلاح کل کا تدارک، آج کا کام کل پر نہ چھوڑنا، موت کے لئے آمادہ رہنا، ضد اور ہٹ دھرمی نہ کرنا، صاحبان نظر سے مشورہ کرنا، کسی چیز کے طے کرنے میں قاطعیت کا اظہار، مشکوک امور میں توقف کرنا، احتیاط اور عاقبت اندیشی۔ اس طرح سے آئندہ کے بارے میں غورو خوص کرنا اور دور اندیشی حزم کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہے قریب وبعید مستقبل کا تدارک مطلوب صورت میں اسلام کے عالی اخلاقی فضائل میں شمار ہوتا ہے اس سے اخلاق اسلامی کی اصل کتابوں میں حزم کو چالاکی،[2] ایک نوع سرمایہ اور پونجی[3]، ہنر مندی[4] جیسے اوصاف سے یاد کیا گیا ہے اور مومنین کے اوصاف میں سے ایک وصف شمار کیا گیا ہے۔

(خلاصہ یہ کہ آئندہ کی نسبت نفس کی مطلوب توجہ (حزم) یہ ہے کہ پہلے اپنے کل کی حالت اور ان حوادث وواقعات کو جو آئندہ پیش آئیں گے منجملہ ان کے اپنی موت وزندگی کو نظر میں رکھے۔ دوسرے آج کی اپنی خواہشات ومیلانات کو کل کی بہ نسبت آمادہ کرے۔

---
[1] ابن اثیر، نہایہ، ج۱، ص۳۷۹۔
[2] شیخ صدوق، خصال، ج۲، ص۵۰۵، ح
[3] غررالحکم، ح۹۔
[4] ایضاً ، ح۱۱۷۔

ب۔ آرزؤوں کو کم کرنا: کل ہمارے آج کی آرزؤوں کا بستر ہے، سارے انسان جس مقدار میں اپنی بقا و زندگی کے لئے آئندہ امید رکھتے ہیں اسی قدر اپنی آرزؤوں کے دائرہ کی نقشہ کشی کرتے ہیں۔ نیز کبھی کبھی آدمی کی آرزؤوں اور تمناؤں کا دامن اس کی آئندہ زندگی کے دوران کی نسبت امید کو تحت تاثیر قرار دیتا ہے۔

بہر صورت یہ دونوں عامل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اخلاق اسلامی میں کوشش کی گئی ہے کہ انسان کی آرزوئیں اور اس کی امیدیں کو اس کی باقی بچی عمر کی نسبت فطری حقیقتوں اور گراں قیمت اخلاقی معیاروں کے مطابق شکل اختیار کرے ایک طرف انسان کو آگاہ کرتا ہے کہ آئندہ زندگی کے لئے کوئی اطمینان و ضمانت نہیں ہے اور ہر دن اور ہر آن ممکن ہے کہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو لہذا اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے دنیوی مطالبات وخواہشات اور آخرت کے لئے اپنی ضرورتوں کو انھیں واقعیتوں کی بنیاد پر استوار کرے۔

دوسری طرف اسے یاد دلاتا ہے کہ اپنی ہمت کو بلند رکھے اور اپنی انسانی منزلت کا کھانے پینے، سونے اور زودگذر لذتوں، اعتباری منصبوں نیز ایسے لوگوں کی تعریف و توصیف سے جو اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں، سودا نہ کرے۔ اخلاق اسلامی کی تاکید آرزؤوں کو کم کرنے کے سلسلہ میں اسی ہدف کی تکمیل کے پیش نظر ہے، کیونکہ علماء اخلاق کے بقول، طولانی آرزؤوں کی بنیاد دو چیزیں ہیں: ایک طولانی عمر پر اعتقاد اور دوسرے طویل مدت تک دنیوی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کی رغبت۔ اس بنا پر طولانی آرزوئیں ایک طرف انسان کی جہالت اور اس کی موت سے غفلت کا باعث ہیں اور دوسری طرف دنیا سے لگاؤ اور محبت کا باعث ہیں[1] یہ دونوں نہ تنہا رذیلت ہیں، بلکہ بہت سے اخلاقی رذائل کی کنجی ہیں۔ آیات وروایات میں طولانی و دراز آرزؤوں کی مختلف انداز سے مذمت کی گئی ہے۔

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ص۳۲، ۳۵۔

خداوند جبار نے حضرت موسیٰ ـ سے فرمایا: ''اے موسی! دنیا میں دراز آرزوئیں نہ رکھو کہ سخت دل ہوجاؤ گے اور سخت دل انسان مجھ سے دور ہے[1]''۔

حضرت علی ـ نے فرمایا: ''جو شخص یقین رکھتا ہے کہ ایک دن اپنے دوستوں سے جدا ہوجائے گا اور خاک کے سینہ میں چھپ جائے گا اور اپنے سامنے حساب وکتاب رکھتا ہے اور جو کچھ اس نے چھوڑا ہے اس کے کام نہیں آئے گا اور جو کچھ اس نے پہلے بھیجا ہے اس کا محتاج ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ آرزؤوں کے رشتہ کو کوتاہ اور عمل کے دامن کو دراز کرے[2]'' حضرت امام محمد باقر ـ نے بھی فرمایا ہے: ''آرزو کو کم کرکے دنیا سے رہائی کی شیرینی حاصل کرو[3]''۔

ج۔ موت کی یاد: اسلام کے تربیتی اخلاق میں بہت کارآمد وسیلہ ہے وادی معرفت کے سالک اور محبت پروردگار کے کوچہ کے دلدادہ افراد نے موت کی یاد سے متعلق قیمتی تجربے ذکر کئے ہیں، نیز آیات وروایات میں بھی ذکر موت، تربیت اخلاقی میں ایک مفید حکمت عملی اور تدبیر کے عنوان سے مورد تاکید واقع ہوا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: طولانی عمر سے استفادہ کرنے کا یقین دراز مدت آرزؤوں کے ارکان میں سے ہے جو کہ دنیا سے محبت اور ذخیرہ آخرت سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

اخلاق اسلامی اپنے بہت سے ارشادات سے ''یاد مرگ'' کی نسبت اور اصل موت اور اس کے ناگہانی ہونے کے بارے میں دائمی نصیحت سے، ہمارے نفسانی رجحان کو کل کی نسبت ہمیں آمادہ کرتے ہے۔ ہماری کل کی زندگی کی امیدوں کی تصحیح کرکے ہمارے موقف اور ہماری رفتار کو آج کی نسبت بھی اصلاح کرتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر ـ نقل فرماتے ہیں کہ لوگوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے سوال کیا: سب سے زیادہ چالاک مومنوں میں کون ہے؟ رسول خداؐ نے جواب دیا: وہ انسان جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرے اور سب سے زیادہ خود کو موت کے لئے آمادہ کرے۔

---

[1] شیخ کلینی، کافی، ج٢، ص ٣٢٩، ح١۔
[2] علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج٧٣، ص ١٦٧، ح ٣١۔ ٢۔ حرانی، تحف العقول، ص ٢٨٥۔

[3] شیخ کلینی، کافی، ج٣، ص ٢٥٨ز۔

حضرت علی ۔ نے فرمایا: جب تمہارے نفوس تمہیں خواہشات اور شہوات کی جانب کھینچیں، تو موت کو کثرت سے یاد کرو کیونکہ موت سب سے بہتر واعظ ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کو موت کی یاد کی بہت زیادہ تاکید فرماتے تھے اور فرماتے تھے: موت کا کثرت سے ذکر کرو، کیونکہ وہ لذتوں کو درہم برہم کرنے والی اور تمہارے اور تمہارے خواہشات کے درمیان حائل چیز ہے[1]۔

د۔ بلند ہمتی: آرزؤوں کے کوتاہ کرنے اور موت کے انتظار کی ضرورت کا ذکر ہونے کے بعد ممکن ہے کہ یہ تصور پیش آئے کہ بلند آرزؤوں کا فاقد انسان، مستقبل کے لئے سعی و کوشش کا کوئی سبب اور تدبیر، دور اندیشی اور محرّک نہ رکھے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طرف اگر چہ اسلام آرزؤوں کے کوتاہ کرنے کی دعوت دیتا ہے تو دوسری طرف انسان کی امید اور بلند ہمتی کو گراں قیمت الٰہی آرزؤوں اور امیدوں کی سمت موڑ دیتا ہے نہ صرف یہ کہ وہ بلند ہمت افراد کی مذمت کرتا نہیں ہے بلکہ اس کی ایک اخلاقی فضیلت بتاتا ہے اور بلند ہمتی کو خدا کی دوستی اور محبت کی طلب میں جانتا ہے، جیسا کہ حضرت امام زین العابدین خدا سے مناجات کرتے وقت فرماتے ہیں: ''خدایا! مجھے روحانی جسم، آسمانی دل اور ایسی ہمت جو مسلسل تجھ سے وابستہ ہو اور اپنی محبت میں صادق یقین عطا فرما[2]۔''

دوسری مناجات میں بیان کرتے ہیں: اے وہ ذات! جس نے عارفین کو طولِ (یا عطرِ) مناجات سے مانوس کیا اور خائفین کو ولایت و دوستی کا لباس پہنایا، کب خوش ہوگا وہ انسان جس کی ہمت تیرے علاوہ دوسرے کی طرف متوجہ ہو اور کب وہ انسان آرام محسوس کرے گا جو تیرے علاوہ دوسرے کا عزم و ارادہ رکھتا ہے معلوم ہوا سعادت وکمال حاصل کرنے کی راستہ میں سعی وکوشش اور بلند ہمت کی اسلام میں نہایت تاکید کی گئی ہے کہ جس کا راستہ اسی دنیا سے گذرتا ہے اور بہت سے دنیاوی عطیوں سے استفادہ کرنا اور بہرہ مند ہونا اس تک پہونچنے کی شرط ہے۔

---

[1] شیخ طوسی، امالی، ص ٢٨، ح ٣١۔
[2] صحیفہ سجادیہ، دعا ١٩٩۔

پیغمبر اسلام ﷺ ان دونوں کے درمیان (جو بظاہر متعارض ہیں) جمع کرنے کے عنوان سے فرماتے ہیں: ''اپنی دنیا کے لئے اسی طرح کام کروکہ گویا ہمیشہ زندہ رہو گے اور اپنی آخرت کے لئے اسی طرح کام کروکہ گو یا کل مر جاؤگے[1]۔ '' (٢)

٢۔موانع سب سے اہم موانع جو کل کی نسبت نفس کے مطلوب رجحان کے مقابل ہیں،درج ذیل ہیں :

الف۔ طولانی آرزوئیں: دراز آرزؤیں عام طور پر آئندہ سے متعلق انسان کو غیر واقعی تصویر دکھاتی ہیں،انسان کی دنیا سے محبت اور اس کی خوشیوں میں اضافہ کرتی ہیں اور دنیاوی محبت بھی دسیوں اور سیکڑوں اخلاقی رذیلتوں کا باعث ہے جیسا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''حب الدنیا رأس کل خطیٔۃ[2]''''دنیا سے دلبستگی تمام گناہوں کی اصل و اساس ہے '' اسی بنیاد پر دراز آرزؤوں کی شدت کے ساتھ ملامت کی گئی ہے۔

قرآن کریم ایک گروہ کی مذمت میں فرماتا ہے: ''انہیں چھوڑ دو تاکہ کھائیں اور مزے اڑائیں اور امیدیں انھیں غفلت میں ڈالے رہیں، عنقریب وہ جان لیں گے[3]'' اسی طرح طولانی خواہشات انسان کو ''تسویف'' میں مبتلا کرتی ہیں یعنی انسان ہمیشہ پسندیدہ امور کو کل پر ٹالتا رہتا ہے۔

حضرت علی ـ اپنے اصحاب کو نصیحت کرتے ہوئے اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''دنیا کو چھوڑ دو کہ دنیا کی محبت اندھا،بہرہ، گونگا اور بے حال بنادیتی ہے۔ لہذا جو کچھ تمہاری عمر کا حصہ باقی بچا ہے اس میں گذشتہ کی تلافی کرو اور کل اور پرسوں نہ کہو (ٹال مٹول نہ کرو) اس لئے کہ تم سے پہلے والے جو ہلاک ہوئے ہیں لمبی آرزؤوں اور آج اور کل کرنے کی وجہ سے، یہاں تک کہ اچانک ان تک فرمان خداوندی آپہنچا (انھیں موت آگئی) اور وہ لوگ غافل تھے[4]''۔

---

[1] ص ٢٢٨؛ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ۴۴، ص ١٣٩، ح۶۔
[2] شیخ صدوق، خصال، ج١، ص ٢٥، ح ٨٧ ؛ حرانی، تحف العقول، ص٥٠٨۔
[3] سورۂ حجر، آیت ٣۔
[4] شیخ کلینی، کافی، ج٢، ص ١٣۶، ح٢٣۔

ب۔ پست ہمتی: پست ہمتی انسان کو بلند مقامات اور عالی اہداف و مقاصد تک پہونچنے سے روک دیتی ہے، آئندہ کے بارے میں غور وفکر اور عاقبت اندیشی کی نوبت نہیں آنے دیتی اور صرف آج کی فکر اور وقتی فائدہ حاصل کرنے کی عادی بنا دیتی ہے۔ آئندہ کی سعادت اور اس کے خوشگوار رہونے کی فکر کرنا اور ابھی سے کل کی مشکلات کا استقبال کرنا بلند ہمت اور عظیم روح کے مالک افراد کا ہنر ہے، اپنے مستقبل کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں روشن اور درخشاں دیکھنا اور ابھی سے مستقبل کے لئے چارہ اندیشی کرنا بلند ہمت افراد کی شان ہے۔

اس وجہ سے مستقبل کی نسبت اور آج سے کل کی اصلاح کے متعلق نفس کے پسندیدہ رجحان کے لئے ایک مانع کے عنوان سے پست ہمتی کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے۔ منجملہ ان کے حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں: ''تین چیزیں انسان کو مقامات عالیہ اور بلند اہداف تک پہونچنے سے روک دیتی ہیں: پست ہمتی، عدم تدبیر، غور وفکر میں تساہلی[1]۔

ہ۔ دنیوی نعمتوں کی طرف نفس کا رجحان انسان کے بہت سے اعمال ورفتار دنیا کی نسبت ان کے نفسانی رجحان سے پیدا ہوتے ہیں یہ رجحان بہت سے نفسانی صفات اور ملکات کی پیدائش کا سرچشمہ ہے ایسا لگتا ہے کہ اخلاق اسلامی میں مواہب دنیوی کی نسبت نفسانی مطلوب کا رجحان زہد کے محور پر گھومتا ہے اور وہ تمام عام مفاہیم جو اس باب میں ذکر ہوئے ہیں جیسے قناعت، عفت، حرص، طمع و حسرت وغیرہ ان سب کو زہد کی بنیاد پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

زہدایک۔ زہد کا مفہوم ارباب لغت کی نظر میں کسی چیز کی نسبت زہد اختیار کرنے کے معنی اس چیز سے اعراض اور اس سے بہت کم خوش ہونا ہے[2] علماء اخلاق کے فرہنگ میں ''زہد'' نام ہے دنیا سے قلبی اور عملی اعتبار سے کنارہ کشی اور اعراض کرنے کا مگر اتنی ہی مقدار میں جتنی انسان کو اس کی ضرورت ہے۔

---

[1] حرانی، تحف العقول، ص۳۱۸۔
[2] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ص ۳۸۴ ؛ ابن منظور، لسان العرب، ج ۳، ص ۱۹۶ اور ص ۱۹۷۔

بعبارت دیگر زہد یعنی آخرت کے لئے دنیا سے رو گردانی اور خدا کے علاوہ ہر چیز سے قطع رابطہ کرنا ہے اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً، زہد اس شخص پر صادق آتا ہے جس کے یہاں دنیا کے تحصیل کرنے اور اس سے بہرہ مند ہونے کا امکان پایا جاتا ہو۔ دوسرے، دنیا سے روگرداں ہونا آخرت کی بہ نسبت دنیا کی پستی اور حقیر ہونے کے اعتبار سے جب بھی دنیا کا ترک کرنا امکان تحصیل نہ ہونے کی وجہ سے ہو (یعنی دنیا کی تحصیل کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہ ہو) یا خدا کی رضایت اور تحصیل آخرت کے علاوہ کوئی اورہدف و مقصد ہو جیسے لوگوں کی خوشنودی اور دوستی جذب کرنے کے لئے ہو یا اس کی تحصیل میں سختی اور مشقت سے فرار کرنے کی وجہ سے ہو تو اسے ''زہد''نہیں کہا جائے گا[1]۔

دو۔ زہد کی اہمیت آیات و روایات میں زہد اختیار کرنے کی نسبت جو تعبیریں وارد ہوئی ہیں نیز وہ علائم جو اس نفسانی صفات کے لئے بیان کئے گئے ہیں سب کے سب اسلام کے اخلاقی نظام میں دنیا کی نسبت اس کے بلند و بالا مرتبہ کو بیان کرنے والے ہیں ۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: ''دنیا میں زہد اختیار کرنا جسم و دل کے سکون کا باعث ہے[2]''۔

حضرت امام جعفر صادق ـ نے بھی فرمایا ہے: ''دنیا سے بے رغبتی اور بے توجہی آخرت کی جانب متوجہ ہونے کے لئے دل کی فراغت وسکون کا باعث ہے[3]'' خلاصہ یہ کہ پیغمبر اکرم ﷺ اعلان فرماتے ہیں: ''دنیا سے بے توجہ ہوئے بغیر تمہارے دلوں پر ایمان کی چاشنی حرام ہے[4]''۔

تین۔ زہد کے مراتب اوردرجات علماء اخلاق نے مختلف اعتباروں سے زہد کے انواع اور درجات ذکر کئے ہیں، اختصار کے ساتھ ہم انھیں ذکر کررہے ہیں۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادت، ج ۲ ص ۵۵ اور ص ۵۶۔
[2] شیخ صدوقِ خصال، ص۷۳ ح ۱۱۴۔
[3] کافی، کلینی، ج ۲، ص ۱۶، ح ۵۔
[4] کافی، ص ۱۲۸، ح ۲۔

۱۔ زہد کے شدت و ضعف کے اعتبا ر سے مراتب: زہد کو دنیا سے کنارہ کشی کی شدت و ضعف کے اعتبار سے تین درجوں تقسیم کرتے ہیں :الف۔ انسان دنیا سے رو گرداں ہے اس حال میں کہ اس کی طرف مائل ہے اور حقیقت میں زحمت، مشقت اور تکلف کے ساتھ خود کو دنیا سے دور کرتا ہے۔

ب۔ انسان خواہش، رغبت اور آسانی کے ساتھ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کی طرف کوئی میلان ہو کیونکہ اس کی نظر میں دنیا اخروی لذتوں کے مقابل حقیر و پست ہے، در حقیقت اس نے ایک ایسے معاملہ کا اقدام کیا ہے جس میں معمولی اور کم اہمیت چیز کو اس سے قیمتی جنس کی امید میں چھوڑ دیا ہے لیکن اس معاملہ سے وہ راضی و خوشنود ہے۔

ج۔ زہد کا سب سے بلند درجہ یہ ہے کہ اپنی خواہش اور شوق سے دنیا کو ترک کرے اور کبھی کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا احساس نہ کرے۔یعنی احساس نہ کرے کہ کوئی معاملہ ہوا ہے، اسی طرح جیسے کوئی ایک مشت خاک کو چھوڑ دے تاکہ یاقوت حاصل کرے، وہ کبھی احساس نہیں کرتا کہ کوئی چیز اس نے قیمتی چیز کے مقابل گنوائی ہے اور کوئی معاملہ کیا ہے۔

۲۔ زہد کے مراتب اعراض کی جانے والی چیزوں کے اعتبار سے: اس اعتبار سے زہد کے چند درجے درج ذیل بیان کئے گئے ہیں :

الف۔ محرّمات سے اعراض کرنا ؛یعنی محرّمات سے دوری اختیار کرنا کہ جسے ''واجب زہد'' کہتے ہیں۔

ب۔ شبہوں سے اعراض کرنا اور ان کی نسبت زہد اختیار کرنا جو کہ انسان کو ارتکاب گناہ اور محرمات سے سالم رکھنے کا باعث ہیں۔

ج۔ حلال چیزوں سے ضرورت سے زیادہ مقدار کی نسبت زہد اختیار کرنا،یعنی غذا، پوشاک، رہائش، زندگی کے ساز وسامان وغیرہ میں اور ان کو حاصل کرنا کے اسباب و ذرائع جیسے مال وجاہ میں ضرورت بھر پر اکتفا کرنا۔

د ۔ زہد اختیار کرنا ان تمام چیزوں کی نسبت کہ جو نفس کی لذت کا باعث ہوتے ہیں، حتیٰ کہ دنیا سے ضرورت بھر چیزوں میں بھی اس معنی میں کہ ضروری مقدار سے فائدہ اٹھانا اور فیضیاب ہونا بھی اس کی لذت کے لئے نہ ہو، نہ یہ کہ دنیا کی ضرورت بھر چیزوں کو بھی ترک کردے کہ اصولی طور پر ایسی چیز کا امکان ہی نہیں ہے۔ زہد کا یہ درجہ اور اس سے ماقبل تیسری قسم حلال میں زہد اختیار کرنا ہے۔

رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ مبارک وخوشحال ہیں جو خدا کے سامنے فروتنی کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے لئے حلال کیا گیا ہے اس میں زہد اختیار کرتے ہیں بغیر اس کے کہ وہ میری سیرت سے روگرداں ہوں[1]''۔

ہ ۔ جو کچھ خدا کے علاوہ ہے اس سے روگرداں ہونا، حتیٰ خود سے بھی، لیکن بعض اشیاء کی طرف بقدر ضرورت توجہ جیسے خوراک، پوشاک اور لوگوں سے معاشرت زہد کے اس درجہ سے منافات نہیں رکھتی، کیونکہ خداوند رحمان کی جانب توجہ انسان کے زندہ اور باقی رہے بغیر ممکن نہیں ہے اور انسان کی زندگی کے لئے ضروریات حیات ضروری ہیں۔

جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق ۔ سے منقول ہے: ''زہد جہنم سے برائت اور جنت کے دروازہ کی کنجی ہے اور وہ ہر اس چیز کا ترک کرنا ہے جو انسان کو خدا سے غافل کردے، دنیا کے گنوا دینے پر افسوس نہ کرنا اور اس کے ترک کر دینے پر خود پسندی میں مبتلا نہ ہونا ہے[2]''۔

حضرت علی ۔ زہد کی تعریف کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''سارا زہد قرآن کے دو کلموں میں جمع ہے، خداوند سبحان نے فرمایا ہے: ''تاکہ جو کچھ تمہارے ہاتھوں سے چلا ہو گیا ہے اس پر افسوس نہ کرو اور جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس پر شادمان اور مسرور نہ ہو[1]'' اور جو شخص گذشتہ پر افسوس نہ کرے اور آئندہ پر مسرور نہ ہو تو اس نے دو طرف سے زہد اختیار کیا ہے[2]''۔

[1] کافی، ج۸، ص۱۶۹، ح ۱۹۰ ۔ حرانی، تحف العقول، ص۳۰۔ اسی طر ح ملاحظہ ہو صدوق، فقیہ، ج۴، ص ۴۰۰، ح ۵۸۶۱، اور تفسیر عیاشی، ج۲، ص۲۱۱، ح۴۲۔
[2] گیلانی، عبدالرزاق، مصباح الشریعۃ، ص ۱۳۷۔

۳۔ زہد کے مراتب اس چیز کے اعتبار سے کہ انسان جس کی طلب میں دنیا سے روگرداں ہوتا ہے :اس وجہ سے زہد کے درج ذیل تین درجے ہیں:

۱۔ خدا ترس لوگوں کا زہد: انسان آتش جہنم سے نجات اور اخروی عذاب سے بچنے کے لئے دنیا سے روگرداں ہوتا ہے۔

۲۔ امید واروں کا زہد: یعنی دنیا سے اس امید میں روگرداں ہونا کہ خدا کا ثواب اور جنتی نعمتیں حاصل ہوں۔

۳۔ عرفاء کا زہد: نہ ہی درد والم کی طرف توجہ رکھتا ہے تاکہ اس سے نجات طلب کرے اور نہ ہی لذتوں کی اعتناء کرتا ہے تاکہ ان سے فیضیابی کا طالب ہو۔ بلکہ صرف اور صرف خدا سے ملاقات اور اس کے دیدار کا اشتیاق رکھتاہے۔ ایسا زہد صرف اہل معرفت کی شان ہے[۳]۔

جو کچھ زہد کی تعریف اور اس کے درجات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اس کے اعتبار سے معلوم ہوتاہے کہ دنیا سے مراد صرف مال و ثروت، خوراک وپوشاک نہیں ہے، کیونکہ ان تمام امور سے اعراض ایسے افراد کے لئے جو شہرت کے طالب اورپارسائی کی تعریف کو دوست رکھتے ہیں۔ بہت آسان ہوجائے گا بلکہ دنیا تمام مرتبہ وریاست نیز وہ تمام نفسانی استفادے جو دنیا سے ممکن ہیں سب کو شامل ہے۔ حقیقی زہد یعنی مال و مرتبہ سے بے تعلق ہونا اوراس سے روگرداں ہونا ہے۔

سچا زہد وہ ہے جس کی نظر میں فقر و غنا، تعریف و برائی، عزت وذلت جو لوگوں کے نزدیک پائی جاتی ہیں، سب یکساں ہوں، اور وہ صرف محبت خداوندی اور رضائے الٰہی کا طالب ہو۔

چار۔ زہد کے علائم زہد کے بعض اہم علائم کہ جو اپنی جگہ پر خود بھی ایک عام اخلاقی مفہوم ہیں، درج ذیل ہیں:

---

[۱] بقرہ، ۲۳۷۔
[۲] نہج البلاغہ، حکمت ۴۳۹ اسی طرح ملاحظہ ہو: کافی، ج۲، ص ۱۲۸، ح۴۔ شیخ صدوق، امالی، ص ۷۱۴، ح ۹۸۴ ۔ خصال، ص۴۳۷، ح ۲۶۔
[۳] نراقی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۶۵ تا ص ۷۴ ۔فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضا ء، ج۷، ص ۳۵۷ تاص۳۶۴۔

۱۔ قناعت: عربی ادب میں بخشش کی معمولی مقدار پر راضی ہونے[1] اور اپنے سہم پر رضایت دینے کے معنی میں ہے[2] اخلاق اسلامی کے مشہور مآخذ میں ''قناعت'' ''حرص'' کے مقابل استعمال ہوئی ہے اور اس سے مراد وہ نفسانی ملکہ ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی ضرورت بھر اموال پر راضی اور خوش رہتا ہے اور خود کو اس سے زیادہ کی تحصیل کے لئے زحمت و مشقت میں مبتلا نہیں کرتا[3]۔

قناعت کے خود بہت سے مفید علائم ہیں اور دوسری طرف بہت سے اخلاقی رذائل بلکہ حقوقی جرائم سے بچنے کا ذریعہ ہے، اسی وجہ سے اسلام کے اخلاقی نظام میں اس کی تشویق و ترغیب کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا: ''اور خبردار ہم نے ان میں سے بعض لوگوں کو جو زندگانی دنیا کی رونق سے مالا مال کر دیا ہے اُس کی طرف آپ نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں کہ یہ اُن کی آزمائش کا ذریعہ ہے اور آپ کے پروردگار کا رزق ہی بہتر اور پائدار رہے[4]''۔

حضرت علی ۔ قناعت کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں: ''میں نے تونگری تلاش کی لیکن اسے قناعت کے علاوہ کہیں اور نہیں پایا۔ لہٰذا قانع رہو تاکہ مالدار و تونگر ہو جاؤ[5]''قناعت نہ یہ کہ صرف خود اخلاقی فضیلت ہے، بلکہ بہت سے اخلاقی اقدار کی حامل ہے۔ امام علی رضا ۔ سے جب کسی نے قناعت کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے جواب میں اس کے علائم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''قناعت اپنی ضبط نفس، عزّت وبلندی، حرص وطمع کی زحمت سے آسودہ ہونے اور دنیا پرستوں کے مقابل بندگی کا باعث ہے۔ دوانسان کے علاوہ کوئی قناعت کا راستہ طے نہیں کرسکتا ہے: ایسا عبادت گذار جو آخرت کی اجرت کا خواہاں ہے، یا ایسا بزرگ و شریف انسان جو پست لوگوں سے دوری اختیار کرتا ہے[6]۔

---

[1] ابن اثیر، نہایۃ، ج۴، ص ۱۱۴۔
[2] ابن منظور، لسان العرب، ج ۸، ص ۲۹۸۔
[3] نراقی، مولی محمد مہدی، جامع السعادات، ج۲، ص ۱۰۱۔
[4] سورۂ طحہٰ: آیت ۱۳۱۔
[5] علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۳۹۹، ح ۹۱۔
[6] بحار الانوار، ج۷۸، ص ۳۴۹، ح۶۔

درحقیقت انسان دنیا میں قناعت اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رکھتا ورنہ وہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص و ہوس اور حسرت و یاس کی آگ میں جلتا رہے گا ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق سے شکوہ کیا کہ روزی حاصل کرتا ہے لیکن قانع نہیں ہوتا اور اس سے زیادہ کا خواہش مند رہتا ہے اور اس نے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز سکھائیے جس سے میری مشکل حل ہوجائے تو حضرت نے فرمایا: ''اگراس قدر جو تیرے لئے کافی ہو اور تجھے بے نیاز کردے تو دنیا کی تھوڑی سی چیز بھی تجھے بے نیاز کردے گی اور اگر جو کچھ تیرے لئے کافی ہے وہ تجھے بے نیاز نہ کر سکے تو پھر پوری دنیا بھی تجھے بے نیاز نہیں کر سکے گی[1]''۔

لیکن کس طرح قناعت کو اختیار کیا جا سکتا ہے؟ عام طریقوں کے علاوہ بعض خاص طریقے بھی ذکر کئے گئے ہیں، منجملہ ان کے حضرت امام جعفر صادق ۔ اس سلسلہ میں راہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اپنے سے کمزور تر انسان کو دیکھو اور اپنے سے مالدار تر کو نہ دیکھو، کیونکہ یہ کام تمہیں اس چیز پر جو تمہارے لئے مقدر کیا گیا ہے، قانع کردے گا[2]''۔

۲۔ لوگوں کے اموال سے بے نیازی اور عفت: عربی ادب میں ''عفت'' نا پسند امور اور شہوتوں کے مقابل صبر و ضبط کرنے کو کہتے ہیں[3] جنسی عفّت اور کلام میں عفّت کے علاوہ عربی ادب اور دینی کتابوں میں دوسروں سے اظہار درخواست کرنے سے پرہیز کرنے کو بھی عفّت کہتے ہیں[4]۔

دنیا میں زہد کے علائم میں سے ایک علامت لوگوں کے اموال سے بے نیازی اور عفّت اختیار کرنا ہے، قرآن کریم ایسے صاحبان عفّت کے بارے میں فرماتا ہے: یہ صدقہ ''ان فقراء'' کے لئے ہے جوراہ خدا میں گرفتار ہوگئے ہیں اور وہ (اپنی ضروریات زندگی

[1] شیخ کلینی، کافی، ج۲، ص ۱۳۹، ح ۱۰۔
[2] کافی، ج۸، ص ۲۴۴، ح ۳۸۸۔
[3] ابن فارس، مقاييس اللغة، ج ۴، ص ۳۔
[4] ابن منظور، لسان العرب، ج۹، ص ۲۵۳، ملاحظہ ہو۔

پورا کرنے کے لئے) زمین میں سفر نہیں کر سکتے، ان کی حیا و عفت کی بنا پر ناواقف شخص انھیں تونگراور مالدار خیال کرتا ہے، حالانکہ انھیں تم ان کی علامتوں سے پہچان لوگے، اصرار کے ساتھ وہ لوگوں سے کوئی چیز نہیں مانگتے[۱]''۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ لوگوں سے بے نیازی اختیار کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں: ''مومن کا شرف تہجد سے اور اس کی عزت لوگوں سے اس کے بے نیاز رہنے میں ہے[۲]''۔

اور حضرت علی ۔اس بات کے بیان میں کہ لوگوں سے بے نیازی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ان سے معاشرت اور راہ و رسم نہ رکھی جائے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے مغائرت نہیں رکھتی فرمایا ہے: ''تمہارے دل میں لوگوں سے بے نیازی اور ان کی ضرورت و نیاز دونوں ہی ہونی چاہیے ان کے ساتھ تمہاری نیاز اور ضرورت تمہاری نرم کلامی اور خوشروئی میں ہے اور تمہاری بے نیازی آبرو کی حفاظت اور عزت کے باقی رہنے میں ہ[۳]ے'' بے شک مالی امور میں یہ بے نیازی اور عفّت زہد اور دنیا سے قطع تعلق ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

پانچ۔ زہد اختیار کرنے کے موانع انسان کی پارسائی اور زہد اختیارکرنے کے مقابل دو بنیادی رکاوٹیں پائی جاتی ہیں:ایک اس کا دنیا سے محبت کرنا اور دوسرے اس سے بے فیض ہونا اور قطع رابطہ کرنا، تمام مفاہیم جیسے حرص، طمع درحقیقت دنیاوی محبت کے علائم میں شمار ہوتے ہیں اور دنیا طلبی کے نتائج کے عنوان سے مورد بحث واقع ہوتے ہیں۔

۱۔دنیاکی محبت: زہد کا مفہوم اور اس کی اہمیت کی توضیح کے موقع پر ایک حد تک دنیا کا مفہوم بھی آشکار ہوگیا اور اس کی مذمت میں آیات و روایات بیان کی گئیں، اب دنیا طلبی کہ جو زہد اختیار کرنے سے مانع ہے اس کے علائم انحصار کے ساتھ بیان کئے جائیں گے۔

---

[۱] سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۳۔
[۲] شیخ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۱۴۸، ح۱۔

[۳] کافی، ج۲، ص۱۴۹، ح۷۔

بے شک اسلام کے اخلاقی نظام میں دنیا ہمیشہ مذموم نہیں ہے بلکہ اہمیت اور تعریف کے قابل بھی ہے۔ دنیا ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو انسان کے بہرہ مند ہونے کا باعث ہیں، اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور مقاصد کی تکمیل کا باعث ہیں۔ یہ لذتیں اور استفادے ہمیشہ برے نہیں ہیں، بلکہ اچھے نتائج کے بھی حامل ہیں۔

''مذموم دنیا'' سے مراد وہ زودگذر استفادے ہیں جو نہ خود اخروی عمل صالح ہیں اور نہ اخروی عمل صالح کے لئے وسیلہ ہیں۔ نتیجہ کے طور پر مذموم دنیا حرام طریقہ سے لذت جوئی اور عیش و عشرت اور جو حلال چیزوں سے ضرورت و لازم مقدار سے زیادہ مالا مال ہونے کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے[1]۔

یہ وہی دنیا ہے جس کی مذمت میں خدا وند سبحان نے فرمایا ہے: ''گونا گوں اور رنگا رنگ خواہشات کی دوستی یعنی عورتیں، اولاد، کثیر اموال سونے چاندی سے، علامت والے (تندرست) گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں یہ سب لوگوں کے لئے آراستہ کر دی گئی ہیں، (لیکن) یہ سب دنیاوی زندگی کے استفادہ کا ذریعہ ہیں[2]۔

بعض آیات میں ہوائے نفس کے عنوان کے تحت مذموم و ناپسند دنیا سے مخالفت کی ترغیب دلائی گئی ہے[3] قرآن اس کی حقیقت کی توضیح دیتے ہوئے فرماتا ہے: '' جان لو کہ دنیاوی زندگی در حقیقت صرف کھیل کود، تماشہ، آرائش، آپس میں فخر و مباہات اور اولاد واموال میں زیادتی کے مقابلہ کا نام ہے[4]''۔

---

[1] محمد مہدی ، نراقی جامع السعادات، ج۲، ص ۱۷، ۳۵۔
[2] آل عمران، ۱۴ ؛ منافقون، ۹ ؛انفال ۲۸ اور کہف ۴۷۔
[3] نازعات ۴۰۔
[4] حدید ۲۰۔

سر انجام جو اپنی دنیوی زندگی کا دنیا سے سودا کرتے ہیں، قیامت میں ان سے کہا جائے گا: ''اب اسی میں ذلّت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو[1] ''یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو دے کر دنیوی زندگی خرید لی ہے لہذا نہ ان کا عذاب کم ہوگا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی[2]''۔

اس دنیا اور اس کے ناگوار علائم کے بارے میں، جو کہ دنیا وآخرت میں ہوں گے، روایات کثرت سے پائی جاتی ہیں اور ان کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ بعض میں یہ توہم ہوتا ہے کہ گویا اسلامی اخلاق میں دنیاوی چیزوں کی ہمیشہ مذمت ہی کی گئی ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ ہم ان روایات میں سے انھیں پر اکتفا کریں گے جو زہد کی بحث میں بیان کی جا چکی ہیں۔

ممدوح دنیا نام ہے اس سے اتنا ہی استفادہ کرنا جتنا اپنی بقاء، خدا کی عبودیت اور اعمال صالحہ انجام دینے کے لئے لازم ہے۔ یہ حقیقت میں تحصیل آخرت کا مقدمہ ہے۔ اس طرح کی دنیا اسلامی اخلاق میں قابل ستائش واقع ہوئی ہے اور انسانوں کو اس کی تحصیل اور اس سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب اور تشویق دلائی گئی ہے۔ بہت سی روایات میں دنیا و آخرت کے خیر کو بہت سے نیک اعمال کے نتیجہ کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے[3] بہت سی دعاؤں میں ہمیشہ اولیاء خدا کا مطلوب یہی رہا ہے۔ جیسا کہ خدا وندعالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ''مومنین کی درخواست یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''خدا یا ! ہمیں اس دنیا میں بھی نیکی اور آخرت میں بھی نیکی عطا کر[4]''۔

اس میں شک نہیں کہ خیر دنیا سے مراد وہی ممدوح اور پسندیدہ دنیا ہے اس کے مصادیق کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ بعض روایات میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ حضرت علی ۔ ممدوح اورپسندیدہ دنیا کی ستائش میں فرماتے ہیں: ''دنیا مومن کی سواری

---

[1] مومنون ، ۱۰۸۔

[2] بقرہ ، ۸۶۔

[3] کلینی ، کافی، ج۲، ص ۴۹۹، ح ۱۔ اور ص ۷۱، ح ۲۔ اور ج ۵، ص ۳۲۷، ج

[4] سورۂ بقرہ، آیت ۲۰۱۔

ہے جس پر سوار ہو کر وہ خداوند سبحان کی طرف سفر کرتا ہے، لہٰذا اپنی سواریوں کو آمادہ (اصلاح) رکھو تاکہ وہ تمہیں تمہارے رب کی جانب پہنچا دیں[1]"۔

متعدد روایات میں مذکور ہے "جو انسان اپنی معیشت اور اپنے اہل و عیال کی دنیا اصلاح کرنے کے لئے حلال طریقہ سے کوشش کرے تو وہ راہ خدا میں مجاہد کے مانند ہے[2]"دنیا کی محبت کی نشانیاں: دنیا کی محبت کی اہم نشانیاں میں جو ایک مانع کے عنوان سے انسان کے زہد کے مقابل ہے وہ حرص و طمع ہے جس کو اختصار کے ساتھ بیان کررہے ہیں۔

الف۔ دنیا کی حرص: عربی لغت میں "حرص" محبوب و مطلوب چیز کی طلب میں شدید خواہش وارادہ ہوتا ہے[3]نیکی کے حصول میں حرص کرنا ممدوح اورپسندیدہ ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے واقعی توبہ کرنے والوں کی خصوصیات میں نیکیوں اور خیرات پر حریص ہونا جانا ہے[4] متعدد روایات میں علم حاصل کرنے[5]، فقاہت[6]، نیک اور پسندیدہ اعمال انجام دینے[7]، راہ خدا میں جہاد کرنا[8]، اخروی درجات[9] حاصل کرنے اور ان کے مانند دوسری چیزوں میں حریص ہونے کی ستائش ہوئی ہے۔

دنیا کا حریص ہونا ناپسندیدہ صفات اور زہد کے موانع میں سے ایک مانع ہے اسی بنیاد پر متعدد آیات وروایات میں اس کی شدت سے مذمت کی گئی ہے اور اس کے نقصان دہ اثرات مختلف پہلوؤں سے بیان کئے گئے ہیں۔ حریص انسان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی سیر نہیں ہوتا ہے حرص کا اہم ترین نمونہ روایات معصومین ۲۲۲ کی روشنی میں علماء وحکماء کی حرص اور محرمات کے انجام دینے کی حرص ہے۔

---

[1] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۲۰، ص ۳۱۷، ح ۶۴۰۔

[2] شیخ کلینی، کافی، ج ۵، ص ۹۳، ح۳۔ ص۸۸، ح۲ ۔ حرانی، تحف العقول، ص ۴۴۵۔
[3] ابن منظور، لسان العرب، ج۷، ص۱۱۔راغب اصفہانی، مفردات الفاظ قرآن، ص ۲۲۷، ۲۲۸ ملاحظہ ہو۔
[4] حرانی، تحف العقول، ص ۲۲۔
[5] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳ ۔ حرانی، تحف العقول، ص ۱۶۰۔

[6] شیخ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۱ ۲۳، ح۴ ملاحظہ ہو
[7] شیخ صدوق، خصال، ص ۵۱۵، ح ۱۔
[8] شیخ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۲۳۱، ح ۴ ملاحظہ ہو۔
[9] حرانی، تحف العقول، ص ۲۸۶۔

سب سے اہم حرص کا سبب موت کو بھلادینا اور دنیا کی محبت ہے۔ ذلت وخواری، حیا و انسانیت کو ترک کرنا، گناہوں میں ڈوب جانا، انجام و عاقبت کو تباہ وبرباد کردینا دنیا کی حرص کے اہم ترین میں سے ہیں ۔ توکل، قناعت اور موت کی یاد کو دنیا کی حرص کے علاج کا بہترین وسیلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ب۔ طمع اور لالچ : عربی لغت میں طمع کسی شے سے متعلق شہوت وخواہش نفس کے ساتھ اشتیاق کے مفہوم کو کہتے ہیں[1]، علماء اخلاق کی نظر میں طمع سے مراد ہے لوگوں کے اموال کی خواہش اور لالچ کرنا[2]۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں: ''مومن کے لئے کتنی بری بات ہے کہ وہ ایسی چیز کی خواہش اور دلچسپی پیدا کرے جو اسے ذلیل و خوار کردے[3]''۔

حضرت امام زین العابدین ۔ دوسرے کی چیزوں سے انسان کی طمع کے قطع کرنے کی ترغیب و تشویق کے متعلق فرماتے ہیں: '' میں تمام خیر کو لوگوں کے پاس موجود چیزوں سے قطع طمع کرنے میں دیکھتا ہوں[4]'' (یعنی اگر انسان تمام خیر کو جمع کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کے پاس موجود چیزوں سے چشم پوشی کرے اور اس پر نظر نہ جائے) اس وجہ سے طمع اور لالچ بہت سے اخلاقی رزائل کا سرچشمہ ہے جیسے ذلت وخواری، پستی، حسد اور جلن، کینہ توزی، بدگوئی محبت دنیا کے دیگر علائم میں ایک حسرت وافسوس ہے اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کو دنیا حاصل نہیں ہوپاتی ہے۔

۲۔ خمود: خمود سے مراد زندگی کے لئے ضروری کسب معاش میں سستی و تفریط کرنا نیز جنسی اور تمام لذتوں سے بہرہ مند ہونے میں بے رغبتی، عدم دلچسپی اور سستی کرنا ہے[5] جس طرح دنیا کی محبت اور اس سے دلبستگی زہد کی راہ میں مانع محسوب ہوتی ہے اسی طرح حد

---

[1] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ قرآن، ص ۲۱۶۔
[2] نراقی، مولی محمد مہدی، جامع السعادات، ج۲، ص ۱۰۶۔

[3] کلینی، کافی، ج ۲، ص ۳۲، ح ۱۔
[4] ایضاً، ج۲، ص ۳۲۰، ح ۳۔
[5] نراقی، مولی محمد مہدی، جامع السعادات، ج۲، ص ۱۳، ۱۵۔

سے زیادہ ضروریات زندگی کی لازم مقدار پورا کرنے اور دنیوی مواہب اور عطیوں سے استفادہ کرنے میں سستی کرنا دنیا کی نسبت صحیح موقف کی راہ میں ایک مانع ہے۔ جو آیات وروایات ممدوح اورپسندیدہ دنیا کے بارے میں بیان کی گئی ہیں وہ سب زندگی کی ضروری چیزوں کے حصول سے متعلق سستی اور خمود کا مظاہرہ کرنے کی مذمت پر دلالت کرتی ہیں۔

و۔ دوسروں کی نسبت نفس کا رجحان ہمارے خیال میں دوسروں کی نسبت انسان کے نفسانی مطلوب رجحان کو اللہ کی دوستی اور دشمنی کے محور بیان کیا جاسکتا ہے ''حب فی اللہ'' اور ''بغض فی اللہ'' یہ دونوں ایسے مفاہیم ہیں جو اسلامی کتابوں کے اندر شدت کے ساتھ مورد تاکید واقع ہوئے ہیں اور دراصل دوسروں کی نسبت ہمارے دراز مدت موقف اور ہماری حکمت عملی کی تعیین کرتے ہیں۔ اسی سے اس حصہ کے مطالب انھیں دو عنوان کے تحت بیان کئے جائیں گے اور دیگر وہ تمام مفاہیم جو دوسروں سے متعلق ایک طرح سے نفسانی رجحان کو بیان کرتے ہیں ان کو ان دونوں کے توابع اور ملحقات کے عنوان سے بیان کریں گے۔

ا۔ خدا وندعالم کی محبت ایک۔دیگر دوستی کی حقیقت اور اس کے اقسام علماء اخلاق نے دیگر دوستی (دوسروں کو دوست رکھنے) کے لئے چار صورتیں بتائی ہیں کہ پہلے ان کے بارے میں بیان کریں گے پھر ان کی پسند شکلوں کو واضح کریں گے۔

ا۔ انسان کا اپنے لئے دوسروں سے محبت کرنا نہ اس لئے کہ وہ محبوب تک رسائی کے لئے ایک راہ ہے چونکہ خود اسے قابل دوستی اور صاحب کمال و جمال محسوس کرتا ہے اور اس کے دیدار سے لذت حاصل کرتا ہے لہٰذا اسے دوست رکھتا ہے۔ کبھی اس طرح کی دوستی ایک قسم کی محض و باطنی ہم آہنگی کی وجہ سے بھی ہوتی ہے بغیر اس کے کہ کوئی خوبصورتی اور کمال معلوم ہو۔ اس طرح کی دوستی کے مخفی اسرار کا کشف کرنا معمولی انسان کے بس سے باہر ہے، کہا گیا ہے:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح کی دوستی کی طرف جو کہ مخفی ارتباط سے ہوتی ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''ارواح مثل لشکر کے ہیں، ان میں سے جو ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں وہ باہم مانوس ہوتی ہیں اور جو ایک دوسرے کو نہیں پہچانتیں وہ ایک دوسرے سے جدا ہوجاتی ہیں[1]''۔

اس طرح کی دیگر دوستی خداوند سبحان کی دوستی میں شمار نہیں ہوتی لیکن خود بخود مذموم اور بری بھی نہیں ہے، بلکہ انسان کی نفسانی خواہشات میں سے ایک ہے لیکن اگر مذموم اور ناپسند مقصد تک پہونچنے کا ذریعہ ہوتو خود بھی مذموم اور قابل ملامت ہوجائے گی۔

٢۔ ایسے محبوب تک رسائی کے لئے وسائل و ذرائع کے عنوان سے انسان کا دوسرے کو دوست رکھنا کہ جو اس کے لئے دنیاوی فوائد اور منافع رکھتا ہے، کیونکہ انسان ان وسائل و آلات جو اسے محبوب تک پہونچاتے ہیں عشق کرتا ہے۔ واضح ہے کہ اس طرح کی دوستی بھی خدا کی محبت شمار نہیں ہوتی۔

٣۔ دوسرے کو دوست رکھنا ایک ایسے وسیلہ کے عنوان سے جو اسے ایسے ہدف تک پہونچائے کہ وہ ہدف اس کے لئے آخرت کے مثبت فوائد کا حامل ہو، جیسے وہ محبت جو اپنے استاد سے راہ حق کا سالک رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا ہدف سعادت اخروی کا حصول ہے اور معلم ایسا وسیلہ ہے جو اسے اس ہدف تک راہنمائی کرتا ہے۔

اسی طرح ہے وہ محبت بھی جو معلم اپنے شاگردوں سے رکھتا ہے، کیونکہ شاگردوں کے وجود کے واسطہ سے وہ استاد کے کمال و مرتبہ تک پہونچا ہے اور اس مرتبہ کو پاکر حضرت عیسیٰ ۔ کے بقول ''اس کی بزرگی کا تذکرہ ملکوت اعظم میں ہوتا ہے[2]'' بلکہ کلی طور پر ہر اس انسان کی دوستی جس کے علم وفن، صنعت و ہنر، کام کاج اور عمل کے ذریعہ انسان خدا کے نزدیک ہوتا ہے جیسے ایسے لوگوں کو

---

[1] ۔ صدوق، فقیہ، ج ۴، ص ۳۸۰، ح ۵۸۱۸ ؛ اعتقادات، ص ۴۸ ؛ جامع الاخبار، ص ۴۸۸، ح ۱۳۵۹ ؛ علل الشرائع، ص ۸۴، ح۱۔
[2] ابوفراس، تنبیہ الخواطر، ج۱، ص ۸۲۔

دوست رکھنا جو انسان کی دنیوی ضرورتوں کو فراہم کرتے ہیں تاکہ ان سے استفادہ کر کے اپنے اخروی و دنیوی اہداف تک پہنوچ سکیں،بے شک یہ تمام دیگر دوستی خدا کی دوستی محسوب ہوتی ہے۔

۴۔ دوسروں سے صرف خدا کے لئے محبت کرنا، نہ اس لئے کہ اس کے علم و عمل سے فائدہ اٹھائے گا یا اسے کسی دوسرے ہدف تک پہونچنے کے لئے وسیلہ قرار دے گا،بلکہ اس لئے کہ وہ خدا سے ایک نسبت رکھتا ہے، وہ عام نسبت ہو جیسے یہ کہ وہ خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ ہے یا خاص نسبت جیسے یہ کہ وہ خدا کا سچا اور واقعی دوست اور اس کا مقرب اور راہ خدا میں خدمت گذار ہے۔

اس کی محبت کی شدت کے نتائج نیز اس کے عالی مراتب سے ہییہ ہے کہ محبت اساسی طور پر محبوب سے متعلق تمام چیزوں تک سرایت کر جاتی ہے (یعنی انسان محبوب کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق چیزوں کو بھی دوست رکھنے لگتا ہے) خواہ رابطہ اور نسبت دور ہی کی کیوں نہ ہو۔ جیسے جو انسان کسی دوسرے سے شدید محبت کرتا ہے وہ ان لوگوں کو بھی دوست رکھتا ہے جو اس کے محبوب کو دوست رکھتے ہیں،اس کی خدمت کرتے ہیں،اس کی تعریف توصیف کرتے ہیں یا اس کے محبوب کے محبوب ہیں[1]۔

دو۔خدا سے محبت کرنے کی فضیلت اسلامی اخلاق میں خدا کی محبت بلند مرتبہ کی حامل ہے اور اس کی کثرت سے تاکید کی گئی ہے اور اس کے لئے دنیا اور آخرت میں بہت سے علائم بیان کئے گئے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں: ''ایک دن پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب سے سوال کیا: ''ایمان کی دستا ویزوں میں سے کونسی زیادہ محکم و مضبوط ہے '' انہوں نے جواب دیا: خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں ا ن میں سے بعض نے کہا: نماز۔ کچھ نے کہا: زکات۔ کچھ نے کہا: روزہ۔ کچھ نے کہاحج و عمرہ اور بعض نے جہاد کو سب سے محکم خیال کیا۔

---
[1] نراقی، مولی محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۱۸۴تا ۱۸۷۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ان سب کی فضیلت ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی محکم ترین نہیں ہے بلکہ محکم ترین ایمان کی دستاویز خدا کے لئے دوستی کرنا اور اسی کے لئے دشمنی کرنا، خدا کے دوستوں کو دوست رکھنا اور اس کے دشمنوں سے دشمنی اور بیزاری کرنا ہے[1]''۔

حضرت امام محمد باقر ۔ انسان کے خیر و صلاح سے استفادہ کی علامت خدا کے لئے دوستی کو جانتے تھے، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں: ''جب تم جاننا چاہو کہ تم میں کوئی خیر پایا جارہا ہے تو اپنے دل کی طرف نگاہ کرو اگر خدا کی اطاعت کرنے والے کو تم نے دوست رکھا اور اہل معصیت وگناہ کو دشمن تو تم میں خیر ہے اور خدا بھی تم کو دوست رکھتا ہے لیکن اگر خدا کی اطاعت کرنے والوں کو دشمن اور خدا کی معصیت کرنے والوں کو دوست رکھا تو تم میں خیر کا وجود نہیں ہے نیز خدا بھی تمہیں دشمن رکھتا ہے، انسان (کا حساب وکتاب) اسی کے ساتھ ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے[2]''۔

آخرت میں خدا کی محبت کے علائم بارے میں حضرت امام زین العابدین ۔ فرماتے ہیں: ''جب خدا وند عالم اولین سے لے کر آخرین تک تمام انسانوں کو جمع کرے گا تو ایک آواز لگانے والا اٹھے گا اور ایسی آواز سے کہ سب سن سکیں گے آواز لگائے گا: ''کہاں ہیں وہ لوگ جو خدا کے لئے دوستی کرتے تھے؟'' تو لوگوں کا ایک گروہ اٹھے گا اور ان سے کہا جائے گا: بغیر حساب وکتاب کے تم لوگ جنت میں داخل ہوجاؤ[3]' خدا وند عالم سے دوستی اور دشمنی کی اہمیت و منزلت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ متعدد روایات میں ایمان کی ساری حقیقت خدا کی دوستی اور دشمنی میں خلاصہ کی گئی ہے۔

[1] کلینی، کافی، ج۲، ص ۱۲۵، ح ۲ ؛ برقی، محاسن، ج۱، ص ۴۱۱ ؛مجلسی، بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۲۴۲، ح ۱۷۔
[2] ایضاً، ج ۲، ص ۱۲۶، ح ۱۱ ؛ بر قی، محاسن، ج۱، ص ۴۱۰، ح ۹۳۵۔
[3] ایضاً، ج ۲، ص ۱۲۶، ح ۸ ؛ بر قی، محاسن، ج۱، ص ۴۱۲، ح ۹۴۰۔

جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق ـ کا ایک صحابی آپ سے سوال کرتا ہے: ''آیا دوستی اور دشمنی ایمان میں شمار کی جائے گی؟امام نے جواب دیا: ''کیا ایمان دوستی اور دشمنی کے علاوہ کوئی اورچیز ہے؟[1]''

تین۔خدا سے محبت کرنے کی نشانیاں ان میں سے بعض نشانیاں جو خود نفسانی صفات اور بہت سے گراں قیمت اور اہم اخلاقی نشانیاں نتائج کا سرچشمہ ہیں، درج ذیل ہیں :

١۔ نصیحت اور خیر خواہی: نصیحت و خیر خواہی ''حقد '' (کینہ) اور حسد (جلن) کے مقابلہ میں ہے اوراس سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ کی نعمتوں سے دوسروں کے استفادہ کی نسبت راضی و خوشنود ہواور ان پر بلا اور مصیبت کا نازل ہونا اس کے لئے ناگوارہو۔ اس خیر خواہی کا لازمہ یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو اس بات کی طرف جس میں ان کے لئے خیر و صلاح ہے ہدایت کرے۔

حضرت امام جعفر صادق ـ پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''لوگوں میں سب سے زیادہ خداکے نزدیک قیامت کے دن عظیم انسان وہ ہے جو خلق کی خیر خواہی میں دوسرے افراد سے زیادہ قدم اٹھائے[2]''۔

اسی طرح پیغمبر اکرم نے فرمایا ہے: ''لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار وہ انسان ہے جس کا دل تمام مسلمانوں کی نسبت سب سے زیادہ پاک و صاف ہو[3]'' جب رسول خدا ﷺ سے لوگوں کی نصیحت اور خیر خواہی کی علامت کے بارے میں پوچھا گیا

---

[1] کلینی، کافی، ج٢، ص ١٢٥ ح ٥۔ اسی طرح ملاحظہ ہو کافی، ص١٢٧ ح ١٦ ؛ تفسیر عیاشی، ج١، ص ١٦٧، ح ٢٥۔
[2] کلینی، کافی، ج٢، ص ٢٠٨ ،ح ٥۔
[3] ایضاً، ص ١٦٣، ح٢۔

توآپ نے فرمایا: ''خیر خواہ انسان کی چار علامتیں ہیں: حق کے ساتھ فیصلہ کرنا اور اپنا حق دوسروں کو بخشنا، لوگوں کے لئے وہی پسند کرنا جو اپنے لئے پسند کرتا ہو، حق کے واسطے کسی کے ساتھ دست درازی نہ کرنا[1]''۔

دراصل چاروں علامتوں کو تیسری علامت میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی بنیاد پر حضرت علی ۔فرماتے ہیں: ''انسان کی خیر خواہی میں اتنا ہی کافی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے لئے پسند نہیں کرتا دوسروں کو بھی اس سے روکتا ہو[2]''۔

٢۔مومنین سے حسن ظن: حسن ظن، انصاف، کرم و بخشش اور مروت جیسے مفاہیم کا بھی خداوندعالم کی محبت کے علائم کے عنوان سے ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ یہ فضیلتیں حقیقت میں نصیحت اور خیر خواہی کی نشانی میں شمار ہوتی ہے لہٰذا حسن ظن کی طرف اشارہ کو اس مختصر کتاب میں کافی سمجھتے ہیں مومنین سے بد گمانی کی مذمت میں قرآن کریم فرماتا ہے: ''اے صاحبان ایمان، بہت سے گمانوں سے پرہیز کروکیونکہ کچھ گمان گناہ ہیں[3]''۔

واضح ہے ان گمانوں سے مراد کہ جن سے اجتناب لازم ہے ناروا گمان ہیں، یعنی سوء ظن (بد گمانی)۔ اسی طرح گمان سے اجتناب کرنے سے مراد اپنی بد گمانیوں پر ترتیب اثر نہ دینا ہے[4]۔

آیت کے استمرار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرآیت صرف مومنین سے بد گمانی کی مذمت سے متعلق نہ ہو، تب بھی کم از کم ان سے بد گمانی کی مذمت اور حقیقت میں مومنین کی نسبت حسن ظن آیت کی بعض مراد ہے۔

---

[1] حرانی، تحف العقول، ص ٢٠۔
[2] اردبیلی، ابولفتح، کشف الغمہ، ج٣، ص١٣٧، ١٣٨۔

[3] سورۂ حجرات، آیت ١٢۔
[4] طباطبائی ، المیزان، ج ١٨، ص ٣٢٣۔

امیرالمومنین حضرت علی ـ مومنین سے حسن ظن رکھنے کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اپنے بھائی کے عمل کو بہترین وجہ پر حمل کرو اس وقت تک جب تک کہ اس سے کوئی ایسا کام سرزد ہوجو توجیہ کی راہ بند کردے اور جب بھی کوئی بات تمہارے برادر (ایمانی) کے دہن سے نکلے تو جب تک اسکا بہترین معنی پاؤ بد گمانی نہ کرو[1]۔

پیغمبر اکرم ﷺ بھی حسن ظن کے نفسانی علائم کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اپنے ایمانی بھائیوں سے حسن ظن رکھو تاکہ دل کی پاکیزگی اور صفائے نفس تک حاصل کرو ''[2]بد گمانی کے جملہ تباہ کن اثرات میں غیبت، اختلافات کا ظاہر ہونا، بخل حسد ہے جن کو بحث کے تسلسل میں ان کے عوامل واسباب کو بیان کریں گے[3]۔

بد گمانی ایجاد کرنے کا سب سے اہم عامل تہمت کی جگہ اور الزام کے مقام پر واقع ہونا ہے۔ حضرت علی ـ ان لوگوں کی مذمت میں جو خود کو تہمت کی جگہ قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں: ''جو شخص کسی بری جگہ اور ٹھکانہ پر رفت و آمد کرے تو وہ متہم ہوجائے گا اور جو اپنے آپ کو مقام تہمت میں قرار دے تو اسے اس کو جو اس سے بد گمان ہوگیا ملامت نہیں کرنا چاہیے[4]''۔

اپنے سے دوسروں کی بد گمانی کو دور کرنے کا طریقہ حضرت علی ـ مالک اشتر سے بیان فرماتے ہیں '': اگر رعیت تمہارے بارے میں ظلم و ستم کا گمان کرے تو اپنے عذر کو ان کے درمیان آشکار طورپر بیان کرو اور ایسا کرکے ان کی بد گمانی دور کرو کہ اس میں تمہارے نفس کی تربیت بھی ہے اور رعیت کے ساتھ نرمی اور مدارا کا اظہار بھی اور وہ عذر خواہی بھی ہے جس کے ذریعہ تم انھیں حق کی راہ پر چلانے کا مقصد بھی حاصل کر سکتے ہو[5]،جی ہاں، ہمیشہ حسن ظن پسندیدہ اور محبوب نہیں ہے بلکہ کبھی بے موقع اور ناپسند بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایسے زمانے میں حسن ظن رکھنا جب کہ ظلم و فساد حق اور خیر وصلاح پر غلبہ رکھتا ہے اپنے آپ کو

---

[1] کافی ج۲، ص ۳۶۲، ح ۳۔نہج البلاغہ ، حکمت ۳۶۰ ۔ حرانی، تحف العقول، ص ۲۷۱ ۔
[2] گیلانی، عبد الرزاق، مصباح الشریعۃ، ص ۴۶۴۔
[3] الشریعۃ، ص ۴۶۳تا۴۶۷ ۔مجلسی، بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۲۰۱ ۔ صدوق، فقیہ، ص ۴۰۹، ح ۸۹ ۸ ۵۸۔
[4] نہج البلاغہ ، حکمت ۱۵۹۔ شیخ صدوق، امالی، ص ۲۵۰، ح ۸ ۔ کراجکی، کنز الفوائد ج۲، ص۱۸۲۔ حرانی، تحف العقول، ص ۱۵۷تا ۲۷۱۔
[5] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

دھوکہ دینے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، جیسا کہ حضرت علی ـ نے فرمایا ہے: ''اگر زمانہ اور اہل زمانہ پر برائی غالب آجائے اورکوئی دوسرے پر حسن ظن رکھے تو گویا اس نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے[1]''

دوسری جگہ دشمنوں سے حسن ظن رکھنے کی مذمت کے بارے میں مالک اشتر کو ہوشیار کرتے ہیں: صلح کے بعد اپنے دشمن سے مکمل طور پر چوکنا اور ہوشیار رہنا کیونکہ دشمن کبھی کبھی اپنے آپ کو تم سے اس لئے نزدیک کرتا ہے تاکہ تمہیں غافل بنادے لہٰذا دور اندیش اور محتاط رہو اور اپنے دشمن سے حسن ظن نہ رکھو[2]''۔

چار۔ خداوند سبحان سے دوستی کے موانعہاں پر خدا کی راہ میں موانع محبت سے مراد ایسے موانع ہیں جو خود نفسانی صفات میں سے ہیں اس طرح کے اہم ترین موانع، حسد، حقد اور کینہ توزی وغیرہ ہیں۔

ا۔ حسد: ارباب لغت کے نزدیک حسد، اس بات کا نام ہے کہ انسان دل میں کسی شخص کی ایسی نعمت سے محرومیت کی تمنا رکھتا ہو جس کا وہ استحقاق رکھتا ہو[3]۔

علماء اخلاق نے اس مفہوم کی مزید شرح میں زیادہ کہا ہے: حسد یعنی ایسی نعمت کے زوال کی آرزو کرنا جس سے استفادہ کرنے میں مسلمان شخص کی صلاح ہے۔ اس تعریف میں دو معتبر عنصر تصور کئے گئے ہیں: اول یہ کہ انسان دل میں دوسرے انسان سے نعمت کے زوال کی تمنا رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ اس نعمت سے اس کا مالا مال ہونا اس کے لئے مصلحت کا حامل ہو، لیکن اگر اس کی آرزو ایسی نعمت کا رکھنا ہو جس سے دوسرا انسان مالا مال ہے تو ایسی حالت کو ''غبطہ''اور ''منافسہ'' کہتے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم فرماتاہے: ''ان نعمتوں'' میں مشاقین کو چاہئے کہ ایک دوسرے پر سبقت کریں[4]''۔

---

[1] نہج البلاغہ ، حکمت ۱۱۴، اسی طرح ملاحظہ ہوکلینی کافی ج۵، ص ۲۹۸، ح۲ ؛ حرانی، تحف العقول، ص۳۰۲۔
[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔
[3] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ص۱۱۶۔

[4] سورۂ مطففین، آیت ۲۶۔

اور اگر ایسی نعمت کہ مسلمان شخص کے پاس سے جس کے زوال کی تمنا رکھتا ہو اور اس کا اس شخص میں ہونا صلاح نہ ہو، مثال کے طور پر اس کے فساد اور تباہی میں مبتلا ہونے کا باعث ہو تو ایسی حالت کو ''غیرت '' کہتے ہیں[1] اس لحاظ سے ''غبطہ'' ''منافسہ'' اور غیرت '' بااہمیت نفسانی حالات ہیں اور صرف'' حسد '' کہ جو دوسروں کی نصیحت اور خیر خواہی کے مقابلہ میں آتا ہے وہ اخلاق کی برائی میں شمار ہوتا ہے۔

البتہ حسد اور خیر خواہی کے درمیان تشخیص یقین یا اطمینان کے ساتھ افراد کی واقعی مصلحت شناخت پر موقوف ہے اور جب بھی ایسی شناخت کا حصول ممکن نہ ہو تو انسان کو چاہیے کہ صرف دوسروں کی واقعی مصلحت کی تمنّا پر اکتفاء کرے اور اس نعمت کی نسبت کوئی موقف نہ رکھتا ہو۔

روایات میں حسد کی متعدد علامتیں بیان کی گئی ہیں جیسے غیبت، شماتت، دوستی کا اظہار، دشمنی کا پوشیدہ کرنا، احسان کے مقابل ناشکری اور اہلیت و شائستگی سے کم تعریف کرنا وغیرہ ۔ کہ ہم اختصار کی رعایت کرتے ہوئے اس کی تفصیل سے صرف نظر کرتے ہیں۔

لفظ ''حسد ''قرآن کریم میں پانچ بار مختلف صورتوں میں ذکر ہوا ہے کہ سب ہی صریحی طور پر یا اشارہ کے طور پر حسد کی مذمت پر دلالت کرتے ہیں۔

جیسا کہ خدا پیغمبر ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ تمام برائیوں با لخصوص ان کے بعض خاص مصادیق جیسے حاسدین کے حسد سے خدا کی پناہ مانگو: ''کہو: ''میں صبح کے رب کی پناہ مانگتا ہوں جو کچھ اس نے خلق کیا ہے اس کے شر سے ....اور ہر حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے [2]''۔

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص۱۹۲؛فیض کاشانی، المحجۃ البیضا ء، ج۵، ص ۳۳۰۔
[2] سورۂ فلق، آیات، ۱، ۲، ۳۔

اسی طرح بارہا کافروں کو پیغمبر اکرم ﷺ، وحی اور دینی معارف جیسی نعمتوں سے مسلمانوں کے مالامال ہونے کی نسبت ان کے حسد کرنے کی وجہ سے سرزنش کرتا ہے ''یا وہ ان لوگوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ خدا نے اپنے فضل سے انھیں عطا کیا ہے[1]''۔

۴۔ قرآن مجید کے بقول کفار مومنین سے حسد کی شدت کی بنا پر آرزو کرتے ہیں کہ مومنین کو ان کے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پلٹا دیں: ''بہت سے اہل کتاب جب کہ ان پر حق واضح ہو چکا ہے، اس حسد کی وجہ سے جو ان کے اندر پایا جاتا ہے آرزو کرتے تھے کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر بنا ڈالیں[2]''۔

پیغمبر اکرم ﷺ خبر دیتے ہیں کہ خداوند عظیم نے موسیٰ ۔ سے فرمایا: ''اے عمران کے فرزند! جو کچھ میں نے لوگوں کو اپنے فضل سے دیا ہے اس پر حسد نہ کرو اور اس کے پیچھے اپنی نگاہ کو دراز نہ کرو اور اس کے چکر میں اپنا دل نہ الجھاؤ کیونکہ میری نعمت سے حسد کرنے والا غمگین رہتا ہے اور جو تقسیم میں نے اپنے بندوں کے درمیان کی ہے اس میں حائل ہوتا ہے لہٰذا جو ایسا ہوگا وہ مجھ سے نہیں ہے اور میں اس سے نہیں ہوں[3]۔

حسد کے نقصان دہ اور خطرناک علائم روایات میں بیان کئے گئے ہیں، جیسے لذت کی کمی، حاسدوں کے سکون و اطمینان اور اس کی راحت و خوشی کا سلب ہونا، اس کی آہ و حسرت درد و رنج کی کثرت حتیٰ کے جسمانی سلامتی اور قوت کا کھو دینا، اس کے دین و ایمان کا نابود ہونا اس کے علاوہ اخروی مقامات اور سعادت کا ضائع ہو جانا۔

---

[1] سورۂ نساء، آیت ۵۴؛ اسی طرح ملاحظہ ہو طباطبائی، المیزان، ج۴، ص۳۷۶۔

[2] سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۹۔

[3] کلینی کافی، ج ۲، ص۳۰۷، ح۶۔

علماء اخلاق نے حسد کے درجات و مراتب درج ذیل عنوان سے بیان کئے ہیں :

۱۔ یہ کہ انسان دوسرے سے نعمت کے زائل ہونے کی تمنا و آرزو دل میں رکھتا ہو، خواہ وہ نعمت اس کے ہاتھ نہ لگے ۔ یہ حسد کی بد ترین قسم ہے۔

۲۔ دوسرے سے نعمت زائل ہونے کی خواہش خود اس تک پہونچنے کیلئے۔ مثال کے طور پر وہ خاص مرتبہ تک پہنچنا چاہتا ہے اور چونکہ اس کا اس مرتبہ تک پہونچنا دوسرے سے اس کے سلب پر موقوف ہے لہٰذ وہ اس کے دوسرے سے زائل ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ درج ذیل آیت اسی طرح کے حسد کی ممانعت پر دلالت کرتی ہے: ''خبردار! جو کچھ خدا نے تم میں سے بعض کو بعض سے زیادہ دیا ہے اس کی آرزو نہ کرنا[۱]''۔

۳۔ اس نعمت کے مشابہ جو کسی دوسرے کے پاس ہے طلب کرے اور اگر خود اس نعمت تک نہ پہونچ سکے تو چاہے کہ دوسرے سے بھی سلب ہو جائے اور اگر دوسرے سے اسی نعمت کو سلب کر سکتا ہو تو اس کے لئے کوشش کرے۔

۴۔ وہی تیسری صورت، اس فرق کے ساتھ کہ اس کی عقل و دین کی قوت اس بات سے مانع ہوتی ہے کہ دوسرے سے اس نعمت کے سلب کرنے کا اقدام کرے اور اپنی اس نفسانی حالت سے (یعنی دوسرے سے نعمت کے سلب کرنے کی تمنا سے) ناراض اور غمگین ہے، یہ نفسانی حالت اگر چہ ناپسند ہے، لیکن عذاب خداوندی کا باعث نہیں ہوگی اور ایسے انسان کی نجات کی امید پائی جاتی ہے[۲]۔

---

[۱] سورۂ نساء، آیت ۳۱۔
[۲] نراقی، محمد مہدی ، جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۹۸، ۱۹۹۔ ۲۰۲۔ زخرف ، ۳۱۔

حسد کے اہم عوامل و اسباب مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ نفسانی پستی اور گندگی جس کے نتیجہ میں بغیر اس کے کہ کوئی خاص دشمنی اس کے اور دوسروں کے درمیان ہو دوسروں سے نعمت کے زوال پر خوش اور نعمت خدا وندی سے ان کے فیضیاب ہونے پر محزون و مغموم اور دوسروں کے درد والم، رنج و غم میں مبتلا ہونے سے خوش ہے، اگر چہ ان کے مالا مال ہونے سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا ۔

۲۔ دشمنی اور بغض حسد کے وسیع ترین عوامل میں سے ہے، کیونکہ خدا کے خاص دوستوں کے علاوہ تمام لوگ اپنے دشمن کے پریشانی میں مبتلا ہوجانے پر شاد و مسرور ہوجاتے ہیں۔

۳۔ ریاست طلبی اور مال و منصب سے لگاؤ، جو شخص دوست رکھتا ہے کہ اپنے فن میں منفرد جیسے شجاعت، عبادت اور اس کے مانند دوسری چیزوں میں یکتا اور قابل مدح و ستائش رہے، جب وہ اپنے لئے کوئی رقیب اور نظیر دیکھتا ہے تو اس کے لئے ناگوار ہوتا ہے، اور یہی چاہتا ہے کہ کسی صورت اس کے رقیب سے نعمت سلب ہوجائے۔

۴۔ اہداف و مقاصد تک نہ پہنچنے کا خوف، ایسی جگہ جہاں بہت سے افراد ایک ہی ہدف کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ صرف اس ہدف تک پہنچے۔

۵۔ اپنے ہم پلّہ اور ہم پیشہ افراد کی برتری کا تحمّل نہ کرنا، کیونکہ احساس کرتا ہے کہ اگر اس کا ہم پلّہ فوقیت لے جائے گا تو اس پر فخر و مباہات کرتے ہوئے اس کی تحقیر و توہین کرے گا ۔ اس بنا پر کہ سب ایک دوسرے کے برابر ہوں اور کوئی دوسرا اس پر تکبر نہ کرے، اپنے ہم پلّہ سے حسد کرتا ہے۔

٦۔ تکبر: حاسد انسان چاہتاہے کہ دوسروں پربزرگی جتائے اور دوسرے لوگ اس کے پیرو اور تابع رہیں، چونکہ نعمت خدا وندی سے دوسروں کا فیضیاب ہونا اس تشویش کو اس کے اندر ابھارتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا بہرہ مند ہونا اس کے تہی دست ہونے

کا باعث ہوجائے، جیسا کہ کفار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کہتے تھے: ''کیوں یہ قرآن ان دونوں شہروں (مکہ ومدینہ) کے کسی بڑے شخص پر نازل نہیں ہوا؟''

۷۔ دوسروں کے عظیم نعمتوں سے فیضیاب ہونے کی توقع نہ کرنا: اور اس پر حیرت کرنا یعنی انسان کو اس لائق نہیں سمجھنا کہ اس طرح کی عظیم نعمتوں سے وہ بہرہ مند ہو، نتیجہ کے طور پر اس سے حسد کرتا ہے[1] جیسا کہ مشرکین پیغمبر سے کہتے تھے: ''تم ہمارے جیسے انسان کے سوا کچھ نہیں ہو[2]''۔

رہا سوال یہ کہ ہم کس حد تک اپنے سے حسد کو دور رکھیں، اس کا جواب یہ ہے کہ حسد کبھی انسان کے قول و فعل سے غیبت اور تہمت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی انسان کی رفتار وگفتار سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اپنے دل میں خواہش رکھتا ہے کہ دوسرے سے نعمت زائل ہوجائے۔ بلا شبہہ دونوں گناہ شمار ہوتے ہیں اور اس سے مقابلہ کرنا واجب ولازم ہے لیکن کبھی حسد کے علائم انسان کی گفتار و کردار سے ظاہر نہیں ہوتے اور انسان بھی اپنے اندر دوسروں سے زوال نعمت کے متعلق پائی جانے والی نفسانی خواہشات کی مذمت و ملامت کرتا ہے۔ اس قسم کا حسد گناہ شمار نہیں ہوتا اور عقاب کا باعث نہیں ہے، اگر چہ اس سے مقابلہ بھی نیک اور معنوی بلندی کا باعث ہے[3]۔

۲۔ حقد اور کینہ توزی: ''حقد وکینہ'' کینہ سے مراد ہے دل میں دوسرے کی عداوت ودشمنی رکھنا اور اس کے ظاہر کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہنا[4] در حقیقت حقد، وہ خشم وغضب ہے کہ جو ظاہر نہیں ہو پاتا ہے اور دل میں دب کر رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن موقع پاکر ظاہر ہو جائے[5] بلا شبہہ حقد نفسانی رذائل میں سے ایک رذیلت اور خداوند سبحان سے دوستی کے موانع میں سے ایک مانع ہے۔ معصومین ؑ کے گہر بار کلمات میں کینہ توزی، اس کے علائم و اسباب اور اس سے نجات کے بارے میں بہت

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۹۹تا ۲۰۲۔
[2] یس، ۱۵ ۔مومنون، ۳۴، ۴۸۔
[3] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۲۱۰ ، ۲۱۱۔
[4] ابن منظور، لسان العرب، ج ۳، ص ۱۵۴
[5] نراقی، جامع السعادات، ج ۱، ص۳۱۱۔

سے ارشادات بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت علی ۔ نے حقد و کینہ توزی کی مذمت میں فرمایا ہے: لہٰذا اپنے دلوں میں مخفی آتش تعصب کو خاموش کردو اور جاہلیت کے کینوں کو نکال پھینکو کہ مسلمانوں میں اس غرور کا ہونا شیطانی خصلتوں میں سے ہے[1]''

٦۔ ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا: ''کیا میں تمہیں تم میں اپنے سے سب سے کم شباہت رکھنے والے انسان سے آگاہ نہ کروں؟ انہوں نے عرض کی: کیوں نہیں، فرمایا: بدگو، بے آبرو، بے حیا، بخیل، متکبر، کینہ توز، حاسد، سنگدل، ایسا انسان جس سے کوئی خیر نہیں ہوتا اور کوئی اس کے شر سے محفوظ نہیں ہے[2]''۔

حضرت علی ۔ سے کینہ توزی کے عوامل و اسباب کے بارے میں منقول ہے: ایسے انسان کے پاس علم بیان کرنے سے پرہیز کرو جو اس کا شوق نہیں رکھتا نیز گذشتہ مرتبہ و شرف کے بیان سے پرہیز کرو ایسے انسان کے پاس جو ماضی میں کوئی افتخار آمیز چیز نہیں رکھتا تھا اس لئے کہ یہ امر تیری نسبت اس کی کینہ توزی کا سبب ہوگا[3]۔

حقد و کینہ توزی کے علائم کے بارے میں حضرت امام حسن عسکری ۔ نے فرمایا: ''لوگوں میں سب سے زیادہ رنجیدہ اور سب سے کم آسودہ کینہ توز انسان ہے[4]''۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں: ''خداوند عالم ہر روز ایک فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ آسمان پر آواز لگائے اور میرے بندوں کو نوید دے کہ میں نے تمہارے گذشتہ گناہوں کو بخش دیا اور شب قدر میں تم میں سے بعض کو بعض کا شفیع قرار دیا جز اس انسان کے جو شراب سے افطار کرے یا اپنے مسلمان بھائی سے کینہ توزی کرے[5]۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲۔
۵کلینی، کافی، ج ۲، ص ۱ ۹ ۲،ح۹۔

[3] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۲۰، ص ۳۲۲، ح ۹۶ ۶نیز ،ص۳۲۷، ح۷۴۳۔
[4] حرانی، تحف ا العقول، ص ۳۶۳۔
[5] قطب راوندی، دعوات، ص ۳۰۷، ح۵۶۱۔

حقد کے دنیوی نقصانات میں ایک یہ ہے کہ کینہ توز انسان کی گواہی قابل قبول نہیں ہے[1] حقد اور کینہ توزی سے مقابلہ اس درجہ اہم ہے کہ قرآن کریم بعض مومنین کے قول کو نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ اپنی دعاؤں میں خداوند عالم سے اظہار کرتے ہیں: ''خدا یا! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان میں ہم پر سبقت رکھتے ہیں بخش دے اور ہمارے دلوں میں صاحبان ایمان کی نسبت کسی طرح بھی کینہ قرار نہ دے، خدا یا یقیناً تو روؤف و مہربان ہے[2]''۔

وہ تمام چیزیں جو کینہ توزی کے بر طرف کرنے کا سبب ہیں، ان میں سے ایک ہدیہ دینا ہے پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ہدیہ دینا دلوں سے کینوں اور کدورتوں کو دور کر دیتا ہے[3]'' اسی طرح ضیافت اور مہمانداری کرنا کینہ کے بر طرف ہونے کا سبب ہوتا ہے، حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں: ''کینوں کی آگ کو گوشت اور روٹی سے دور کرو'' (مہمان نوازی کرکے اسے ختم کرو)[4]۔

دو۔خدا وند سبحان کے لئے دشمنی خدا وند سبحان کے لئے دشمنی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس انسان کو جو خدا کے سامنے عصیان وگناہ، طغیانی و سرکشی کرتا ہے دشمن رکھے۔

البتہ جس طرح خدا کی معصیت کے درجات و مراتب ہیں اسی طرح خدا کے لئے دشمنی کے بھی درجات مراتب ہیں۔ خدا کے مقابل سرکشی کبھی عقیدہ کے ساتھ ہے جیسے کفر و شرک اختیار کرنا اوردین میں بدعت کرنا اور کبھی رفتار وگفتار اور کبھی قول وفعل کے ساتھ دوسروں کی اذیت وآزار سے جڑی ہوتی ہے، جیسے قتل، ضرب، زخم لگانا جھوٹی گواہی دینا۔

اور کبھی دوسروں کی اذیت وآزار کا باعث نہیں ہوتی۔ یہ قسم کبھی دوسروں کے فساد کا باعث ہوتی ہے، جیسے دوسروں کے لئے فساد کے اسباب و وسائل فراہم کرنا، اور کبھی دوسروں کے فساد کا باعث نہیں بنتی۔ یہ آخری قسم کبھی گناہ کبیرہ ہے تو کبھی گناہ

---

[1] صدوق، معانی الاخبار، ص ۲۰۸، ح ۳۔
[2] سورۂ حشر، آیت ۱۰۔
[3] صدوق، عیون اخبارالرضاؑ، ج ۲، ص ۷۳، ح ۳۴۳ ۔ کلینی، کافی، ج ۵، ص ۱۴۳، ح ۷۔
[4] کلینی، کافی، ج ۶، ص۳۱۸، ح ۱۰۔

صغیرہ ہے دشمنی بھی مختلف طرح کی ہوتی ہے جیسے دوری اختیار کرنا، جدا ہونا، بات چیت بند کرنا، سخت کلامی کرنا، توہین و تحقیر کرنا، اس کی پیروی نہ کرنا، اس کے لئے برائی کی کوشش کرنا اور اس کی ضرورتوں اور آرزوؤں کے پورا نہ ہونے کی سعی کرنا۔

واضح ہے کہ خدا کے لئے بغض کے درجات و مراتب شدت و ضعف کے اعتبار سے خدا وند سبحان کی معصیت کے مراتب و درجات کے تابع ہیں، کہ در حقیقت وہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مراتب ہیں۔ قابل ذکر بات ہے کہ اگر گناہگا ر انسان پسندیدہ صفات کا مالک ہو جیسے علم و سخاوت، تو پسندیدہ صفات کے لحاظ سے محبوب ہے لیکن خدا کی نافرمانی اور عصیان کی بنا پر مبغوض اور نا پسند ہے[١]۔

اس بنا پر بعض لوگوں سے محبت کرنا حرام اور بعض دیگر سے مکروہ اور خدا کے نزدیک نا گوار ہے یعنی ان سے بغض رکھنا واجب یا مستحب ہوگا[٢]۔

---

[١] نراقی، محمد مہدی، جا مع السعادات، ج ٣، ص ١٨٧، ١٨٨۔

[٢] ان موارد کی مزید معلومات کے لئے رجوع کیجئے سورۂ مجادلہ، آیت ٢٢۔ سورۂ ممتحنہ، آیت ١، ٨، ٩ ۔سورۂ آل عمران، آیت ١١٩ ۔ سورۂ ہود، آیت ١١٣ ۔ صفات الشیعہ، ص ٨٥، ح ٩۔ صدوق، امالی، ص ٧٠٢ ح ٩٦٠۔ مجلسی، بحار الانوار، ج ٦٩، ص ٧ ٢٣، ح ٣.ج ٧٤، ص ١٩٧، ح ٣١۔ اور ج ٩ ۶، ص ٢٣٧، ح ٣ ۔ کلینی، کافی، ج ٢ ص، ١٢۶، ح ١١، ج ۵ ص ١٠٨، ح ١٢ ۔ ابن ابی فراس، تنبیہ الخواطر، ج ١، ص ٧٢۔ شعیری، جامع الاخبار، ص ۴٢٨، ح ١١٩٨ ؛ صدوق، فقیہ، ج ۴، ص ١٧ ۴، ح ۵٩٠٧ ؛ تفسیر قمی، ج٢، ص٢٨٧۔

چوتھی فصل

مؤثر نفسانی صفات نفس کو قابو میں رکھنے والے رجحان

نفس کو قابو میں رکھنے والے رجحان سے مراد وہ نفسانی صفات اور ملکات ہیں جو بہت سے اخلاقی رذائل سے روکنے کا کردار ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف متعدد اخلاقی فضیلتوں کی راہ ہموار کرتے ہیں،اس قسم میں ممتاز نفسانی صفات درج ذیل ہیں :

۱۔ **نفس کی قوت** ایک ایسا نفسانی ملکہ ہے جو انسان کو اس بات کی قدرت بخشتا ہے کہ پیش آنے والے حوادث خواہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں آسانی سے تحمل کر سکے۔ قوت نفس کی فضیلت و عظمت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ خدا وند عالم قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے: ''عزت خدا، پیغمبر خدا صلى الله عليه وآله وسلم اور مومنین ہی کے لئے ہے[۱]''۔

حضرت امام جعفر صادق ـ نے اس سلسلہ میں فرمایا: ''خدا وند عالم نے مومنین کے تمام امور اس کے حوالے کر رکھے ہیں، لیکن اس نے اجازت نہیں دی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و خوار کردے۔ آیا خدا وندعالم کا یہ کلام نہیں دیکھتے کہ اس نے فرمایا ہے: ''وللہ العزۃ و لرسولہ وللمومنین'' (عزت اللہ،اس کے رسول اور مومنین ہی مخصوص ہے) لہٰذا سزاوار ہے کہ مومن با عزت ہو، ذلیل نہ ہو''[۲]۔

ایک قوت نفس کے فوائد نفسانی قوت وقدرت، نفس پر بہت سے سود مند و مفید اثرات و نتائج چھوڑتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک خود بھی نفسانی ملکہ اس کے مقابلہ نفس کیضعیف ہونے سے بہت سے اخلاقی رذائل مرتب ہوتے ہیں۔ ذیل میں انسان کی روحی عظمت فوائد کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

---

[۱] سورۂ منافقون، آیت ۸۔
[۲] کلینی، کافی، ج ۲۔

الف۔ ثبات اور اطمینان (عدم اضطراب) :ثبات ایک ایسا نفسانی ملکہ ہے جو انسان کو اس بات کی قدرت عطا کرتا ہے کہ خطروں میں پڑ کر مشکلات اور رنج والم کی سختیوں کا ،خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، مقابلہ کرے،بغیر اس کے کہ اس میں ذرہ برابر بھی شکستگی پیدا ہو۔ اس کے مقابل مشکلات وخطرات کے وقت اضطراب، تزلزل ہے۔

ثبات وپایداری کے گونا گوں مظاہر پائے جاتے ہیں کہ ان میں سب سے نمایاں شکوک وشبہات کے مقابل ایمان میں پایداری اور ثبات ہے۔ قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے: '' خدا وندعالم صاحبان ایمان کو دنیوی اور اخروی زندگی میں محکم واستوار سخن سے ثابت وپایدار بناتا ہے[1] ''۔

واضح ہے کہ ایمان میں ثبات اور عدم تزلزل تمام اہم نفسانی رجحانات کی پایداری وثبات کا مقدمہ ہے۔ یہ امر خود بھی عمل صالح انجام دینے میں پایداری وثبات کاباعث ہوگا۔ثبات وپایداری معرفت کا نتیجہ ہونے کے ساتھ ساتھ روح کی قوت وعظمت کا بھی نتیجہ ہے جوکہ اہم نفسانی فضائل میں سے ایک ہے[2]۔

ب۔ بلند ہمتی: یعنی کمال و سعادت کے حصول اورعالی ترین امور تک پہنچنے کے لئے اس طرح سے کوشش کرنا کہ ان تک پہنچنے کی راہ میں دینوی نفع ونقصان کی طرف توجہ نہیں دے۔ بلند ہمت افراد کو دنیوی منافع شاد و مسرور اور اس کے نقصانات غمگین ومحزون نہیں کرتے حتی کہ بلند اہداف تک پہنچنے میں موت اور قتل کئے جانے کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

اس کے مدمقابل کوتاہی اورپست ہمتی ہے کہ پست ہمت شخص بلند اہداف کی طلب میں کوتاہی کرتا اور صرف پست اور معمولی امور پر قناعت کرتا ہے یہ نفسانی صفت خود ہی روح کی عظمت وقوت کا نتیجہ ہےاوربلا شبہہ نفسانی فضائل میں سے ایک ہے، کیونکہ قابل قدر

[1] سورۂ ابراہیم، آیت ۲۷۔
[2]۔ نراقی، محمد مہدی، جا مع السعادات، ج ۱، ص ۲۶۲۔

اوربلند انسانی اہداف تک رسائی بلند ہمتی اور عظیم جد و جہد کے بغیر میسر نہیں ہے، شہامت (شجاعت) جوکہ خود ایک با اہمیت نفسانی ملکہ ہے، اسے بلند ہمتی کے مصادیق میں شمار کیا گیا ہے[1]۔

ج۔ غیرت وحمیت: یعنی جس چیز کی حفاظت لازم ہے اس کی پاسداری و محافظت کی کوشش کرنا، یہ حالت روح وشہامت کی قوت و عظمت کے نتائج میں سے ایک ہے۔ حضرت امام جعفر صادق ۔ نے فرمایا ہے: ''خدا وند تبارک و تعالی غیرت مند ہے اور ہر غیرت مند کو دوست رکھتاہے اس کی غیرت مندی ہی ہے کہ اس نے برائیوں کو خواہ ظاہر ہوں یا پنہاں، حرام کیا ہے[2]''۔ حضرت علی ۔ نے بھی فرمایا ہے : ''نسان کی قدر وقیمت اس کی ہمت کے اعتبار سے ہے .....اور اس کی دلیری اس کے ننگ رکھنے کے بقدر ہے (پستیوں اور رذالتوں کو تسلیم کرنے کے اعتبار سے) ،اور اس کی پاکدامنی اس کی غیرت کے بقدر ہے[3]''۔ علماء اخلاق نے غیرت کے متعدد مقامات اور موارد ذکر کئے ہیں اور چونکہ بعض اخلاقی نصوص اس کے خاص موارد کی طرف ناظر ہیں لہٰذا بہتر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

ا۔ دین میں غیرت: دین میں غیرت کا لازمہ یہ ہے کہ بدعتوں اوراہانتوں کے مقابل دین کے تحفظ کی کوشش کریں، اور شبہہ ایجاد ہونے کی صورت میں اس کا شائستہ انداز میں دفاع کریں۔ دین کے احکام کی نشرو اشاعت کے لئے میں کوشاں رہیں اورامربہ معروف ونہی عن المنکر کرنے میں تساہلی سے کام نہ لیں۔

۲۔ ناموس کے لئے غیرت: اسلام کے اخلاقی نصوص میں مردوں کو ایسی غیرت مندی کی طرف شدت کے ساتھ ترغیب دلائی گئی ہے اور ان کا یہ فریضہ بیان کیاگیا ہے اور جو انسان ایسی غیرت کا مالک نہیں ہے اس کی سختی کے ساتھ مذمت ہوئی ہے۔

---

[1] ایضاً، ج۱، ص ۲۶۳، ۲۶۴۔
[2] کلینی، کافی، ج ۵، ص ۵۳۵، ح ۱۔
[3] کلینی، کافی، ج۵، ص ۵۳۷، ح ۸۔

حضرت امام جعفر صادق ـ نے فرمایا: ''بے حس اور بے غیرت مردوں پر بہشت حرام کر دی گئی ہے[1]''۔

اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بہشت کی خوشبو پانچ سو سالہ راہ کے فاصلہ سے انسان کے مشام تک پہنچے گی لیکن نا خلف اولاد اور بے حس و بے غیرت انسان اسے سونگھ نہیں سکتا[2]''۔

امام محمد باقر ـ نقل کرتے ہیں: اسیروں کے ایک گروہ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لایا گیا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دستور دیا کہ ان کے درمیان ایک شخص کو آزاد اور باقی کو قتل کر دیا جائے ۔ آزاد شدہ شخص نے سوال کیا: آپ نے مجھے کیوں آزاد کر دیا ؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: جبرئیل نے خدا کی طرف سے مجھے خبر دی ہے کہ تم میں پانچ ایسی خصلتیں پائی جاتی ہیں جنھیں خدا اور اس کا رسول دوست رکھتا ہے اپنی ناموس کے سلسلہ میں غیرت مند، جود و سخا، خوش اخلاقی، قول میں صداقت اور شجاعت۔

وہ انسان اس بات کے سنتے ہی مسلمان ہو گیا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہا یہاں تک کہ ایک غزوہ میں درجہ شہادت پر بھی فائز ہوا[3]''۔

یہ بات مخفی نہ رہے کہ ناموس کے سلسلہ میں حد سے زیادہ غیرت دکھانا ہرگز پسندیدہ نہیں ہے بلکہ بعض اوقات فساد کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ غیرت کا مقام وہاں ہے جہاں حرام کے ارتکاب کا یقین ہو یا انسان کو مقام تہمت و بد گمانی میں واقع ہونے کا خطرہ ہو۔ حضرت علی ـ اپنے فرزند امام حسن ـ کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''بے جا غیرت سے پرہیز کرو کہ یہ چیز صحیح و سالم عورت کو بیمار بنا دے گی اور پاکدامن کو بد گمانی (اور گناہ کی فکر) میں ڈال دے گی[4]۔

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۴۷، ۳۰۵۔
[2] صدوق، فقیہ، ج۳، ص ۴۴۴، ح ۴۵۴۲۔
[3] حر عاملی، وسائل الشیعہ، ج ۲۰، ص ۱۵۵۔
[4] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

۳۔ اولاد کے سلسلہ میں غیرت: اولاد کے سلسلہ میں غیرت کا مطلب یہ ہے کہ آغاز طفولیت سے ہی ان کی مادی ضرورتوں کو پوراکرنے کے لئے حلال راستوں سے کوشش کرے۔ ان کی صحیح تربیت کرنے کے لئے کوشاں رہے اور ایسے خطرات سے اولاد کی حفاظت کرے جو ان کی جسمانی یا اخلاقی صحت و سلامتی کے لئے چیلنج ہوں۔

۴۔ مال کے سلسلہ میں غیرت: اس میں کوئی شک نہیں کہ مال دنیا میں انسان کی بقا کا ضامن نیز علم و عمل اور اخروی سعادت کی تحصیل کا وسیلہ ومقدمہ ہے۔ اس وجہ سے ہر عاقل پر لازم ہے کہ اس کی تحصیل کے لئے جائز و مشروع راستوں سے کوشش کرے اور اس کی محافظت ونگہداری کے سلسلہ میں اپنی غیرت کا مظاہرہ کرے۔

مال کے متعلق غیرت دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی کے علاوہ کسی اور راہ میں ضایع نہ کرے، خود نمائی اور دکھاوے میں خرچ نہ کرڈالے، اسے بے نیازوں کے حوالے نہ کردے، اس کے خرچ کرنے اور بخشش کرنے کے سلسلہ میں اسراف کا راستہ نہ اپنائے[1]۔

د۔ وقار اور قلبی سکون: اخلاقی لغت میں ''وقار'' رفتار و گفتار اور حرکات میں پائے جانے والے سکون و اطمینان کا نام ہے۔ اس وجہ سے ''وقار'' ایک ایسا عام مفہوم ہے جو ''تأنی'' اور ''توقف'' دونوں کو شامل ہوتا ہے؛ اس لئے کہ ''توقف'' ہر طرح کے اقدام سے پہلے لمحہ فکریہ اور اپنے اوپر کنٹرول کرنے کا نام ہے تاکہ اس اقدام کا درست ہونا انسان پر آشکار ہوجائے۔ ''تأنی'' گفتار ورفتار کے شروع ہونے کے بعد ذہنی سکون و اطمینان کا نام ہے تاکہ امور کو شائستگی کے ساتھ مرحلہ انجام تک پہنچا سکے۔

وقار اور قلبی اطمینان وسکون کے درمیان نسبت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب بھی کوئی انسان رفتار و گفتار میں زحمت و تکلف

---

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۱، ص ۲۶۵، ۲۷۴۔

کے ساتھ سکون کو حاکم قرار دے تو ایسے انسان کو با وقار کہتے ہیں، لیکن قلبی سکون و اطمینان اس وقت حاصل ہوگا جب سکون ایک صفت اور ملکہ کی صورت میں نفس کے اندر موجود ہو۔ بعبارت دیگر وقار ظاہری سکون اور سکینہ باطنی سکون کو کہتے ہیں[۱]۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وقار کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اسلام عریاں ہے اور اس کا لباس حیا اور اس کا زیور وقار ہے[۲]''۔

حضرت علی ۔ پرہیزگاروں کی خصوصیت کے بارے میں فرماتے ہیں: ''وہ لوگ زلزلوں (سختیوں) میں ہیں[۳]''۔ حضرت امام جعفر صادق ۔ اس گراں قیمت صفت کی تحصیل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''طلب علم کی کوشش کرواور اس کے ساتھ ساتھ خود کو حلم و وقار سے آراستہ کرو[۴]''۔

قرآن قلبی سکون و اطمینان کو مومنین کے صفات میں شمار کرتا ہے اور اس کی تحصیل کی راہ خداوند عالم کی یاد کو جانتا ہے۔ ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل یاد الٰہی سے مطمئن ہیں، آگاہ ہو جاؤ کہ یاد الٰہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے[۵]''۔

خداوند عالم متعدد مقامات پر اعلان کرتا ہے کہ ہم نے سکون و اطمینان کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے دلوں پر نازل فرمایا ہے۔ ''وہ ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کیا تاکہ وہ اپنے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ کریں[۶]''۔

---

[۱] جامع السعادات، ص ۲۷۹ ،۲۸۰۔ ابو ہلال عسکری ؛ معجم الفروق اللغۃ، ص۲۸۰ ؛ المیزان، طباطبائی، ج۹، ص۷ ۲۲تا ۳ ۲۲۔ اورج۲، ص۲۸۹تا ۲۹۱۔

[۲] کلینی، کافی، ج۲، ص ۴۶، ح۲۔

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳۔ اسی طرح ملاحظہ ہو: صدوق، فقیہ، ج ۴، ص۳۵۴، ح ۵۷۶۲۔

[۴] کلینی، کافی، ج ۱، ص ۳۶، ح۱۔

[۵] ۔ سورۂ رعد، آیت ۲۸۔

[۶] سورۂ فتح، آیت ۴، نیز ملاحظہ ہو آیات ۱۸، ۲۶ ؛ طباطبائی، المیزان، ج ۲ ص ۲۸۹تا ۲۹۱ اور ج ۹، ص۲۲۳تا ۲۲۷۔

واضح ترین اسباب و علل جو وقار کے حصول کے لئے روایات میں بیان ہوئے ہیں مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ خدا وند عالم کی بندگی: حضرت علی ۔ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: جو شخص خاندان اور قبیلہ کے بغیر عزت، سلطنت کے بغیر ہیبت، مال کے بغیر بے نیازی اور جود و بخشش کے بغیر فرمانبرداری کا طالب ہو تو اسے چاہیے کہ خدا کی نافرمانی کی ذلّت سے نکل کر اس کی بندگی کی عزّت کی طرف آجائے[1]۔

۲۔ علم و حکمت: حضرت علی ۔اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''جو شخص حکمت سے آگاہ ہے اس کو نگاہیں ہیبت اور وقار کی نظر سے دیکھتی ہیں[2]''۔

۳۔ حلم: حضرت علی ۔سے منقول ہے: ''حلم وقار کا باعث ہے[3]''۔

۴۔ سکوت: حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''زیادہ خاموشی انسان کے وقار میں اضافہ کرتی ہے[4]'' نیز مومنین اور پرہیز گاروں کی خصوصیات کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''اے ہمام !مومن زیادہ سے زیادہ خاموش رہتا ہے اور باوقار ہوتا ہے[5]''۔

۵۔ تواضع و فروتنی: حضرت علی ۔ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''فروتنی تم پر بزرگی اور شان و شوکت کا لباس پہناتی ہے[6]''۔

اسی طرح روایات میں دوسرے اسباب جیسے آہستہ گفتگو کرنا[7] وغیرہ بیان ہوا ہے کہ اختصار کی وجہ سے انھیں ہم ذکر نہیں کررہے ہیں۔

---

[1] خزاز، قمی، کفایۃ الاثر، ص ۲۲۸ ؛ مجلسی بحار الا نوار، ج ۱ ۷، ص ۹ ۱۷، ح ۲۹۔
[2] ۔ کلینی، کافی، ج ۸، ص ۲۳، ح ۴، اور ملاحظہ ہو : صدوق، علل الشرائع، ج ۱، ص ۱۱۰، ح ۹ ؛ مجلسی، بحار لا نوار، ج ۱، ص ۱۱۷تا ۱۲۴۔
[3] آمدی، غرر الحکم، حکمت ۵۵۳۴۔
[4] کلینی، کافی، ج ۲، ص ۲۲۶، ح ۱۔
[5] ایضاً۔
[6] آمدی، غرر الحکم، ح ۴۱۸۴۔
[7] کافی، ج۵، ص۳۹،ح۴۔

آیات و روایات میں اطمینان قلب کے لئے بہت سے اسباب و علل بیان کئے گئے ہیں کہ ان میں سب سے اہم درج ذیل ہے :

۱۔ ازدواج: قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے: ''اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے جوڑوں کو تمہارے لئے خلق فرمایا تاکہ ان سے سکون حاصل کرواور تمہارے درمیان محبت ورحمت قرار دی۔ ہاں، اس (نعمت) میں صاحبان عقل و فکر کے لئے یقیناً نشانیاں ہیں[1] ''۔

دوسری جگہ فرماتا ہے: ''وہ ایسی ذات ہے جس نے تم کو ایک نفس سے خلق فرمایا اور اس سے جوڑے پیدا کئے تاکہ اس سے سکون حاصل کرو[2] ''۔

۲۔ عدالت: حضرت فاطمہ زہرا * فرماتی ہیں: ''خداوند عالم نے ایمان کو شرک دور کرنے کا ذریعہ...... اور عدالت کو دلوں کے سکون کا باعث قرار دیا ہے[3] ''۔

۳۔ایمان: حضرت امام جعفر صادق ۔نے فرمایا: ''کوئی مومن نہیں ہے مگر یہ کہ خداوندعالم اس کے ایمان کے نتیجہ میں اس کے لئے ایک انس قرار دیتا ہے کہ جس سے وہ سکون حاصل کرتا ہے، اس طرح سے کہ اگر وہ پہاڑ کی چوٹی پر بھی ہو تو اپنے مخالفین سے وحشت نہیں رکھتا[4] '' واضح ہے کہ اس سکون و اطمینان کا درجہ ایمان کے اعتبار سے ہے، جتنا ایمان کا درجہ زیادہ ہوگا اس سے حاصل شدہ سکون بھی زیادہ پایدار ہوگا۔

۴۔ خدا کی یاد :قرآن کریم میں مذکور ہے: '' وہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں اور ان کے دل یاد الٰہی سے مطمئن ہیں آگاہ ہوجائیں کہ یاد الٰہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے[5] ''۔

---

[1] سورۂ روم، آیت ۲۱۔
[2] سورۂ اعراف، آیت ۱۸۹۔
[3] صدوق، من لا یحضر الفقیہ،ج۳، ص۵۶۸،ح۴۹۴۰۔ علل الشرایع، ص۲۴۸، ح۲۔ طبرسی، احتجاج، ج۱،ص۱۳۴۔
[4] مجلسی، بحار لا نوار ج ۶۷، ص ۱۴۸، ح ۴۔
[5] رعد ، ۲۸۔

۵ ۔ حق تک پہنچنا: حضرت امام جعفر صادق ۔ نے فرمایا: ''انسان کا دل ہمیشہ حق کی تلاش و جستجو میں مضطرب اور پریشان رہتا ہے اور جب اسے درک کرلیتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے[1]''اس لحاظ سے شک وتردید کے علائم میں سے ایک اضطراب اور عدم سکون ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا ذہنی درد و الم ہے۔

اُن تمام مذکورہ موارد کا فقدان جو سکون و وقار کے اسباب و علل میں شمار کئے گئے ہیں ان دونوں کے تحقق کے موانع شمار ہوتے ہیں مگر چونکہ بعض دیگر امور روایات میں سکون و وقار کے موانع کے عنوان سے ذکر کئے گئے ہیں لہٰذا ذیل میں ان میں سے اہم ترین امور کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے :

ایک ۔ لوگوں سے سوال و درخواست کرنا: حضرت امام زین العابدین ۔ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''لوگوں سے سوال کرنا انسان کی زندگی کو ذلت وخواری سے جوڑ دیتا ہے، حیا کو ختم کردیتا اور وقار کو کم کردیتا ہے[2]''۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ نے فرمایا: ''فقیر انسان میں ہیبت و عظمت کا وجود محال ہے''۔

دو ۔ حد سے زیادہ ہنسنا اور ہنسی مذاق کرنا: حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''جو زیادہ ہنستا ہے اس کی شان و شوکت کم ہوجاتی ہے''۔ رسولخدا ﷺ فرماتے ہیں: ''زیادہ ہنسی مذاق کرنا انسان کی آبرو کو ختم کردیتا ہے[3]''۔

نیز حضرت علی ۔ سے وصیت فرماتے ہیں : ''ہنسی مذاق کرنے سے اجتناب کروکیونکہ تمہاری شان و شوکت اور عظمت ختم ہوجائے گی[4]''۔

---

[1] کلینی، کافی، ج ۲، ص۴۲۱، ح ۵۔

[2] مجلسی، بحار لا نوار، ج ۷۸، ص ۱۳۶، ح ۳و ج ۷۵، ص ۱۰۸۔

[3] کلینی، کافی، ج ۸، ص۲۲، ح ۴، اور ملاحظہ ہو حرانی، تحف العقول، ص ۹۶۔

[4] صدوق، امالی، ص ۳ ۲۲، ح ۴۔ اختصاص، ص ۲۳۰ ؛ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۶۶۴، ح ۶، اور ۶۶۵، ح۱۶۔

حضرت علی ـ نے بھی فرمایا ہے: ''جو زیادہ ہنسی مذاق کرتا ہے وہ کم عقل شمار ہوتا ہے[1]''۔

۳ـ مال، قدرت، علم، تعریف اور جوانی سے سر مست ہونا: حضرت علی ـ کی طرف منسوب بیان کے مطابق عاقل انسان کو چاہیے کہ خود کو مال، قدرت، علم، ستائش و جوانی کی سر مستی سے محفوظ رکھے، کیونکہ یہ سر مستی انسان کی عقل کو زائل کردیتی ہے اور اس کے وقار کو ختم کردیتی ہے[2]۔

۴ـ جلد بازی: جلد بازی سے مراد کسی کام کو بغیر سونچے سمجھے انجام دینا ہے۔ حضرت علی ـ مالک اشتر کو لکھتے ہیں: ہر گز کسی ایسے کام میں جلد بازی نہ کرو جس کا ابھی وقت نہ ہوا ہو!یا جس کام کا وقت ہوچکا ہو اس کے کرنے میں سستی نہ دکھاؤ!کوشش کروکہ ہر کام کو اس کے موقع و محل اور اس سے مخصوص وقت میں ہی انجام دو[3]''۔

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں: ''کسی کام میں جب تک کہ واضح نہ ہو اس کے کرنے میں جلد بازی نہ کرو[4]'' اور فرماتے ہیں: اس چیز میں جس میں خدا نے جلد بازی لازم نہیں قرار دی ہے اس میں جلد بازی نہ کرو[5]۔'

اسلام کے خلاقی نظام میں جلد بازی ہمیشہ نا پسند نہیں ہے، بلکہ بعض امور میں اس کی تاکید بھی کی گئی ہے، لیکن درج ذیل موارد میں جلد بازی سے روکا گیا ہے جیسے سزا دینے، جنگ و خونریزی کرنے، کھانا کھانے، نماز تمام کرنے اور غور خوص کرنے میں جلد بازی سے منع کیا گیا ہے۔ نیکیوں، خدا کی خوشنودی، توبہ، عمل صالح اور تحصیل علم وغیرہ کے لئے جلد بازی کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن کریم نیک امور کی جانب سبقت کرنے کی تاکید فرماتا ہے: ''نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت کرو[6]''۔

---

[1] کلینی، کافی، ج ۸، ص۲۲، ح ۴۔ حرانی، تحف العقول، ص ۶۹۔

[2] آمدی، غرر الحکم، ح ۹۴۸ ۱۰۔

[3] نہج البلاغہ، نامہ ۵۳۔
[4] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۳۔
[5] ایضاً، خطبہ ۱۹۰۔
[6] سورۂ بقرہ، آیت ۴۸ اور سورۂ مائدہ، آیت ۸ ۴۔

دو۔ نفس کے لئے خطرناک شئی نفس کے لئے خطرناک شئی اس کا ضعیف ہونا ہے جس کے مضر اثرات ہیں اور یہ نفس کے موانع میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض اثرات جیسے عدم ثبات، پست ہمتی، غیرت و حمیت کا نہ ہونا ان مباحث کے ضمن میں جو قوت نفس کے علائم میں بیان ہوئے ہیں، آشکار ہوگئے۔ یہاں پر ایک دوسرا مانع یعنی ''تہاون'' اور ''مداہنہ'' کا ذکر اس کی اہمیت کی بنا پر کیا جا رہا ہے۔ '' مداہنہ'' سے مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نرمی، کوتاہی اور سستی سے کام لینا ہے[1]''۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سستی اور کوتاہی یا نفس کے ضعیف ہونے سے پیدا ہوتی ہے یا اس شخص کے مال اور اعتبار میں دنیوی طمع و آرزو کی وجہ سے جس کی نسبت سستی اور کوتاہی کو روا رکھتا ہے[2]۔

آیات وروایات میں دین میں نرمی اور کوتاہی کرنے کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور اس کے نقصان دہ اثرات بیان کئے گئے ہیں، جیسا کہ خدا وندعالم کفار و مشرکین کی سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''وہ چاہتے ہیں کہ تم نرمی سے کام لو تو وہ بھی نرمی سے کام لیں[3]''یعنی طرفین میں سے ہرایک دوسرے کے دین سے متعلق سہل انگاری اور نرمی سے کام لے[4]۔

حضرت علی ـ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''میری جان کی قسم، حق کے مخالفین گمراہی و فساد میں غوطہ لگانے والوں سے ایک آن بھی مقابلہ و جنگ کرنے میں سستی نہیں کروں گا[5]''۔

حضرت امام محمد باقر ـ فرماتے ہیں: ''خداوند سجان نے حضرت شعیب کو وحی کی کہ تمہاری قوم میں سے ایک لاکھ افراد پر عذاب نازل کروں گا، ان میں سے ۴۰ ہزار افراد برے ہیں اور ۶۰ ہزار ان کے برگزیدہ ہیں۔ حضرت شعیب نے پوچھا: خدایا ! اخیار

[1] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ص ۱۷۳ ؛ طریحی، مجمع البحرین، ج ۱، ص ۶۶ ؛ ابن منظور، لسان العرب، ج۱۳، ص ۲ ۱۶ ؛ مجلسی ،بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۲۸۲۔
[2] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۲۳۲ تا۲۴۰۔
[3] قلم ، ۹۔
[4] طباطبائی، المیزان، ج۱۹، ص ۳۷۱۔
[5] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۴۔

اور برگزیدہ افراد کا جرم و گناہ کیا ہے ؟ تو خداوند سبحان نے جواب دیا : ان لوگوں نے گناہگاروں کے مقابل سستی اور نرمی سے کام لیا ہے اور میرے ناراض ہونے سے وہ ان پر ناراض نہیں ہوئے[۱] ''۔

دین میں سستی، سہل انگاری اور کوتاہی سے متعلق روایات میں جو نقصان دہ اور ضرر رساں اثرات بیان کئے گئے ہیں ان میں سے انسانی سماج کی گراوٹ، فسادو تباہی، گناہ و عصیان کی زیادتی، سزا ودنیوی اور اخروی عذاب اور دنیا وآخرت میں نقصان وخسارہ کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے[۲]۔

۲۔ حلم و برد باری اور غصہ کا پینا '' حلم '' عربی زبان میں امور میں تامل، غوروفکر، تدبیر کرنے اور جلد بازی نہ کرنے کو کہتے ہیں۔ '' حلیم '' اس انسان کو کہتے ہیں جو حق پر ہونے کے باوجود جاہلوں کو سزا دینے میں جلد بازی نہ کرے اور مقابل شخص کی جاہلانہ رفتار سے وجود میں آنے والے غیض و غضب سے اپنے کو قابو میں رکھے[۳]۔

بعض علماء اخلاق حلم کو اطمینان قلبی اور اعتماد نفس کا ایک درجہ خیال کرتے ہیں کہ اس کا مالک انسان آسانی سے غضبناک نہیں ہوتا اور ناگوار حوادث جلدی اسے پریشان اور مضطرب نہیں کرتے۔ اس وجہ سے حلم کی حقیقی ضد غضب ہے، کیونکہ حلم اصولی طور پر غضب کے وجود میں آنے سے مانع ہوجاتا ہے۔ حلم اور '' کظم غیظ '' (غصہ کو پینے) کے درمیان فرق کے بارے میں کہا گیا ہے کظم غیظ صرف خشم و غضب کے پیدا ہوجانے کے بعد اسے ضبط کر کے ٹھنڈا کردیتا ہے جب کہ حلم بے جا غیض و غضب کے پیدا ہونے سے مانع ہوتا ہے، پس حلم غیض و غضب کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتا ''کظم غیظ '' اس کے پیدا ہونے کے بعد اس کے علائم کے ظاہر ہونے کو روک کر درحقیقت اس کا علاج کرتا ہے[۴]۔

---

[۱] تہذیب، طوسی، ج ۶، ص ۱۸۱ ،ح ۳۷۲ ؛ کلینی، کافی، ج ۵، ص ۵۶، ح ۱۔
[۲] کلینی، کافی، ج ۱، ص ۴۵، ح ۶، اور ج ۸، ص ۴ ۳ ۱، ح ۱۰۳، اور ص ۱۲۸، ح ۹۸ ؛ حرانی، تحف العقول، ص ۱۰۵، ۷ ۳ ۲؛ نہج البلاغہ،
[۳] خ ۸۶، ۲۳۳؛ شیخ مفید، ارشاد، ص ۹۲۔
[۴] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۵ ۲۹، ۲۹۶۔

قرآن کریم میں حلم ۱۰ بار سے زیادہ خداوند سبحان کے صفات میں شمار کیا گیا ہے کہ ان موارد میں نصف سے زیادہ ''غفور'' اور ''حلیم'' ایک ساتھ ذکر ہوا ہے[1]۔

اسلام کے اخلاقی نظام میں حلم اور بردباری کی قدر و منزلت اس درجہ بلند ہے کہ لوگوں کی رہبری و امامت کے ایک لوازم میں شمار کیا گیا ہے۔ رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں: ''امامت اور رہبری تین خصوصیات کے مالک افراد کے علاوہ کسی کے لئے سزاوار نہیں ہے، ایسا تقویٰ جو اسے خدا کی نافرمانی سے روکے، ایسا حلم و بردباری جس کے ذریعہ وہ اپنے غصہ کو کنٹرول کرے اور لوگوں پر ایسی پسندیدہ حکمرانی کہ ان کے لئے ایک مہربان باپ کی طرح ہو[2]''۔

حضرت علی ؑ نے فرمایا: ''حلم ڈھانکنے والا پردہ اور عقل شمشیر براں ہے، لہٰذا اپنی اخلاقی کمی کو بردباری سے چھپاؤ اور اپنی نفسانی خواہشات کو عقل کی شمشیر سے قتل کرڈالو[3]''۔ یعنی انسان کی اخلاقی کمی کے لئے حلم ایک پردہ ہے دوسری جگہ حلم کو عزت کا بلند ترین مرتبہ[4] عاقلوں کی سرشت[5]، اور قدرت کی علامت[6] تصور کیا گیا ہے کظم غیظ اور غصہ کو پینا در حقیقت تحلّم اور زحمت و کلفت کے ساتھ حلم اختیار کرنا ہے۔ اس وجہ سے کظم غیظ اہمیت کے اعتبار سے حلم سے کم درجہ رکھتا ہے، اگر چہ اپنی جگہ اہم اور قابل تعریف ہے۔ قرآن کریم کظم غیظ کو متقین کی صفت اور ایک قسم کی نیکی اور احسان جانتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے: ''اپنے پروردگار کی عفو و بخشش اور ایسی بہشت کی طرف سبقت کرو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور وہ ان پرہیزگاروں کے لئے آمادہ کی گئی ہے[7]''۔

---

[1] عبد الباقی، محمد فؤاد، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، ص ۲۱۶،
[2] کلینی، کافی، ج ۱، ص ۴۰۷، ح ۸۔
[3] نہج البلاغہ، حکمت ۴۲۴۔

[4] کلینی، کافی ج ۸، ص ۱۹، ح ۴۔
[5] صدوق، فقیہ، ج ۴، ص ۲۷۴، ح ۸۲۹۔
[6] صدوق، خصال، ج ۱، ص ۱۱۶، ح ۹۶۔

[7] سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۳ ، ۱۳۴۔

وہ لوگ جو فراخی اور تنگی حالتوں میں انفاق کرتے ہیں اور اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں، اور خدا وند عالم احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غصہ کے پینے کی فضیلت میں فرمایا ہے: ''خدا تک انسان کے پہنچنے کے محبوب ترین راستے دو گھونٹ نوش کرنا ہے،ایک غصّہ کا گھونٹ جو حلم وبردباری کے ساتھ پیا جاتا ہے اور غصّہ بر طرف ہوجاتا ہے، دوسرا مصیبت کا گھونٹ کہ جو صبر و تحمّل سے زائل ہوتا ہے[1]''

حضرت امام جعفر صادق ۔ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے: ''جو کوئی ایسے خشم و غضب کو کہ جسے وہ ظاہر کرسکتا ہے پی جائے تو قیامت کے دن خدا وند تعالیٰ اپنی رضا سے اس کے دل کو پر کردے گا.

الف۔ حلم اور کظم غیظ کے اسباب و موانع: روایات میں علم، عقل، فقہ، تحمّل، بلند ہمتی اور حلیم و برد بار افراد کی ہمنشینی کو حلم اختیار کرنے کے اسباب و علل میں ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت امام علی رضا ۔ فرماتے ہیں: ''فقاہت کی علامتوں میں سے حلم اور سکوت ہے''۔

نیز حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''اگر تم واقعاً حلیم نہیں ہو تو حلم کا اظہار کرو کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی قوم کی شباہت اختیار کرے اور ان میں سے نہ ہوجائے[2]'' اسی طرح آپؑ نے فرمایا: 'حلم اور صبر دونوں جڑواں ہیں اور دونوں ہی بلند ہمتی کا نتیجہ ہیں[3]' اس کے مقابل کچھ صفات ایسے ہیں جو حلم و برد باری کے موانع کے عنوان سے ذکر کئے گئے ہیں کہ ان میں سے سفاہت، بیوقوفی، حماقت، دُرشت مزاجی، تند خوئی، غیض و غضب، ذلت وخواری اور ترش روئی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے[4]۔

---

[1] کلینی، کافی، ج
[2] کلینی، کافی، ج ٢، باب کظم غیظ، ح ۶۔
[3] کلینی، کافی، ج ١، ص ٣۶، ح ۴۔

[4] نہج البلاغہ، حکمت ٢٥٧؛ کلینی، کافی، ج ٢، ص١١٢، ح ۶، ص ٢٠، ح ۴ اور تحف ا لعقول، ص ۶٩۔

ب۔ حلم و برد باری کے فوائد :اخروی جزا کے علاوہ آیات و روایات میں دنیوی فوائد بھی حلم و برد باری کے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ فوائد خواہ انسان کی انسانی زندگی میں نفسانی صفات اور عملی صفات ہوں خواہ انسان کی اجتماعی زندگی کے مختلف ادوار میں ظاہر ہوں، ان میں سب سے اہم فوائد یہ ہیں: سکون قلب، وقار، نجابت، رفق ومدارا، صبر، عفو و بخشش، خاموشی، سزا دینے میں جلد بازی نہ کرنا، اور خندہ روئی فردی فائدے کے عنوان سے اور کرامت وبزرگواری، کامیابی، صلح و آشتی، ریاست و بزرگی، لوگوں کے دلوں میں محبوبیت اور پسندیدہ وخوشگوارزندگی حلم و برد باری کے اجتماعی فوائد ہیں ۔ان میں سے بعض فوائد پر اس کے پہلے بحث ہوچکی ہے اور بعض دیگر ایک قسم کی رفتار (عمل) ہیں کہ عملی صفات کے بیان کے وقت ان میں سے بعض کا ذکر کریں گے۔

۳۔ حیاحیا نفسانی صفات میں ایک اہم صفت ہے جو ہماری اخلاقی زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت زیادہ اثر رکھتی ہے اس تاثیر کا اہم ترین کردار خود کو محفوظ رکھنا ہے۔

''حیا'' لغت میں شرم وندامت کے مفہوم میں ہے اور اس کی ضد ''وقاحت'' اور بے حیائی ہے[1] علماء اخلاق کی اصطلاح میں حیا ایک قسم کا نفسانی انفعال اور انقباض ہے جو انسان میں نا پسندیدہ افعال کے انجام نہ دینے کا باعث بنتا ہے اور اس کا سر چشمہ لوگوں کی ملامت کا خوف ہے[2]۔

آیات و روایات میں ''حیا'' کے مفہوم کے بارے میں مطالعہ کرنا بتاتا ہے کہ اس حالت کی پیدائش کا مرکز ایک آگاہ ناظر کے سامنے حضور کا احساس کرنا ہے، ایسا ناظر جو محترم اورگرامی قدر ہے۔ اس مفہوم کو کتاب و سنت میں مذکور حیا کے مسائل اور ابواب میں بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے یہ مفہوم حیا کی تمام اقسام کے درمیان ایک مشترک مفہوم ہے اس وجہ سے حیا کے تین اصلی رکن ہیں: فاعل،ناظر اور فعل۔ حیا میں فاعل وہ ہے جو نفسانی کرامت و بزرگواری کا مالک ہے۔ ناظر وہ ہے کہ جس کی قدر و منزلت

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، ج۸، ص ۵۱ ؛ مفردات الفاظ قرآن کریم، ص ۲۷۰ اور ابن اثیر نہایہ، ج ۱، ص ۳۹۱۔

[2] ابن مسکویہ، تہذیب الاخلاق، ص ۴۱، ؛طوسی اخلاق نا صری، ص ۷۷۔

فاعل کی نگاہ میں عظیم اور قابل احترام ہے اور فعل جو کہ حیا کے تحقق کا تیسرا رکن ہے، برا اور ناپسند دیدہ فعل ہے لہذا نتیجہ کے طور پر ''حیا''،''خوف'' و ''تقویٰ'' کے درمیان فرق کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ حیا میں روکنے والا محور ایک محترم اور بلند مرتبہ ناظر کے حضور کو درک کرنا اور اس کی حرمت کی حفاظت کرنا ہے، جبکہ خوف وتقویٰ میں روکنے والا محور، خدا کی قدرت کا درک کرنا اور اس کی سزا کا خوف ہے۔

قابل ذکر ہے کہ حیا کا اہم ترین کردار اور اصلی جوہر برے اعمال کے ارتکاب سے روکنا ہے، لامحالہ یہ رکاوٹ نیک اعمال کی انجام دہی کا باعث ہوگی۔ اسی طرح یہ بات قابل توجہ ہے کہ حیا مختلف شعبوں میں کی جاتی ہے کہ اس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی، جیسا کہ عورتوں کی حیا ''اخلاق جنسی'' میں، گھر میں حیا کی بحث ''اخلاق خانوادہ''میں اور دوسروں سے حیا ''اخلاق معاشرت'' میں مورد تحقیق قرار دی جائے گی۔ یہاں پر حیا سے متعلق صرف عام اور کلی مباحث ذکر کر رہے ہیں۔

الف۔ حیا کی اہمیت: رسول خدا ﷺ حیا کو انسان کی زینت شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''بے حیائی کسی چیز کے ہمراہ نہیں ہوئی مگر یہ کہ اس کو ناپسند اور برا بنا دیا، اور حیا کسی چیز کے ہمراہ نہیں ہوئی مگر یہ کہ اسے اس نے آراستہ کر دیا[1]''۔

حضرت علی ـ نے بھی فرمایا ہے: ''جو حیا کا لباس پہنتا ہے کوئی اس کا عیب دیکھ نہیں پاتا[2]''اور دوسرے بیان میں فرماتے ہیں: ''حیا اختیار کرو کیونکہ حیا نجابت کی دلیل و نشانی ہے[3]''۔

حضرت امام جعفر صادق ـ حیا کے مرتبہ کو اخلاقی مکارم میں سر فہرست قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مکارم اخلاق میں ہر ایک دوسرے سے مربوط اور جڑے ہوئے ہیں، خداوندعالم ہر اس انسان کو جو ان مکارم اخلاق کا طالب ہے دیتا ہے، ممکن ہے کہ یہ مکارم ایک انسان میں ہو لیکن اس کی اولاد میں نہ ہو، بندہ میں ہو لیکن اس کے آقا میں نہ ہو (وہ مکارم یہ ہیں) صداقت و

---

[1] شیخ مفید، امالی، ص ١٦٧۔

[2] نہج البلاغہ، حکمت ٢٢٣ ؛ صدوق، فقیہ، ج ٤، ص ٣٩١ ح٥٨٣٤ ۔ کلینی، کافی، ج٨، ص ٢٣۔
[3] آمدی، غرر الحکم، ح ٨٢ ٠ ٦۔

راست گوئی، لوگوں کے ساتھ سچائی برتنا، مسکین کو بخشنا، خوبیوں کی تلافی، امانت داری، صلہ رحم، دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ دوستی اور مہربانی، مہمان نوازی اور ان سب میں سر فہرست حیا ہے[1]۔

حضرت علی ـ نے حیا کے بنیادی کردار کے بارے میں فرمایا: ''حیا تمام خوبصورتی اور نیکی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے[2]'' حیا کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق ـ نے فرمایا: ''جو حیا نہ رکھتا ہو اس کے پاس ایمان نہیں ہے[3]''۔

رسول اکرم ﷺ کی سیرت کے بارے میں منقول ہے کہ آنحضرتؐ جب بھی لوگوں سے بات کرتے تھے تو عرق شرم (حیا کا پسینہ) آپؐ کی پیشانی پر ہوتا تھا اور کبھی ان سے آنکھیں چار نہیں کرتے تھے[4]۔

کبھی حیا کا منفی رخ سامنے آتا ہے اور وہ اس صورت میں کہ جب اس کا سبب حماقت، جہالت، اور نفس کی کمزوری ہو۔ اسلامی اخلاق میں ایسی شرم و حیا کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور اسے اخلاقی فضیلت شمار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ انسان کے رشد و علو کے لئے رکاوٹ اور مختلف شعبوں میں اس کے پچھڑنے کا سبب ہوتی ہے۔ روایات میں اس طرح کی شرم کو جہل و حماقت اور ضعف کی حیا کے نام سے یاد کیا گیا ہے[5]۔

ب۔ حیا کے اسباب و موانع: بعض وہ امور جو روایات میں حیا کے اسباب کے عنوان سے ذکر کئے گئے ہیں، درج ذیل ہیں:

۱۔ عقل: رسول خدا ﷺ نے ایک عیسائی راہب (شمعون بن لاوی بن یہودا) کے جواب میں کہ اس نے آپؐ سے عقل کے علائم وماہیت کے بارے میں سوال کیا تھا، فرمایا: ''عقل حلم کی پیدائش کا باعث ہے اور حلم سے علم، علم سے رشد، رشد سے عفاف

[1] کلینی، کافی ج ۲، ص ۵۵ ح۱۔ طوسی، امالی، ص ۳۰۸۔

[2] حرانی، تحف العقولِ ،ص ۸۴۔

[3] کلینی، کافی، ج۲، ص۱۰۶۔

[4] کافی ، ج۵ ،ص۵۶۵، ح۴۱۔

[5] صدوق، خصال، ج ۱، ص۵۵، ح ۷۶ ؛ کلینی، کافی، ج۲، ص ۱۰۶، ح ۶۔

اور پاک دامنی، عفاف سے خوداری، خوداری سے حیا، حیا سے وقار، وقار سے عمل خیر کی پابندی اور شر سے بیزاری اور شر سے تنفر سے نصیحت آمیز اطاعت حاصل ہوتی ہے[1]۔

۲۔ایمان: حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں: ''جو حیا نہیں رکھتا وہ ایمان بھی نہیں رکھتا ''اسی طرح روایات میں کچھ امور کو حیا کے موانع بے حیائی کے اسباب و علل کے عنوان سے پہنوایا گیا ہے ان میں سب سے اہم درج ذیل ہیں :

ایک۔ حرمتوں اور پردوں کو اٹھا دینا: حضرت امام موسیٰ کاظم ۔ اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں: ''شرم وحیا کا پردہ اپنے اور اپنے بھائیوں کے درمیان سے نہ اٹھاؤ اور اس کی کچھ مقدار باقی رکھو، کیونکہ اس کا اٹھانا حیا کے اٹھانے کے مترادف ہے[2]''۔

۲۔ لوگوں کی طرف دست سوال دراز کرنا: حضرت امام جعفر صادق ۔ نے فرمایا: ''لوگوں کی طرف دست سوال دراز کرنا عزت چھین لیتا ہے اور حیا کو ختم کردیتا ہے[3]''۔

۳۔ زیادہ بات کرنا: حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''جو زیادہ بولتا ہے وہ زیادہ خطا کرتا ہے اور جو زیادہ خطا کرتا ہے اس کی شرم و حیا کم ہو جاتی ہے اور جس کی شرم کم ہوجاتی ہے اس کی پارسائی کم ہوجاتی ہے اور جس کی پارسائی کم ہوجاتی ہے اس کا دل مردہ ہوجاتا ہے[4]''۔

۴۔ شراب خوری: حضرت امام علی رضا ۔ کی طرف منسوب ہے کہ آپ نے شراب کی حرمت کی علت کے بارے میں فرمایا: ''خداوند سبحان نے شراب حرام کی کیونکہ شراب تباہی مچاتی ہے، عقلوں کو حقائق کی شناخت میں باطل کرتی ہے اور انسان کے چہرہ سے شرم و حیا ختم کردیتی ہے[5]''۔

---

[1] حرانی، تحف العقول، ص ۱۹، اسی طرح ملاحظہ ہو، ص ۲۷ ؛ صدوق، خصال، ج ۲، ص۴۰۴، ۴۲۷ ؛ کلینی، کافی، ج۱، ص ۱۰، ح ۲ ۔اور ج ۲، ص ۲۳۰۔ ۲۔
[2] کافی، ج ۲، ص ۶۷۲، ح۵۔
[3] ایضاً، ج۲، ص ۱۴۸، ح ۴۔
[4] نہج البلاغہ، حکمت ۳۴۹۔
[5] فقہ الرضا، ص ۲۸۲۔

ج۔ حیا کے فوائد: روایت میں حیا کے کثرت سے فوائد پائے جاتے ہیں خواہ وہ دنیوی ہوں یا اخروی، فردی ہوں یا اجتماعی، نفسانی ہوں یا عملی، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں :

۱۔ خدا کی محبت: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خداوند سبحان، حیا دار، با شرم اور پاکدامن انسان کو دوست رکھتا ہے اور بے شرم فقیر کی بے شرمی سے نفرت کرتا ہے[۱]''۔

۲۔ عفّت اور پاکدامنی: حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''حیا کا نتیجہ عفّت اور پاکدامنی ہے[۲]''۔

۳۔ گناہوں سے پاک ہونا: حضرت امام زین العابدین ۔ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: ''چار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی کے پاس ہوں تو اس کا اسلام کامل اور اس کے گناہ پاک ہوجائیں گے اور وہ اپنے رب سے ملاقات اس حال میں کرے گا، کہ خداوند عالم اس سے راضی و خوشنود ہوگا، جو کچھ اس نے اپنے آپ پر لوگوں کے نفع میں قرار دیا ہے خدا کے لئے انجام دے اور لوگوں کے ساتھ اس کی زبان راست گوئی کرے اور جو کچھ خدا اور لوگوں کے نزدیک برا ہے اس سے شرم کرے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ خوش اخلاق ہو[۳]''۔

۔ ۴۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرم و حیا کے کچھ فوائد کی شرح کے ذیل میں فرمایا ہے: ''جو صفات حیا سے پیدا ہوتے ہیں یہ ہیں: نرمی، مہربانی، ظاہر اور مخفی دونوں صورتوں میں خدا کو نظر میں رکھنا، سلامتی، برائی سے دوری، خندہ روئی، جود و بخشش، لوگوں کے درمیان کامیابی اور نیک نامی، یہ ایسے فوائد ہیں جنھیں عقلمند انسان حیا سے حاصل کرتا ہے[۴]''۔

---

[۱] طوسی، امالی، ص ۳۹، ح ۴۳۔ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۱۱۲، ح۸ ؛ صدوق، فقیہ، ج۳، ص ۵۰۶، ح۴۷۷۴۔
[۲] آمدی، غرر الحکم، ح ۴۶۱۲۔
[۳] صدوق، ، خصال، ج۱، ص ۲۲۲، ح ۱۵۰ ۔ مفید، امالی، ص ۱۶۶، ح ۱۔

[٤] حرانی، تحف العقول، ص ۲۰۔

اسلام کی اخلاقی کتابوں میں ''وقاحت'' اور ''بے شرمی'' سے متعلق بہت سے بیانات ہیں کہ ہم اختصار کی خاطر صرف ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق ۔ اپنے شاگرد ''مفضل'' سے فرماتے ہیں: ''اے مفضل! اگر حیا نہ ہوتی تو انسان کبھی مہمان قبول نہیں کرتا، اپنے وعدہ کو وفا نہیں کرتا، لوگوں کی ضرورتوں کو پورا نہ کرتا، نیکیوں سے دور ہوتا اور برائیوں کا ارتکاب کرتا۔ بہت سے واجب اور لازم امور حیا کی وجہ سے انجام دئے جاتے ہیں، بہت سے لوگ اگر حیا نہ کرتے اور شرمسار نہ ہوتے تو والدین کے حقوق کی رعایت نہیں کرتے، کوئی صلہ رحمی نہ کرتا، کوئی امانت صحیح وسالم واپس نہیں کرتا اور فحشا و منکر سے باز نہیں آتا[1]''۔

د۔ حیا کے مقامات :بیان کیا جاچکا ہے کہ ''حیا'' ناظر محترم کے حضور برے اعمال انجام دینے سے شرم کرنا ہے۔ اس بنا پر پہلے: اسلام کی اخلاقی کتابوں میں خدا، اس کی طرف سے نظارت کرنے والے، اس کے نمایندے، انسان اور دوسروں کی انسانی اور الٰہی حقیقت کا ذکر ایک ایسے ناظر کے عنوان سے ہوا ہے کہ جن سے شرم وحیا کرنی چاہیے[2]۔

دوسرے: حیا کے لئے ناپسندیدہ اور امور ہیں اور نیکیوں کی انجام دہی میں شرم و حیا کبھی ممدوح نہیں ہے لیکن اس حد و مرز کی رعایت بہت سے افراد کی طرف سے نہیں ہوتی ہے، اس کا سبب کبھی جہالت ہے اور کبھی لاپرواہی بہت سی روایات میں بعض موقع پر حیا کرنے سے ممانعت کی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ حیا کے مفہوم میں پہلے بیان کئے گئے ضابطہ و قانون کے باوجود یہ تاکید اس وجہ سے ہے کہ انسان ان موارد کی نسبت ایک طرح علمی شبہہ رکھتا.

ہے اور ایک حد تک ان موارد میں حیا کرنے کی تائید کے لئے توجیہات گڑھنے کی کوشش کرتا ہے، جب کہ اس کے خیالات و تصورات باطل ہیں۔

---

[1] مجلسی، بحار، ج ۳، ص ۸۱۔
[2] صدوق، عیون اخبار الرضا ؑ، ج ۲، ص۴۵، ح ۱۶۲ ؛ تفسیر قمی، ج ۱، ص ۳۰۴ ؛ کراجکی، کنز الفؤائد، ج ۲، ص ۱۸۲ ؛ طوسی، امالی، ص ۲۱۰۔

وہ بعض موارد اور مقامات جہاں حیا نہیں کرنی چاہیے، درج ذیل ہیں:

۱۔ حق بات، حق عمل اور حق کی درخواست میں حیا کرنا: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی عمل بھی ریا اور خود نمائی کے عنوان سے انجام نہ دو اور اسے شرم و حیا کی وجہ سے ترک نہ کرو[1]''۔

۲۔ تحصیل علم سے حیا کرنا: حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''کوئی شخص جو وہ نہیں جانتا ہے اس کے سیکھنے میں شرم نہ کرے[2]''۔

۳۔ حلال درآمد کے حصول میں حیا کرنا: حضرت امام جعفر صادق ۔ نے فرمایا: ''اگر کوئی مال حلال طلب کرنے میں حیا نہ کرے تو اس کے مخارج آسان ہو جائیں گے اور خدا اس کے اہل و عیال کو اپنی نعمت سے فیضیاب کرے گا[3]''۔

۴۔ مہمانوں کی خدمت کرنے سے حیا کرنا: حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''تین چیزیں ایسی ہیں جن سے شرم نہیں کرنی چاہیے، منجملہ ان کے انہیں میں مہمانوں کی خدمت کرنا ہے[4]''۔

۵۔ دوسروں کا احترام کرنے سے حیا کرنا: حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''تین چیزوں سے شرم نہیں کرنی چاہیے: منجملہ ان کے اپنی جگہ سے باپ اور استاد کی تعظیم کے لئے اٹھنا ہے[5]''۔

٦۔ نہ جاننے کے اعتراف سے حیا کرنا: حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''اگر کسی سے سوال کریں اور وہ نہیں جانتا تو اسے یہ کہنے میں کہ ''میں نہیں جانتا'' شرم نہیں کرنی چاہیے[6]''۔

---

[1] حرانی، تحف العقول، ص ۴۷، ؛ صدوق، امالی، ص ۹۹ ۳ ، ح۱۲، ؛ کلینی، کافی، ج۲، ص ۱۱ ۱، ح ۲، اور ج ۵، ص ۵٦۸، ح ۵۳ ۔
[2] نہج البلاغہ، حکمت ۸۲ ؛ حرانی، تحف العقول، ۳۱۳۔

[3] حرانی، تحف العقول، ص۵۹ ؛ صدوق، فقیہ ،ج ۴، ص ۴۱۰، ح ۵۸۹۰۔

[4] آمدی، غرر الحکم، ح ۴٦٦٦۔

[5] غرر الحکم۔

[6] نہج البلاغہ، حکمت، ۸۲ ؛ صدوق، خصال، ج ۱، ص ۳۱۵، ح ۹۵۔

۷۔ خداوند عالم سے درخوست کرنے میں حیا کرنا: امام جعفر صادق ـ نے فرمایا: ''کوئی چیز خدا کے نزدیک اس بات سے زیادہ محبوب نہیں ہے کہ اس سے کسی چیز کا سوال کیا جائے، لہٰذا تم میں سے کسی کو رحمت خداوندی کا سوال کرنے سے شرم نہیں کرنی چاہیے، اگرچہ اس کا سوال جوتے کے ایک فیتہ کے متعلق ہو[1]۔

۸۔ معمولی بخشش کرنے سے حیا کرنا: حضرت علی ـ نے فرمایا: ''معمولی بخشش کرنے سے شرم نہ کروکہ اس سے محروم کرنا اس سے بھی کمتر ہے[2]۔

۹۔اہل و عیال کی خدمت کرنے سے حیا کرنا: حضرت امام جعفر صادق ـ نے مدینہ کے ایک انسان کو دیکھا کہ اس نے اپنے اہل و عیال کے لئے کوئی چیز خریدی ہے اور اپنے ہمراہ لئے جا رہا ہے، جب اس انسان نے امامؑ کو دیکھا تو شرمندہ ہوگیا امامؑ نے فرمایا: ''یہ تم نے خود خریدا ہے اور اپنے اہل و عیال کے لئے لے جا رہے ہو؟ خدا کی قسم، اگر اہل مدینہ نہ ہوتے (کہ ملامت اور نکتہ چینی کریں) تو میں بھی اس بات کو دوست رکھتا کہ کچھ خرید کر اپنے اہل و عیال کے لئے لے جاؤں[3]''۔

۴۔ **عفّت** نفسانی صفات میں ایک دوسری روکنے والی صفت عفّت اور پاکدامنی ہے۔ ''عفّت'' لغت میں ناپسند اور قبیح امر کے انجام دینے سے اجتناب کرنے کے معنی میں ہے[4]۔

علم اخلاق کی اصطلاح میں ''عفت'' نام ہے اس نفسانی صفت کا جو انسان پر شہوت کے غلبہ اور تسلّط سے روکتی ہے[5]۔ شہوت سے مراد اس کا عام مفہوم ہے کہ جو شکم و خوراک کی شہوت، جنسی شہوت، بات کرنے کی شہوت اور نظر کرنے کی شہوت اور

---

[1] کلینی، کافی، ج۴، ص ۲۰ ح ۴۔
[2] نہج البلاغہ، حکمت، ۶۷۔
[3] کلینی، کافی، ج۲، ص۱۲۳، ح۱۰۔

[4] لسان العرب، ج ۹، ص ۲۵۳ ،۲۵۴ ؛ جوہری ،صحاح اللغۃ، ج ۴، ص ۱۴۰۵، ۱۴۰۶ ؛ نہایہ، ج ۳، ص ۲۶۴۔

[5] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ قرآن ص ۳۵۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۵ ۔

تمام غریزوں (شہوتوں) کو شامل ہوتی ہے، حقیقت عفت یہ ہے کہ شہوتوں اور غریزوں سے استفادہ کی کیفیت میں ہمیشہ شہوتوں کی جگہ عقل و شرع کا غلبہ اور تسلط ہو۔ اس طرح شہوتوں سے منظّم و معیّن عقلی و شرعی معیاروں کے مطابق بہرہ مند ہونے میں افراط و تفریط نہیں ہوگی۔

الف۔ عفّت کے اقسام: عفّت کے لئے بیان شدہ عام مفہوم کے مطابق عفّت کے مختلف ابعاد وانواع پائے جاتے ہیں کہ ان میں سب سے اہم درج ذیل ہیں :

۱۔ عفّت شکم: اہم ترین شہوتوں میں سے ایک اہم کھانے کی شہوت و خواہش ہے۔ کھانے پینے کے غریزہ سے معقول و مشروع (جائز) استفادہ کو عفّت شکم کہا جاتا ہے جیسا کہ اس عفّت کے متعلق قرآن میں اس آیت کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ فرماتا ہے: ''تم میں جو شخص مالداراور تونگر ہے وہ (یتیموں کا مال لینے سے) پرہیز کرے اور جو محتاج اور تہی دست ہے تو اسے عرف کے مطابق (بقدر مناسب) کھانا چاہیے[۱]'' اس عفّت کی تفصیلی بحث اقصادی اخلاق میں کی جاتی ہے۔

۲۔ دامن کی عفت: جنسی غریزہ قوی ترین شہوتوں میں سے ایک ہے اسے جائز و مشروع استعمال میں محدود کرنا اور محرمات کی حد تک پہونچنے سے روکنا ''عفّت دامن'' یا پاکدامنی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسی معنی میں عفّت کا استعمال درج ذیل آیت میں ہوا ہے: ''جن لوگوں میں نکاح کرنے کی استطاعت نہیں ہے انھیں چاہیے کہ پاکدامنی اور عفّت سے کام لیں یہاں تک کہ خدا انھیں اپنے فضل سے بے نیاز کردے[۲]''۔

اس عفّت کی بحث تفصیلی طور پر اخلاق جنسی میں بیان کی جائے گی ۔اگر چہ اپنے آپ کو شہوتوں کے مقابل بچانا شکم اور دامن کی شہوت میں منحصر نہیں ہے، بلکہ تمام شہوتوں کو شامل ہے لیکن چونکہ یہ دونوں ان سب کی رئیس ہیں اور اخلاق کی مشہور کتابوں میں

---

[۱] سورۂ نساء، آیت ۶، اسیطرح سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۳ ملاحظہ ہو۔

[۲] سورۂ نور، آیت ۳۳؛ اسی طرح ملاحظہ ہو: آیت ۶۰۔

صرف انھیں دو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے حتیٰ بعض علماء نے ان دو کو عفّت کی تعریف میں بھی شامل کیا ہے، لہٰذا انھیں دو قسموں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔ دوسری طرف ان دو قسموں میں سے ہر ایک، ایک خاص عنوان سے مربوط ہے لہٰذا ہر ایک کی اپنے سے متعلق عنوان میں مفصل بحث کی جائے گی،یہا ں پر ان کے بعض کلی اور مشترک احکام کا ذکر کررہے ہیں۔

ب۔ عفّت کی اہمیت: حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''سب سے افضل عبادت عفّت ہے[1] اور حضرت امام محمد باقر ۔ سے منقول ہے: ''خدا کے نزدیک بطن اور دامن (شرمگاہ) کی عفّت سے افضل کوئی عبادت نہیں ہے[2]۔

اور جب کسی نے آپ سے عرض کیا کہ میں نیک اعمال انجام دینے میں ضعیف اور کمزور ہوں اور کثرت سے نماز نہیں پڑھ سکتا اور زیادہ روزہ نہیں رکھ سکتا، لیکن امید کرتا ہوں کہ صرف مال حلال کھاؤں اور حلال طریقہ سے نکاح کروں تو حضرت امام محمد باقر ۔ نے فرمایا: ''عفّت بطن ودامن سے افضل کون سا جہاد ہے؟[3]''

رسول خدا ﷺ اپنی امت کے سلسلہ میں بے عفتی اور ناپاکی کے بارے میں اپنی پریشانی کا اظہار یوں کرتے ہیں: ''میں اپنے بعد اپنی امت کے لئے تین چیز کے بارے میں زیادہ پریشان ہوں معرفت کے بعد گمراہی، گمراہ کن فتنے اور شہوت بطن ودامن[4]''۔

ایک دوسرے بیان میں فرماتے ہیں: ''میری امت کے جہنم میں جانے کا زیادہ سبب شہوت شکم ودامن کی پیروی کرنا ہے[5]''۔

ج۔ عفّت کے اسباب: شکم اور دامن کی عفّت میں سے ہرایک کے پیدا ہونے کے اسباب اقتصادی اور جنسی اخلاق سے مربوط بحث اور اس کے مانند دوسری بحثوں میں بیان کئے جاتے ہیں لیکن روایت میں عام عوامل واسباب جیسے عقل، ایمان، تقویٰ حیا و

---

[1] کلینی، کافی، ج۲، ص۷۹ ،ح ۳۔
[2] جامع السعادات، ص ۸۰، ح ۸ ۔ ص ۷۹، ح ۱۔
[3] جامع السعادات، ص ۷۹، ح ۴ ۔
[4] جامع السعادات، ح ۶ ۔
[5] جامع السعادات، ص ۸۰، ح ۷۔

مروت کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اختصار کی رعایت اور ایک حد تک ان کی علت کے واضح ہونے کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک کے ذکر سے صرف نظر کرتے ہیں۔

د۔ عفّت کے موانع: عفّت کے عام موانع میں ''شرارت'' اور ''خمود'' (سستی اور سہل انگاری) ہے، ان دونوں کی مختصر توضیح درج ذیل ہے :

ا۔ شرارت: شرارت سے مراد اپنے عام مفہوم کے لحاظ سے شہوانی قوتوں کی پیروی کرنا ہے اس چیز میں جو وہ طلب کرتی ہیں، خواہ وہ شہوت شکم ہو یا شہوت مال دوستی یا اس کے مانند کسی دوسری چیز کی شہوت ۔ شرارت یعنی جنسی لذتوں میں شدید حرص کا ہونا اور ان میں زیادتی کا پایا جانا[۲]حضرت علی ۔ نے شرارت کی مذمت میں فرمایا ہے: ''شرارت تمام عیوب کی رئیس ہے[۳]''

حضرت امام جعفر صادق ۔ کا بیان اس سلسلہ میں یہ ہے: کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ خدا نے تم پر حرام کیا ہے اس کا تمہارا نفس حریص ہوجائے کیونکہ جو شخص بھی دنیا میں حرام خداوندی کا مرتکب ہوگا خداوند سبحان اسے جنت سے اور اس کی نعمتوں اور لذتوں سے محروم کردے گا[۴]''۔

۲۔ خمود: ''شرارت'' کے مقابل ہے یعنی ضروری خوراک کی فراہمی میں کاہلی اور کوتاہی کرنا اور جنسی غریزہ سے ضروری استفادہ کرنے میں سستی اور کوتاہی کرنا اس طرح سے کہ صحت و سلامتی، خاندان کی تباہی اور نسل کے منقطع ہونے کا سبب بن جائے ۔ یہ واضح ہے کہ یہ حالت غریزوں اور شہوتوں سے استفادہ میں تفریط اور کوتاہی کرنے سے پیدا ہوتی ہے[۵]۔

---

[۱] ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۳، ص ۵۰۶۔
[۲] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۴۔
[۳] کلینی، کافی، ج۸، ص ۱۹، ح۴ ؛ نہج البلاغہ، حکمت، ۳۷۱۔
[۴] کلینی، کافی ، ج۸، ص ۴، ح ۱۔
[۵] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۳۔

''خمود''، حکمت خلقت کے مخالف اور نسل انسان کے استمرار و دوام نیز اس کی بقا اور مصلحت کے مخالف ہے، اس کے علاوہ اسلامی اخلاق میں غرائز وشہوات سے جائز استفادہ کی جو کثرت سے تاکید پائی جاتی ہے اور جو کچھ رہبانیت اور دنیا سے کنارہ کشی کی مذمت کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے وہ سب ''خمود''کی قباحت کو بیان کرتے ہیں ۔اس امر کی تفصیلی بحث ''اخلاق جنسی'' میں ہوگی۔

ہ ۔ عفت کے فوائد : روایات میں عفت کے متعدد دنیوی اور اخروی فوائد بیان کئے گئے ہیں جیسے پستیوں سے نفس کی حفاظت کرنا، شہوتوں کو کمزور بنانا اور عیوب کا پوشیدہ ہونا کہ یہاں اختصار کے پیش نظر رسول خدا ﷺ کے ایک کلام کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کررہے ہیں۔

عفت کے علائم یہ ہیں: جو کچھ ہے اس پر راضی ہونا، اپنے کو معمولی اور چھوٹا سمجھنا، نیکیوں سے استفادہ کرنا، آسائش اور راحت میں، اپنے ما تحتوں اور مسکینوں کی دل جوئی، تواضع، یا د آوری (غفلت کے مقابل)، فکر، جو د و بخشش اور سخاوت کرنا[1]۔

۵۔ صبر نفسانی صفات میں سب سے عام اور اہم روکنے والی صفت ''صبر'' ہے۔ ''صبر'' کے معنی عربی لغت میں حبس کرنے اور دباؤ میں رکھنے کے ہیں[2] اور بعض نے اسے بے تابی اور بے قراری سے نفس کو باز رکھنے سے تعبیر کیا ہے[3]۔

اخلاقی اصطلاح میں صبر نام ہے نفس کو اس چیز کے انجام دینے اور آمادہ کرنے جس میں عقل و شرع کا اقتضاء ہو نیز اس چیز سے روکنا جسے عقل وشرع منع کرتے ہیں[4] مذکورہ تعریفوں کے پیش نظر ''صبر'' ایک ایسی عام اور روکنے والی نفسانی صفت ہے کہ جس میں دو اہم جہت پائے جاتے ہیں : صبر ایک طرف انسان کی غریزی اور نفسانی خواہش اور میلان کو حبس اور دائرۂ عقل وشرع

---

[1] حرانی، تحف العقول، ص۲۰۔
[2] زبیدی، تاج العروس، ج ۷، ص ۷۱ ؛ راغب اصفہانی، مفردات، ۴۷۴ ؛ ابن منظور، لسان العرب، ج ۴، ص ۴۳۸۔
[3] جوہری، صحاح اللغۃ، ج ۲، ص ۷۰۶۔ طریحی، مجمع البحرین، ج ۲، ص ۱۰۰۴۔
[4] راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ قرآن، ص ۴۷۴۔

میں محدود کرتا ہے۔ دوسری طرف نفس کو عقل و شرع کے مقابل ذمہ داری سے فرار اختیار کرنے سے روکتا ہے اور اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ اپنے کو فرائض الٰہی کی پابندی کے لئے زحمت اٹھانے اور دشواریوں کا سامنا کرنے کے لئے آمادہ کرے، البتہ اگر یہ حالت انسان میں سہولت و آسانی سے پیدا ہوجائے تو اسے ''صبر'' اور اگر انسان زحمت و مشقت میں خود کو مبتلا کرکے اس پر آمادہ کرے تو اسے ''تصبر'' (زبردستی صبر کرنا) کہتے ہیں۔

الف۔ صبر کی قسمیں: صبر کے لئے جو عام اور وسیع مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کے مطابق علماء اخلاق نے متعدد جہات سے صبر کے لئے مختلف اقسام و انواع بیان کی ہیں کہ ان میں سے اہم ترین اقسام کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

ا۔ مفہوم کے لحاظ سے: مذکورہ تعریفوں کے مطابق کبھی صبر سے مراد نفسانی جاذبوں اور دافعوں میں ہر قسم کی محدودیت کا ایجاد کرنا ہے کہ جو ایک عام مفہوم ہے اور کبھی اس سے مراد ناگوار امور کی نسبت عدم رضایت اور بے تابی کے اظہار سے نفس کو روکنا ہے۔ اس لحاظ سے صبر کے دو مفہوم ہیں کہ کبھی خاص مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ موضوع کے لحاظ سے: صبر اپنے عام مفہوم میں موضوع کے اعتبار سے متعدد انواع کا حامل ہے کبھی صبر سختیوں اور مصیبتوں پر ہوتا ہے جو کہ ان سختیوں اور مصیبتوں کے مقابل مضطرب وپریشان نہ ہونا اور سعہ صدر کی حفاظت ہے، اسے ''مکروہات پر صبر'' کہتے ہیں اور اس کے مقابل ''جزع'' اور بے قراری ہے صبر کی رائج قسم یہی ہے۔ جنگ کی دشواریوں پر صبر کرنا ''شجاعت'' ہے اور اس کے مقابل ''جبن'' بزدلی اور خوف ہے۔

اور کبھی صبر غیض و غضب کی سرکشی اور طغیانی کے مقابل ہے کہ اسے ''حلم'' اور ''کظم غیظ'' کہتے ہیں۔ کبھی صبر عبادت کے انجام دینے میں ہے کہ اس کے مقابل ''فسق'' ہے جو شرعی عبادت کی پابندی نہ کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اور کبھی صبر

شکم کی شہوت اور جنسی غریزہ کے مقابل ہے کہ جسے ''عفت'' کہتے ہیں اور دنیا طلبی اور زیادہ طلبی کے مقابل ہے جو کہ ''زہد'' ہے اور اس کے مقابل ''حرص'' ہے۔ اور کبھی صبر اسرار کے کتمان پر ہوتا ہے کہ جسے راز داری کہتے ہیں[1]۔

۳۔ حکم کے لحاظ سے: صبر اپنے تکلیفی حکم کے اعتبار سے پانچ قسم میں تقسیم ہوتا ہے: واجب صبر جو کہ حرام شہوات و میلانات کے مقابل ہے۔ اور مستحب صبر مستحبات کے انجام دینے پر ہونے والی دشواریوں کے مقابل ہے۔ حرام صبر جو بعض اذیت و آزار پر ہے جیسے انسان کے مال، جان اور ناموس پر دوسروں کے تجاوز کرنے پر صبر کرنا۔ صبر ناگوار اور مکروہ امور کے مقابل جیسے عاشور کے دن روزہ رکھنے کی سختی پر صبر کہ جو مکروہ ہے ان موارد کے علاوہ مباح ہے، لہٰذا ہمیشہ صبر پسندیدہ اور محبوب شئ نہیں ہے، بلکہ کبھی حرام اور کبھی مکروہ بھی ہوجاتا ہے[2]۔

ب۔ صبر کے درجات: بعض علماء اخلاق اور اہل معرفت ناگوار امور پر صبر کرنے (صبر خاص) کے لئے تین درجوں کے قائل ہوئے ہیں۔

۱۔ تائبین کا صبر: اور اس سے مراد ہے شکوہ کا ترک کرنا، بے تابی اور بے قراری کا ثبوت نہ دینا، اور غیر فطری اور پریشان کن رفتار نہ رکھنا۔

۲۔ زاہدین کا صبر: یعنی اول درجہ کے علاوہ جو سختیاں، درد والم انسان کے لئے مقدر ہوئی ہیں ان پر قلبی طور سے راضی ہونا۔

[1] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۳، ص۲۸۰، ۲۸۱؛ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں صبر کی تین قسم بیان کی ہے: مصیبت کے وقت صبر، طاعت و بندگی پر صبر، اور معصیت و گناہ پر صبر۔ کلینی، اصو ل کافی، ج ۲، ص ۹۱، ح ۱۵۔ اسی طرح بعض علماء اخلاق نے صبر کو اس وجہ سے دو قسم پر تقسیم کیا ہے متاع دنیا (سراء) پر صبر اور بلا (ضراء) پر صبر۔ ملاحظہ ہو نراقی، جامع السعادات، ج۳، ص ۲۹۳، ۲۹۴۔

[2] نراقی، جامع السعادات، ج۳، ص ۲۸۵۔

۳۔ صدیقین کا صبر: یعنی پہلے دودرجہ کے علاوہ نسبت اس چیز سے جو خدا وند عالم نے اس کے لئے معین کر رکھا ہے، عشق کرنا اور اسے دوست رکھنا[1]۔

ج۔ صبر کی اہمیت: کلمہ ''صبر''مختلف صورتوں میں سو بار سے زیادہ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے کہ جس سے خود ہی اس موضوع کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

قرآن کریم بعض بنی اسرائیل کی ہدایت وپیشوائی کے منصب تک پہونچنے کی علت کے بیان میں فرماتا ہے: ''اور جب انہوں نے صبر کیا اس حال میں میری آیتوں پر یقین رکھتے تھے تو ہم نے ان میں سے بعض کو پیشوا قرار دیا کہ وہ ہمارے حکم سے (لوگوں کی) ہدایت کرتے تھے[2]'' اور آخرت میں صابروں کی کیفیت جزا کے بارے میں ایک جگہ پر ان کے عمل سے بہتر جزا کا وعدہ دیتا ہے: ''یقیناً جن لوگوں نے صبر کیا تو جو انہوں نے عمل کیا ہے ہم انھیں اس سے بہتر جزا دیں گے[3]''۔

دوسری آیت میں صابروں کی مقدار جزا کی تعیین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: ''وہ لوگ کہ جنھوں نے صبر کیا اور نیکیوں سے برائی کو دور کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں روزی دی ہے اس میں سے انفاق کرتے ہیں اس لئے وہ لوگ دہری جزا پائیں گے[4]''۔

دوسری جگہ پر اعلان کرتا ہے کہ صابروں کا اجر اور ان کی جزا بے حد اور ناقابل شمار ہے اور وہ لوگ بے حساب جزا پائیں گے: ''بے شک صابرین اپنی جزا بے حساب پوری پوری پائیں گے[5]''اسی طرح خداوند عالم نے صابروں کو ہمراہی کا وعدہ دیا ہے۔

---

[1] نراقی، جامع السعادات، ج۳ ، ص ۲۸۴۔

[2] سجدہ ، ۲۴۔
[3] نمل، ۹۶۔
[4] قصص ، ۵۴۔
[5] زمر ، ۱۰۔

صبر کرو کیونکہ خدا صابروں کے ساتھ ہے[1]، وہ نصرت اور کامیابی کو صرف اور صرف صبر و شکیبائی کے سایہ ممکن جانتا ہے[2]''۔

ہدایت، درود اور رحمت پروردگار کو صابروں کے حق میں قرار دیتا ہے[3] صابروں کو اپنے دوستوں اور محبوبوں کے زمرہ میں بیان کرتا ہے[4] بارہا اور بارہا اپنے رسولوں اور تمام انسانوں کو صبر کی تاکید کرتا ہے[5] اپنے خاص بندوں کے بارے میں نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ خداوند سبحان سے صبر و شکیبائی کی توفیق کی درخواست کرتے رہے ہیں[6]۔

اس کے علاوہ مزید اور دسیوں مورد ہیں جو اسلام کے اخلاقی نظام میں صبر کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق ۔ بھی فرماتے ہیں: ''صبر ایمان کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو جسم کے لئے سر کی حیثیت ہے، جس طرح سر کے نہ ہونے سے جسم کا خاتمہ ہوجاتاہے اسی طرح اگر صبر نہ ہوتوایمان بھی جاتارہے گا[7]''۔

حضرت امام محمد باقر ۔ سے صبر کی اہمیت کے بارے میں نقل ہوا ہے: ''جنت ناگواریوں سے گھری ہوئی ہے لہٰذا جو بھی دنیا میں ناگوارچیزوں پر صبر کرے وہ بہشت میں جائے گا۔ اور دوزخ نفسانی خواہشات اور لذّات میں گھری ہوئی ہے، لہٰذا جو بھی نفسانی خواہشات ولذات کی تکمیل کرے گا، وہ جہنم میں جائے گا[8]''۔

د۔ صبر کے فوائد: صبر کے بہت سے دینی و دنیوی فوائد شمار کئے جا سکتے ہیں، منجملہ ان کے حضرت علی ۔ بعض گذشتہ امتوں کی عزت وذلت کے بارے میں اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں: ''جب خدا نے دیکھا کہ وہ کس طرح اس سے دوستی کی راہ میں اذیت و آزار پر صابر ہیں اور اس کے خوف سے ناگواریوں پر صبر و تحمل کرتے ہیں تو اس نے انھیں گرداب بلا سے نکال کر

---

[1] انفعال ، ۴۶۔
[2] آل عمران ، ۱۲۵۔
[3] بقرہ ، ۱۵۷۔
[4] آل عمران ، ۱۴۶۔
[5] احقاف ، ۳۵۔
[6] بقرہ ، ۲۵۰ ؛ اعراف ، ۱۲۶۔
[7] کلینی، کافی ج ۲، ص۸۹، ح ۵۔
[8] ایضاً، ح۷۔

گشائش عطا کی، اور ذلت و خواری کے بعد انھیں با آبرو بنایا اور سکون و اطمینان کو خوف کا جا گزیں بنادیا۔ پھر وہ حکمراں بادشاہ اور با عظمت و شان پیشوا ہوگئے اور خدا کی کرامت ان کے حق میں یہاں تک پہنچ گئی کہ دیدۂ آرزو ان کے آخری درجہ کہ وہ اس جگہ پہونچا ان کی نگاہ اور اس کی انتہا کو نہ دیکھ سکی[1]''۔

بعض علماء اخلاق نے صبر کو مقدرات الٰہی پر راضی رہنے کے مقام رضایت تک پہونچنے کا دروازہ قرار دیا ہے، اور مقام رضا کو محبت پروردگار کی وادی تک پہونچنے کا دروازہ جانا ہے[2] اس لحاظ سے صبر کے اہم فوائد میں سے اسی دنیا میں مقام ''رضا'' و ''محبت''تک رسائی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

''صبر'' کے لئے دیگر متعدد موضوعات بھی قابل ذکر ہیں، جیسے صبر و شکر میں مناسبتیں، صبر کے حصول کی راہیں اور اس کے مانند دوسرے موضوعات کہ اختصار کے پیش نظر ان کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲۔

[2] نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۳، ص ۲۸۳۔

تیسرا حصہ

اسلام کی نظر میں اخلاقی تربیت

پہلی فصل: اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے دوسری فصل: اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے تیسری فصل: اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے

پہلی فصل

اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے

مقدمہ: اخلاق اسلامی کے اصول اور مفاہیم سے آشنائی کے بعد یہ بات مناسب ہے کہ اپنے آپ سے سوال کریں ''نا مطلوب موجود ''کی حالت کو کس طرح ''ناموجود مطلوب'' سے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟

واضح عبارت میں اخلاقی تربیت کے طریقے کیا ہیں؟ تربیتی طریقے، کبھی خود تربیتی اپنے (لئے تربیتی) ہیں تو دیگر تربیتی کبھی دوسرے کے (لئے تربیتی) ہیں، کبھی قولی ہیں تو کبھی عملی، کبھی سلبی (روکنے والے) ہیں اور کبھی ایجابی (اصلاحی)، کبھی عام (یعنی تمام سن کے مراحل کے لئے) ہیں اور کبھی خاص۔

رفتار کے مبادی [1] کے پیش نظر ان اخلاقی تربیت کی روشوں کو جو رفتار یا اس کے مبادی یعنی ابتدائی مرحلوں سے تعلق رکھتی ہیں، تین چیزوں: شناخت، سبب اور رفتار کے اعتبار سے مورد توجہ قرار دیں گے اور تفصیل سے آئندہ مباحث کے ضمن میں ان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

---

[1]

چونکہ علوم تربیتی کی اصطلاحات (منجملہ اصول، روشیں، اہداف و مقاصد وغیرہ وغیرہ) کی دقیق تعریف محل اختلاف ہے اور ان کے سلسلہ میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں لہٰذا یہاں پر اس کتاب میں مورد نظر تعریف کی طرف اشارہ کریں گے۔ ''روش'' (طریقہ) سے مراد وہ کلی قوانین ہیں کہ ہر ایک جداگانہ طور پر یا دوسری روشوں کی مدد سے مقصد تک پہنچانے کی خصوصیت کی حامل ہیں۔ ہر روش کے تحقق کیلئے ممکن ہے کہ ہر ایک کے لئے مختلف اسلوب اور متعدد فنون پائے جاتے ہوں جو روشوں کی نسبت جزئی تر قوانین کا مقصود ہیں۔۱

۱۔ گذشتہ علماء کے نظریات کے مطابق مبادی رفتار اس طرح ہیں: فائدہ کا تصوّر، اس کی تصدیق، شوق موکد۔ معاصر ماہرین نفسیات نے اس سے مشابہ ایک دوسری ترکیب پیش کی ہے؛ وہ اس طرح ہے: شناخت، باعث اور عملی توانائی۔

روشوں کے بیان میں ایک عقلی ترتیب پائی جاتی ہے کہ آسان تر دیگر تربیتی روشوں سے شروع ہوتی ہے اور مشکل تر خود تربیتی روشوں پر ختم ہوتی ہے۔ یہ عقلی ترتیب انسان کے اخلاقی اور نفسیاتی رشد سے بھی منطبق ہے اور اسلام کی تربیتی تعلیمات سے بھی ہم آہنگ ہے۔

ہر روش کو اس کی تعریف اور توضیح سے شروع ہے اور بعد کے مرحلہ میں آیات وروایات سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا استناد اسلام سے ثابت کیا گیاہے پھراس کے بعد (یا اس کے ضمن میں) نفسیات کے علمی مطالعہ سے استفادہ کرتے ہوئے روش کی توضیح و تکمیل کی گئی ہے، یعنی نفسیات میں کون سے نظری اصول ومبانی کے ذریعہ اس روش کا دفاع کر سکتے ہیں اور اخلاقی تربیت میں اس کی تاثیر ثابت کی جاسکتی ہے، یہاں پر نفسیات کے اہم ترین نظریوں کے متعلق جو کہ تربیت اخلاقی سے مربوط ہیں بحث کی جارہی ہے۔

۱۔ **تربیت کے لئے مناسب ماحول بنانا** انسان کی تکوین اور تغییر کا اہم ترین عامل مختلف ماحول کے حالات میں خواہ وہ زمانی یا

مکانی یا اجتماعی ماحول ہو۔ بہت سے مقامات میں ماحول کی ترمیم واصلاح سے تربیت کے لئے مساعد اورسازگار ماحول فراہم کرکے جس کی تربیت کی جاتی ہے اس کی عادتوں، خصلتوں، افکار اور رفتار کو بدلا جا سکتا ہے اور جدید خصوصیات کو اس کا جاگزین بنایا جا سکتا ہے،

اس روش کی نفسیاتی بنیاد اس ماحول کے حالات سے انسان کے متاثر ہونے کی اصل ہے جو ماحول سازی (بعض رفتار کی ہمراہی اور ہمنوائی بعض دیگر کے ساتھ ان کے ثابت کرنے کا باعث ہوتی ہے)، فعّال وکردار ساز ماحول سازی (ایک ماحول میں خاص طرز عمل ورفتار پر جزا دی جاتی ہے) یا اجتماعی تعلّم وتربیت (رفتارکے مشاہدہ سے خاص نمونوں کی پیروی) کے نظریات کے بیان ہوتی ہے ضمن میں یہ روش خاص طور سے دوسروں کے ذریعہ اور انسان کے اولیاء کے ذریعہ بروئے کار لائی جاتی ہے، لیکن انسان خود بھی کسی حد تک موثر ہوسکتا ہے، اس روش کو وجود میں لانے کے جو طریقے لازم ہیں وہ ترتیب وار یہ ہیں :مقدمہ سازی، نمونہ سازی، ماحول کو صحیح و سالم بنانا اور حیثیت اور ماحول کو بدلنا۔

الف۔ مقدمہ سازی:اس سے مراد یہ ہے کہ مناسب ماحول فراہم کرکے اخلاقی فضائل کے وجود میں آنے کا امکان اعلی حد تک فراہم کریں اور اس کے برعکس ایسے مقدمات جو کہ منفی رخ رکھتے ہیں اور اخلاقی رذائل پیدا کر سکتے ہیں، ان کے وجود میں آنے کی روک تھام کریں، اس حصہ میں اسلام کی ہدایات قابل توجہ ہیں۔

ایک۔زوج یا زوجہ کے انتخاب میں کہ جو خاندان کا ایک رکن ہے، اس کے اخلاقی فضائل پر توجہ دینی چاہیے، انظر فی ای شی تضع ولدک فان العرق دساس[1] اس کے مقابل ایسے افراد جو غیر شائستہ گھرانے کے پروردہ ہیں، یاکم عقل اور احمق ہیں تو ایسے لوگوں سے شادی بیاہ کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

---

[1] فلسفی، کودک، ج ۱، ص ۶۴۔ حسن الاخلاق، برہان کرم الاعراق، افراد کی اخلاقی خصلتیں خاندان کی پاکیزگی اور فضیلت کی دلیل ہیں، غرر الحکم۔

حضرت امیرالمومنین علی ۔نے جومالک اشتر کو خط لکھا ہے اس میں اس کا رساز عنصر کی اس طرح تصریح فرمائی: ''ضروری ہے کہ اداری امور میں با فضیلت افراد سے استفادہ کرو ،وہی لوگ کہ جو نیک اور شریف خاندان سے ہوں اور اچھے ماضی اور نیک نامی کے ساتھ زندگی گذار چکے ہوں، جو لوگ عقل و ہوش، شجاعت و بہادری کے مالک، سخی اور بلند ہمت ہیں، وہ کرم کا مرکز اور نیکی و فضیلت کا سرچشمہ ہیں[1]''۔

لہٰذا ایسی اولاد جو شائستہ ماں اور با فضیلت باپ کی حمایت کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں اہم ترین مقدمہ ساز عنصر ماحول اور تربیت کے لحاظ سے ان کا مددگار ہے[2]۔

دو۔ اچھے نام کا انتخاب اولاد کا والدین پر جو حق ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے یہ ہے کہ۔ ''ہر انسان کی سب سے پہلے نیکی اس کے فرزند کے حق میں اس کا اچھا نام رکھنا ہے لہٰذا تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنے فرزندوں کا اچھا نام رکھو''۔ (اول ما یبر الرجل ولده ان یسمیه باسم حسن فلیحسن احدکم اسم ولده)[3]۔

نیک اور شائستہ نام تربیتی اور نفسیاتی اثر رکھتا ہے اور انسان کی صلاح و فلاح نیز خوبیوں کو فراہم کرنے کا مقدمہ ہے یا پھر اسے فرومائگی اور پستی کی سمت لے جاتا ہے۔ (الاسم یدل علی المسمی)۔

۳۔ محل زندگی کا انتخاب (ملک، شہر یا دیہات، محلہ اور پڑوسی کا انتخاب) بھی مقدمہ ساز عناصر میں ہے۔ اسی طرح محل تحصیل، کام کاج، احباب اور معاونین سب ہی (تربیت کی) راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں[4]۔

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ ۵۳۔
[2] جنٹک کے علاوہ کہ جن کا ذکر فی الحال مقصود نہیں ہے۔
[3] وسائل الشیعہ: ج ۱۵، ص ۱۲۲۔
[4] ہمنشینوں اور دوستوں کی تاثیر کے بارے میں اس کے بعد بحث کریں گے۔

ب۔ نمونہ سازی: کہا جا سکتا ہے کہ ہر ماحول کو بنانے والے اس سماج اور ماحول برگزیدہ اور سر برآوردہ افراد ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذ ایک اچھے تربیتی ماحول کی ایجاد کا ایک طریقہ اس ماحول میں اچھے نمونوں کو وجود میں لانا ہے اور برے نمونوں دور کرنا ہے۔ سماج میں پسندیدہ اور محبوب نمونہ خود بخود اس ماحول میں رہنے والوں کو ان کی طرف کھینچ لاتا ہے اور ان کے مکارم اخلاق کو دوسرے لوگ نمونہ بنا لیتے ہیں۔

آلبرٹ بنڈورا (۱۹۷۸) کہ جو اجتماعی تعلّم کے نظریہ کا واضع ہے۔ تعلّم (سیکھنے) کا سب سے اہم طریقہ مشاہداتی تعلّم کو جانتا ہے کہ وہی تقلید یا نمونہ کا اختیار کرنا ہے انسان ایک نمونہ یا سر مشق کا انتخاب کرکے اس کے عمل کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ بنڈ ورا اس طرح کے تعلّم کو چار مرحلہ میں توضیح دتیا ہے: مرحلہ توجہ، حافظہ کے حوالے کرنا، دوبارہ تخلیق اور سبب و محرّک۔ ممتاز صفات، عطوفت و مہربانی کا بار، پیچیدگی، برجستگی اور استعمالی اہمیت نمونہ میں اور حسّی ظرفیت، ابھارنے کی سطح، درک کرنے کی آمادگی اور گزشتہ تقویت مشاہدہ کرنے والے کے اندر نمونہ شخص کے عمل سے منطبق نتیجۂ عمل کی مدد کرتی ہے[۱]۔

زندہ نمونوں کے علاوہ جو کہ مساعد اور سازگار تر تیبی ماحول ایجاد کرتے ہیں مربی حضرات ماضی کے اخلاقی اور انسانی نمونوں کی شناخت کرا کے انھیں حیات نو عطا کر سکتے ہیں اور بنڈورا کے نظریہ میں مذکورہ خصوصیات پر نظر کرتے ہوئے بار عاطفی، ممتاز حالت، برجستگی وغیرہ کے اعتبار سے ان کے متعلق تاکید اور سرمایہ گذاری کر سکتے ہیں نمونوں کے دقیق موئثر اور محبوب چہرہ کی ترسیم تربیت پانے والوں کے لئے ان کے ذہن وروح میں حسب ضرورت نمونوں کے فقدان کے خلا کو پر کرسکتی ہے اور وہ تدریجاً ان کے مثل بن سکتے ہیں۔

[۱] روانشناسی پرورشی، ص ۳۱۴۔

قرآن کریم میں اس شیوہ سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، بالخصوص اکثر قرآنی نمونے جوان اور تاثیر گذار ہیں۔ یوسف شہوت کے مقابل قہرمان مقاومت، کہف کے جوان راہ خدا میں رشد و ہدایت کیلئے ہجرت کے نمونے، اسماعیل حکم خدا کے سامنے سر اپا تسلیم کی مثال اور ابراہیم عادت شکن اور بت شکن جوان ہیں۔

قرآن کے جوان نمونوں کے علاوہ دیگر نمونے بھی پائے جاتے ہیں کہ ان میں سے بعض درج ذیل ہیں :

دین کی تبلیغ میں نوح پایداری اور استقامت کا نمونہ، مصائب زمانہ اور شدائد روزگار پر ایوب صبر و تحمل کا نمونہ، طاغوت سے جنگ ومبازرہ کرنے میں داؤد شجاعت اور شہامت کا نمونہ وغیرہ وغیرہ، قرآن ان تمام حضرات کی شان میں فرماتا ہے: ''..... وہ لوگ(خدا کے پیغمبر) ایسے لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے لہٰذا ان کی ہدایت کا اقتدا کرو[1]''۔

بالآخرہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندگی کے تمام مراحل میں تمام عالمین کے لئے مطلق نمونہ ہیں، ''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ[2]'' کیونکہ آپ ''خلق عظیم'' کے مالک، ''مکارم اخلاق کا آئینہ'' اور ''رحمۃ للعالمین'' ہیں۔

ماں باپ اور ان کے بعد اساتذہ اور تربیت کرنے والے بھی تربیت سیکھنے والوں کے لئے پہلا نمونہ ہیں۔ تربیت کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اہم موقعیت وحیثیت کے مالک، زیادہ کامیاب، زیادہ علم ودانش یا معنوی بلندی کے مالک اکثر دوسروں کی نظر کو اپنی طرف جلب کرتے ہیں اور ان کے لئے نمونہ بن جاتے ہیں۔

خوش قسمتی سے طالب علموں کی نظر میں عام طور پر اساتذہ اور والدین ان خصوصیات کے یا ان میں سے بعض کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن بہر صورت اس برتری اور برجستگی کا نہ ہونا معنوی، علمی اور اجتماعی شعبوں میں تربیت پانے والوں کو کسی اور سمت لے جاتا ہے۔

[1] اولئک الذین ھدی اللہ فبھد یھم اقتدہ، سورۂ انعام، آیت ۹۰۔

[2]۔ سورۂ احزاب، آیت، ۲۱۔

حضرت امیر المومنین علی ۔ فرماتے ہیں: ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز میرے لئے اپنے مکارم اخلاق میں سے ایک کو بیان کرتے تھے اور مجھے اس کی پیروی کرنے کا حکم دیتے تھے ،حضرت امام موسیٰ کاظم ۔ فرماتے ہیں: ''بچے اپنے والدین کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے محفوظ ہوتے ہیں[۱]''۔

نمونہ سازی کے طریقہ سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے کم از کم دو اخلاقی اور تربیتی نکتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ؛ اول یہ کہ اس نے محبوب اور پسندیدہ افراد کو کلی طور پر نیز عام عنوان سے بیان کیا ہے، جیسے: تائبین، متطہرین، متقین، صالحین، صابرین، محسنین اور مجاہدین وغیرہ اور کبھی خاص طور سے اور نام کے ساتھ (پیغمبروں سے متعلق) بیان کیا ہے، لیکن قابل نفرت ومذمت افراد کا ذکر قرآن میں استثنائی موارد (جیسے ابو لہب) کے علاوہ کلی عناوین کے تحت ہوا ہے، جیسے: تجاوز کرنے والے، اسراف کرنے والے، خود پسند افراد، کفار، ظالمین اور متکبرین وغیرہ ۔

اس وجہ سے ہم کو بھی چاہیے کہ قرآن کریم کی پیروی کرتے ہوئے اسی روش کا انتخاب کریں کہ اخلاقی فضائل کی شناخت کرانے میں کلی عناوین بھی اور صاحبان فضائل کے اسماء بھی بیان کریں، منفی مقامات پر اشخاص کے نام بیان کرنے سے اجتناب کریں۔

دوسرے نمونوں کا انتخاب کرنا ہے، قرآن کریم ایک ساتھ محبوب اور منفور افراد کا ذکر کرکے انسانی سماج کو علم وآگہی کے ساتھ اپنے منظور نظر نمونوں کے انتخاب کی دعوت دیتا ہے، حتیٰ کہ گذشتہ آباء اجداد کے سلسلہ میں بھی آگاہ کرتا ہے کہ بغیر علم و آگہی کے ان کی اندھی تقلید کرکے اپنی زندگی تباہ و برباد نہ کریں۔انہوں نے کہا : ''ہم نے آباو اجداد کو ایک آئین پر پایا ہے لہٰذا ہم بھی انھیں کا اتباع کرتے ہیں ' اس (پیغمبر) نے کہا ''خواہ جس پر تم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے اس سے زیادہ ہدایت کرنے والا بھی تمہارے لئے لے آؤں تب بھی ایسا کرو گے[۲]''؟

---

[۱] یحفظ الاطفال بصلاح آباءھم، بحار الانوار ، ج ۵، ص ۱۷۸۔
[۲] سورۂ زخرف، آیت ۲۳، ۲۴۔

اس وجہ سے ہم پر لازم ہے کہ انسانوں کی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے نیز مطلوب نمونوں اور معیاروں کا تعارف کراتے ہوئے تربیت پانے والوں کے لئے آگاہانہ انتخاب کی راہ فراہم کریں۔

ج۔ماحول کو صحیح و سالم رکھنا: برے اور شر پسند افراد ہر ماحول اور سماج میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ بیشک فاسد اور برے ماحول اخلاقی تربیت کے معاملہ کو دشوار بلکہ بعض اوقات ناممکن بنا دیتا ہے، اس وجہ سے ماحول کو صحیح و سالم رکھنا کہ جو تقریباً امر با لمعروف اور نہی عن المنکر کے زندہ کرنے کے مساوی فریضہ ہے، سب کے لئے ایک عقلی، انسانی نیز دینی فریضہ ہے۔ اس طرز اور شیوہ سے مراد معاشرے کے تمام افراد کے اندر خوبیوں کی ایجاد اور ان کا احیاء کرنا ہے اور برے امور کو ختم کرنا ہے۔

درج ذیل نکات امر با لمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت اور ان کے پہلوؤں کو کہ جو دراصل معاشرہ میں اخلاقی تربیت کو آسان کرنے والے ہیں، زیادہ واضح کرتے ہیں۔

ا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس نکتہ کو واضح انداز میں اپنے دامن میں رکھتا ہے کہ دعوت ایک شناختہ شدہ شرعی اور عقلی معیار پر ہونی چاہیے[1] اس وجہ سے جب بھی بات شرعی واجب یا حرام کی ہو تو چاہیے کہ اس کی ثقافتی پشت پناہی ایجاد کی جائے اورایک معروف یا منکر کے عنوان سے اکثر لوگوں کے نزدیک متعارف ہو۔

ایسے حالات میں امر با لمعروف اور نہی عن المنکر کو عام مقبولیت حاصل ہوگی۔ بعبارت دیگر امر با لمعروف کی دشواری اور کلی طور پر اس کا قبول نہ ہونے میں مشکل نہیں ہے بلکہ مشکل ان خاص موارد اور مصادیق میں ہے کہ جن کا معروف یا منکر ہونا کافی حد تک مستدل طور سے لوگوں کے لئے واضح نہیں کیا گیا ہے۔

---

[1] المعروف'' اسم لکل فعل یعرف بالعقل او الشرع حسنہ والمنکر ما ینکر ھما (المفردات) معروف ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقل یا شرع کے ذریعہ نیک جانا جائے اور منکر ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقل یا شرع ناپسند کریں۔

۲۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سب کا فریضہ ہے، لیکن امر و نہی کرنے والے خاص شرائط کے حامل ہوں، منجملہ ان کے امر و نہی کے شرائط کی شناخت[1] (۲) نیز خود معروف اور منکر کی پہچان ضروری ہے، اس کے علاوہ یاد دہانی اور بیان کا طریقہ اس طرح ہو کہ زیادہ سے زیادہ تاثیر کی امید ہو۔

۳۔ امر با لمعروف اور نہی عن المنکر کے موارد کو وسیع ہونا چاہئے اور خاص مصادیق میں کہ جو اس وقت سماج اور معاشرہ میں زیادہ رائج اور شائع ہے (جیسے بے حجابی) میں محصور نہ ہو۔ اخلاق کے خلاف اعمال جیسے رشوت لینا، تہمت لگانا، غیبت کرنا اور بد گوئی وغیرہ ایک عام ثقافت اور تہذیب کی صورت میں معیّن شدہ نصائح اور نہی عن المنکر کا مورد واقع ہوں، تاکہ مثال کے طور پر بے حجاب یہ خیال نہ کریں کہ نہی عن المنکر ہمیشہ انہیں کے بارے میں ہے۔

د۔ موقعیت کا تبدیل کرنا: کسی ماحول کے حالات کی قوت اور اس کی اثر گذاری اس حد تک ہوتی ہے کہ صرف موقعیت اور حالات کے تبدیل کرنے سے اخلاقی تربیت حاصل ہوپاتی ہے۔ اگر چہ ماحول کی تبدیلی بہت زیادہ مالی اخراجات اور نفسیاتی بوجھ کی حامل ہوتی اخراجات ہے، ایک سا زگار تربیتی ماحول ایجاد کرنے کے لئے آخری طرز کے عنوان سے ضروری ہے۔ ''ہجرت'' منجملہ ان دستورات میں سے ہے کہ جس کی دین میں تاکید ہوئی ہے اور کبھی واجب حد تک پہونچ جاتی ہے۔ قرآن مجید کے بقول جب فرشتے کچھ لوگوں کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو وہ لوگ ماحول کے ناموافق ہونے کو اپنا عذر بیان کرتے ہیں، لیکن فرشتے کہتے ہیں ''...کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے[2]...

جو انسان ایسے گھر یا محلہ میں زندگی بسر کرتا ہے کہ وہاں کے رہنے والے اپنی یا اپنی اولاد کی شائستہ تربیت کے لئے موافق اور سازگار ماحول نہیں رکھتے وہ اسی طریقہ سے استفادہ کرتے ہوئے جدید امکانات کو اپنے اہل وعیال اور خاندان کے افراد کے رشد و تغیّر

[1] سورۂ توبہ، آیت ۷۱ اور ملاحظہ ہو: المیزان، ج ۳ ، ص ۳۷۳۔

[2] الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا۔۔۔ سورۂ نسا ء، آیت ۹۷۔

کے لئے فراہم کرسکتا ہے۔ اپنے یا اپنے اقرباء کے ناپسند ناموں کا تبدیل کرنا بھی اس خاص نفسیاتی ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے جو اسی سے پیدا ہوتا ہے تغییر موقعیت کے موارد میں شمار ہوتا ہے[۱]۔

ایسی نشست جس میں اخلاق کے خلاف اعمال کی روک تھام نہ ہو سکے اسے ترک کردینا چاہیے: ''مجرمین کے بارے میں وہ سوال کررہے ہوں گے: کس چیز نے تمہیں جہنم کی آگ میں جھونک دیا؟ وہ کہیں گے: ... ہم لوگوں کے برے کاموں میں شامل ہوجایا کرتے تھے[۲]۔

اسلام ایک مسلمان کے روزانہ کے معمول کی تعیین میں اسی طریقہ اور روش سے مدد لیتا ہے اور اسے مذہبی مراکز جیسے مساجد میں مسلسل حاضر ہونے کی دعوت دیتا ہے یہ اسے خود ہی ایک قسم کی تغییر موقعیت ہے اگر چہ ہجرت شمار نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ایک قسم کی اخلاقی تازگی اور شادابی انسان کو عطا کرتی ہے اور اسے ایک ہی طرح کے ماحول سے اور بسا اوقات روزانہ کے نامساعد اور غیر موافق ماحول سے جدا کردیتی ہے۔

۲۔ ضرورتوں کو صحیح طریقہ سے پورا کرنا ضرورتوں کو صحیح طریقہ سے پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ ضروریات زندگی کو ایک متعادل حد تک اخلاقی تربیت دینے اور بالاتر ضرورتوں کی تکمیل کرنے سے پہلے پورا کیا جائے۔ سبب اور محرک کے اثر کے پیش نظر جو کہ عمل کے اصول ومبادی میں سے ایک ہے، جب تک کہ انسان بھوک کے زیراثر یا جنسی میلان کے تحت تاثیر ہے یا کم از کم اپنی زندگی کیلئے کوئی پناہ گا ہ نہیں رکھتا، ایسا انسان اخلاق کی بلندیوں کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتا۔ اسلامی تعلیمات میں یہ نکتہ مورد توجہ واقع ہوا ہے، سورۂ ''قریش'' میں خداوند سبحان کی عبادت کی دعوت کا ذکر ان کی خوراک فراہم کرنے اور امنیت کے ذکر کے بعد ہوتی

[۱] ان رسول ا للّٰہ کان یغیّرا لاسماء القبیحۃ فی الرجال والبلدان، وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۱۲۴۔
[۲] یتساءَ لون عن المجرمین ما سلککم فی سقر قالوا... و کنا نخوض مع الخائضین، سورۂ مدثر، آیت ۴۰ تا۴۵۔

ہے: ''لہٰذا انھیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، وہی ذات کہ جس نے انھیں بھوک سے نجات دی اورنا امنی سے انھیں رہائی دلائی''۔ ''فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع وآمنھم من خوف[۱]''۔

مندرجہ ذیل آیات میں غور خوص کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی صفات، تقویٰ، شکر، اور عمل صالح وغیرہ انسان کی اوّلین ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد ذکر ہوئے ہیں: وکلوا مما رزقکم اللّٰہ حلالاً طیبا واتقوا اللّٰہ[۲] اور جو کچھ خدا نے تمہیں حلال اور پاکیزہ رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور خدا سے درتے رہو....

''یا ایھا الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم واشکروا اللّٰہ۔ اے ایمان لانے والو! جو ہم نے تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اس میں سے کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو.[۳]۔ ''یاایھا الرسل کلوا من الطیبات و اعلوا صالحا۔'' اے میرے رسولو! تم پاکیزہ غذائیں کھاؤ اور نیک عمل انجام دو...[۴]۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث ایک شریف میں زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے اثر کے سلسلہ میں اس سے بلند تر ضرورتوں پر نظر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ''اگر روٹی نہ ہوتی تو ہم نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے اور پروردگار کے واجبات کو ادا نہیں کر سکتے تھے[۵]''

اور دوسری جگہ پر فرماتے ہیں: ''قریب ہے کہ فقر و ناداری کفر و ناشکری کا سبب بن جائے[۶] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ طاہرین ۲۲۲کی سیرت میں بھی ہم ملاحظہ کرتے ہیں آپ حضرات عملی طور پر محرومین کی طرف توجہ دیتے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے، شب کے سناٹے اور سردی اور گرمی کے موسم میں بھی ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے[۷] اور یہی بات

---

[۱] سورۂقریش، آیت ۳، ۴۔
[۲] سورۂما ئدہ، آیت ۸۸۔
[۳] سورۂبقرہ ، آیت ۱۷۲۔
[۴] سورۂ مومنون، آیت ۵۱۔
[۵] فلو لا الخبز ما صلینا ولا صمنا ولا ادینا فرائض ربنا عز وجل۔ کا فی ،ج ۶، ص ۲۸۷۔
[۶] کاد الفقر ان یکون کفرا، کا فی، ج ۵، ص ۳ ۷۔
[۷] الحیاۃ، ج ۳، ص ۲۳۲تا ۲۳۴ ملاحظہ ہو۔

انوارہدایت کے درک کرنے کے مقدمات ان کے لئے فراہم کرتی تھی۔ حتی کہ دشمنوں سے ملاقات کے موقع پر بھی صلاح وہدایت کی دعوت سے پہلے ان کی معاشی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔

حضرت امام حسن ـکی سیرت نادان مخالفین کے ساتھ یہی انسانی روش اور سیرت تھی :ایک شامی نے معاویہ کے ورغلانے پر ایک دن امام حسنؑ کو گالی دی، امامؑ نے اس سے کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ خاموش ہوگیا، اس وقت آپؑ نے شیریں مسکراہٹ کے ساتھ اس کو سلام کیا اور فرمایا: '' بوڑھے آدمی! فکر کرتا ہوں کہ تو ایک پردیسی ہے اور خیال کرتا ہوں کہ تو راستہ بھول گیا ہے اگر مجھ سے رضایت طلب کرے گا تو تجھے رضایت دوں گا اور اگر کچھ ہم سے طلب کرے گا.

اور راہنمائی چاہے گا تو تیری راہنمائی کروں گا اور اگر تیرے دوش پر کوئی بوجھ ہے تو اسے اٹھا لوں گا اور اگر بھوکا ہے تو شکم سیر کردوں گا اور اگر محتاج ہے تو تیری ضرورت پوری کردوں گا، (خلاصہ) جو کا م بھی ہو گا اسے انجام دیدوں گا اور اگر میرے پاس آئے گا تو بہت آرام سے رہے گا کہ مہمان نوازی کے ہر طرح کے وسائل و اسباب میرے پاس فراہم ہیں''۔

وہ شامی شرمندہ ہوگیا اور رو کر کہنے لگا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ روئے زمین پر آپؑ خدا کے جانشین ہیں، خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے آپؑ اور آپؑ کے والد میرے نزدیک مبغوض ترین انسان تھے لیکن اب آپؑ سب سے زیادہ محبوب ہیں''، بوڑھا آدمی اس دن امام حسن ـ کا مہمان ہوا اور جب وہاں سے گیا تو حضرت کی دوستی کا دم بھرنے لگا[1]۔

آبراھام مزلو ہیومینسٹ ماہر نفسیات نے آدمی کے اغراض واسباب کی طبقہ بندی کے لئے جدید طریقہ پیش کیا ہے، اس نے ضرورتوں کے ترتیب و ار سلسلہ کو پیش کیا کہ جو زندگی کی اساسی ضرورتوں سے شروع ہوتا ہے اور اس سے بالا تر سطحوں میں نفسیاتی اغراض واسباب تک پہونچ جاتا ہے وہ کہتا ہے: ''..... انسان کی با مقصد حیات میں تنظیم کی اہم اصل اساسی ضرورتوں کی ترتیب

---

[1] بحار الانوار، ج، ۴۳، ص ۳۴۴۔

اولویت کے مراتب کے سلسلہ کی صورت میں کمتر یا بیشتر غلبہ کی قدرت کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ اہم محرّک جو اس تنظیم کا باعث ہوتی ہے وہ ضعیف تر ضرورتوں کا پیدا ہونا ہے جو کہ قوی تر ضرورتوں کو پورا کرنے سے ایک سالم انسان میں پائی جاتی ہے۔

جب بھی ضرورت زندگی پوری نہیں ہوتی، جسم پر غلبہ پا جاتی ہے اور تمام استعداد اور صلاحیتوں کو اپنے کنٹرول میں لے لیتی ہے اور ان صلاحیتوں کو اس طرح منظّم کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ان سے استفادہ کر سکے۔ نسبی رضا مندی ان ضرورتوں کو محو کر دیتی ہے اور بعد کے سلسلہ میں مراتب کی ضرورتوں سے بلند مجموعہ کو موقع دیتی ہے کہ وہ ظاہر ہوں، شخصیت پر غلبہ پاکر انھیں منظّم کریں اس طرح کہ، بھوک کا درد اٹھانے کے بجائے امن و سلامتی کے لئے پریشان ہو۔ یہ اصل سلسلہ مراتب میں ضرورتوں کے دوسرے مجموعوں یعنی محبت، احترام اور خود آگے بڑھنے اور ترقی کرنے پر بھی صادق ہے[۱]۔

اسی وجہ سے محتاج سماج اور اجتماع میں علمی، ہنری اور اخلاقی تخلیق کم وجود میں آتی ہے مزلو کا نظریہ ہے کہ سالم افراد بلند ضرورتوں کی طرف رخ کرتے ہیں، یعنی اپنی بالقوۃ استعدادوں کے عمل ہونے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور آس پاس کی دنیا کو پہچاننا چاہتے ہیں۔ مقصد، بے نیاز کرنا، تجربہ حیات کی توسیع، سرور و شادمانی کا اضافہ اور زندہ ہونے کی تحریک ہے....نیک اخلاقی صفات جن کو وہ '' وجود میں اقدار '' سے تعبیر کرتا ہے اس موقعیت کی طرف رخ کرتے ہیں۔ بعض ہستی کی قدریں اس کی نظر میں یہ ہیں: حقیقت (بے اعتمادی بد گمانی اور تشکیک کے مقابل)، نیکی (نفرت کے مقابل)، کمال (ناامیدی اور بے معنی ہونے کے مقابل)، یکتائی (بے ثباتی کے مقابل)، نظم (عدم امنیت واحتیاط کے احساس کے مقابل)، خود کفائی (ذمہ داری کو دوسروں کے حوالے کرنے کے مقابل)[۲]۔

---

[۱] انگیزش و ہیجان، ص ۱۰۱۔

[۲] اپنی جلوہ نمائی تحقق نفس تک ر سائی اور بالقوۃ توانائی کے لئے ذوقی تقارن خوبصورتی اور نظم تعارف، جاننا، سمجھنا، تلا ش کرنا، سنجیدگی، عزت نفس، کفایت، اجراء اور اصول تعلق و محبت کی ضرورت غیر سے وابستہ ہونا، سا لمیت کی ضرورت کی مقبولیت، امنیت کا احسا س اور خطرے سے دوری فیز یولوژیائی ضرورتیں، گرسنگی، تشنگی اور جنسی خواہشروانشناسی کمال، ص ۱۲۵۔

یہ نظریہ کہ انسان کمتر ضرورتوں کی طرف توجہ کئے بغیریا ایک حد تک ان کی تکمیل، انسانی فضائل کی طرف قدم نہیں اٹھاتا، یہ سماج کے اکثر افراد کے بارے میں صادق آتا ہےدو نکتوں کی طرف توجہ دیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ضرورتوں کو صحیح طور سے پورا کرنے کی روش ''اس بات کے علاوہ کہ دوسری روشوں کا مقدمہ ہے، خود اسے بھی ایک اخلاقی تربیت کی روش کے عنوان سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ پہلے یہ کہ ادنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے بلند ترین ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں، یعنی علّت وسبب کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ عمل کے علّی اور سببی جذبہ کا وجود تربیت اخلاقی کے ایک اہم حصہ کو منظّم کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے توانائیوں کو تخلیہ اورباطنی قوتوں کے اعتدال کے لئے آمادگی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ علماء اخلاق کے اخلاقی نظام میں ذکر ہوا ہے یہ نکتہ نہایت قابل توجہ اور اہمیت کا حامل ہے کہ سہ گانہ قوتیں شہوت، غضب، اور عقل، عدالت اور اعتدل کے سایہ میں ایک دوسرے کے ساتھ اکھٹا ہو جائیں۔ یہ رویہ یعنی اعتدال قوتوں کے استعمال کرنے میں تربیت اخلاقی کی ترقی میں ایک ناگزیر امر ہے۔

سید قطب الدین لکھتے ہیں: انسان کی تربیت کے لئے اسلام کے اسباب و وسائل میں ان ذمہ داریوں سے چھٹکارا دلانا ہے جو کبھی کبھی جسم و جان میں اکھٹا ہوتی ہیں اسلام ان باروں اور ذمہ داریوں کو اکھٹا جمع نہیں کرتا مگر یہ کہ انھیں چھوڑنے کے لئے یکبارگی جمع کرے[1]۔

اس روش کے محقق ہونے کے لئے لازم طریقے یہ ہیں: معاشی نظام کی جانب توجہ، ازدواج، ورزش اور کام کاج ۔

الف ۔معاشی نظام کی طرف توجہ: بہت سے اخلاقی جرائم کی بنیاد مال اور خوراک اور غذا کی کمی ہے۔ پہلے مرحلہ میں معاش کی فراہمی خانوادہ کے ذمہ ہے دوسرے مرحلہ میں حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ہے نیز اس نظام کے ذمہ ہے جو سماج پر حکومت

[1] روش تربیتی در اسلام، ص ۲۸۲۔

کررہا ہے اور تیسرے مرحلہ میں نیکو کا راور قدرت مند افراد کے ذمہ ہے ۔ بہر صورت تربیت کرنے والوں کی تگ و دو اس مسئلہ کی نسبت تربیتی نقطہ نظر سے تربیت اخلاقی میں بہت سے موانع کو دور کرنے والی ہے ۔

ب ۔ ازدواج: ازدواج کے تربیتی اور اخلاقی فوائد (جیسے خود خواہی و خود غرض سے دور ہونا، دوسروں کی خدمت کے لئے آمادگی اور ان کی طرف توجہ، عواطف و جذبات کا بار آور ہونا، محبتوں کا ثمر دینا اور ذمہ داری قبول کرنے کے لئے آمادگی وغیرہ وغیرہ) کے علاوہ ازدواج کا اہم اور ابتدائی کردار غریزہ جنسی کی ضرورت کو فطری اور شرعی طریقہ سے صحیح طور پر پورا کرنا ۔ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ ایسا جوان جس کا غریزہ جنسی شباب پر ہے اور ماحول کے بہت سے محرک بھی اس کے اندر اور زیادہ اس آگ کو بھڑکا رہے ہیں، وہ جوان سختی سے خود کو گناہ سے محفوظ رکھ سکتا ہے[1] ۔

پیغمبر ؐ نے فرمایا ہے : '' جب کوئی انسان شادی کرتا ہے تو اس کا نصف دین کامل ہو جاتا ہے لہٰذا بقیہ نصف کے سلسلہ میں اسے تقویٰ اختیار کرنا چاہئے[2] ''پیغمبر ؐ کے اس حکیمانہ ارشاد سے یہ نکتہ بھی قابل استفادہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ اور اخلاقی ورع، شادی کے بعد زیادہ آسان اور قابل حصول ہے ۔

ج ۔ ورزش: جسمانی ضرورتوں کو صحیح طور پر پورا کرنے میں اور جوانی کی قوتوں کی جلاء میں ورزش کا کردار قابل انکار نہیں ہے ۔ اخلاقی تربیت میں ورزش کا کردار دو جہت سے قابل اہمیت ہے :

اول ۔ وہ جسمانی سلامتی اور فرحت کہ جو ورزش سے پیدا ہوتی ہے، روحی، ذہنی اور نفسیاتی سلامتی نیز اخلاقی فضائل کے لئے مقدمہ ہوتی ہے ۔ ہماری تہذیب اور ثقافت میں قوت اور جوانمردی ہمیشہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ رہی ہیں ۔ ورزش اخلاقی توجیہ نبی اور ائمہ ۲۲۲کی سیرت میںآتی ہے ۔

---

[1] مراد یہ ہے کہ جنسی غریزہ جوانوں کو زیادہ مشکلات سے دو چار کرتا ہے، نہ یہ کہ کلی طور پر تربیت اور اصلاح کا راستہ ہی بند کردے

[2] اذا تزوج العبد فقد استکمل نصف لدین فلیتق اللہ فی نصف الباقی ۔ بحا ر الانوار، ج ۳ ۱۰، ص ۲۱۹۔''من تزوج فقد احرز نصف دینہ ، فلیتق اللہ فی النصف الباقي''۔بحار الانوار ،ج۱۰۳، ص۲۱۹۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے مردوں سے ملاقات کے وقت جو زور آزمائی کے لئے وزن اٹھا رہے تھے، فرماتے ہیں: ''لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر وہ انسان ہے جو خواہشات نفس پر غالب ہو[1]'' امیر المومنین ـ دعائے کمیل میں خدا سے جسمانی قویٰ کی تقویت کی درخواست خدمت الٰہی کے لئے کرتے ہیں، یارب.... قو علی خدمتک علی جوارحی ـ اس کے مقابل کمزور اور پست افراد تربیت کے خلاف امور انجام دیتے ہیں ـ

دوسری جہت ـ ضرورتوں سے توجہ ہٹانا ہے، بالخصوص جوانی کے زمانہ میں جنسی ضرورتیں اپنی تکمیل کا تقاضہ کرتی ہیں ـ ایسے حالات میں کہ ابھی جائز اور مشروع طریقہ سے صحیح طور پر جنسی خواہشات کی تکمیل کے امکانات فراہم نہیں ہوئے ہیں، ورزش ضرورتوں سے توجہ ہٹانے کا ایک مفید اور اہم ذریعہ ہے ـ

د ـ کام: کام کاج کے مسئلہ کو '' معاشی نظام کی طرف توجہ '' کی بحث میں ذکر کیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ اس کا اسلام میں ایک خاص مرتبہ ہے، اور استاد مطہری کے بقول: کام اسلام میں ایک مقدس اور پاکیزہ شے ہے[2]

نیز بہت سے تربیتی جہات اس میں پائے جاتے ہیں، لہٰذا ہم نے اسے جداگانہ طور پر ذکر کیا ہے، ایک طرف کام صحیح طور پر قوتوں کی جلاء اور اضافی بار کے تخلیہ کا موجب ہوتا ہے اور دوسری طرف شخصیت کے احساس، ذہنی علاج، تمرکز خیال، ضرورتوں سے توجہ ہٹانے ..... کا باعث ہوتا ہے، کہ یہ سب اخلاقی تربیت کے لئے معاون وسیلہ ہیں[3] ـ

---

[1] اشجع الناس من غالب هواه۔ میزان الحکمۃ، ج ۱۰، ص ۳۸۷۔

[2] تعلیم وتربیت در اسلام، ص ۴۱۱۔

[3] ان جملوں کی طرف توجہ دینا مذکورہ بالا مطلب کی تائید میں موثر ہے: سقراط: ''دیانت کے بعد کام نیک بختی اور سعادت کا سرمایہ ہے''۔ پاسکال: '' تمام فکری اور اخلاقی برائیوں کی جڑ بے کاری ہے جو ملک بھی اس عظیم عیب کو بر طرف کرنا چاہتا ہے اسے لوگوں کو کام پر آمادہ کرنا چاہئیے تاکہ اس سے روحی سکون کہ جس سے معدودے چند افراد آگاہ ہیں، حاصل ہو ''۔ ساموئل اسمایلز: '' دیانت کے بعد انسان کی تربیت کے لئے کام سے بہتر کوئی مدرسہ تعمیر نہیں کیا گیا ہے ''۔ بحوالۂ تعلیم و تربیت در اسلام، ص ۴۳۰۔

۳۔ احترام شخصیت کے طریقے اخلاق اسلامی کی اساسی بنیاد انسان کا اپنی ذاتی کرامت اور شرافت کی طرف توجہ دینا ہے:

''یقیناً ہم نے اولاد آدم کو کرامت سے نوازا (انھیں عزت عطا کی) ...اور انھیں اپنی بہت سی مخلوقات پر واضح فوقیت و برتری عطا کی[1]۔

خود آگاہی اور اس بات کی طرف توجہ کہ انسان ایک بلند و برتر مخلوق ہے اور اپنے اندر بے مثال اور قیمتی گوہر رکھتا ہے یہ بات اس کو (حب ذات کی بنا پر) اپنی ذاتی کرامت کی حفاظت و پاسداری کے لئے دعوت دیتی ہے اور اخلاق کی بلند قدروں کی طرف کھینچتا ہے: ''اکرم نفسک عن کل دنےۃ و ان ساقتک الیٰ الرغائب فانک لن تعتاض بما تبذل من نفسک عوضاً''[2] اپنے نفس کو ہر طرح کی پستی سے پاکیزہ رکھو! چاہے وہ پستی پسندیدہ اشیاء تک پہونچا ہی کیوں نہ دے کیونکہ جو اپنی عزت نفس تم دوگے اس کی قیمت اور عوض تمھیں کبھی مل نہیں سکتا۔

''انسان کی حقیقت'' چونکہ آسمانی قداست و پاکیزگی کی حامل ہے اور وہ علم، قدرت اور آزادی کے چشمہ سے سیراب ہوا ہے لہٰذا وہ جھوٹ، باطل، طبیعت کی اسیری، گراوٹ اور پستی و ذلت و شہوت اور جہل میں ہاتھ پاؤں مارنے کے مخالف ہے اسی وجہ سے ہوشیار انسان ہرطرح کے اخلاقی رذائل سے کہ جو اس کی عزت اور غیرت

سے منافات رکھتے ہیں، بیزار ہوتا ہے[3] اس کے مقابل ایک ایسا انسان جو ذلّت، پستی اور فرومایہ ہونے کا احساس کرے اور اپنے اندر پائی جانے والی عظیم شرافت پر یقین نہ رکھے، وہ ہر طرح کے ناپسند اخلاقی افعال کے ارتکاب سے بے پرواہ ہوتا ہے: اللئیم لا

---

[1] لقد کرمنا بنی آدم...... و فضلناھم علی کثیرممن خلقنا تفضیلا۔ سورۂ اسراء، آیت ۷۰۔
[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔
[3] الصدق عزّ والکذب عجز، سچ عزت (کا سبب) ہے کتاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۴۶ ؛ الغیبۃ جھد العاجز، مازنی غیور قط،غیبت عاجز کی کوشش ہے، کسی غیرتمند نے کبھی زنا نہیں کیا (نہج البلاغہ، ح ۲۹۷) ؛ الکذب والخیانۃ لیسا من اخلاق الکرام، جھوٹ اور خیانت اچھے اخلاق سے نہیں ہیں (غرر) وموت فی عز خیر من حیاۃ فی ذل ،عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر، (بحار الانوار، ج۴۴، ص ۱۹۲)

یستحی، اللئیم اذا قدر افحش واذا وعد اخلف، اللئیم لا یرجیٰ خیرہ ولا یسلم من شرہ ولا تؤمن غوائلہ، اللئیم مضاد لسائر الفضائل و جامع لجمیع الرذائل[1]۔

کمینہ شخص شرم نہیں کرتا، کمینہ جب قدرت پاتا ہے برائی کرتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے، کمینہ سے خیر کی امید نہیں کی جا سکتی اور اس کے شر سے محفوظ نہیں رہا جا سکتا اور اس کے فسادوں سے بے خوف نہیں رہا جا سکتا، کمینہ تمام فضائل کا مخالف اور تمام رذائل کا حامل ہوتا ہے۔ من ھانت علیہ نفسہ فلا تامن شرہ[2] جو انسان خود کو بے حیثیت سمجھتا ہو اس کے شر سے بے خوف نہ رہو۔

اس مطلب کی وضاحت نفسیاتی اعتبار سے خود انسان کے خیال واعتقاد سے ہماہنگ ہونا یا نہ ہونا ہے: ...اگر میں بے رحمانہ اور احمقانہ عمل کا مرتکب ہوں تو میری عزت نفس ملامت کا شکار ہوجائے گی۔ کیونکہ وہ عمل میرے ذہن کو اس امکان کی طرف متوجہ کرے گا کہ میں ایک بیوقوف اور ظالم انسان ہوں۔ سینکڑوں آزمائش کے درمیان کے عدم موافقت کے نظریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ واضح ترین نتائج ایسے حالات میں حاصل ہوئے ہیں ۔

جو انسان کی عزت نفس سے مربوط ہیں، کیونکہ جس طرح امید کی جاتی ہے کہ جو افراد زیادہ عزت نفس کے مالک ہیں، اگر ان سے بے رحمانہ اور احمقانہ رفتار سرزد ہو جائے تو دوسروں سے زیادہ نا موافقت کا احساس کرتے ہیں لیکن اگر کوئی انسان معمولی عزت نفس رکھتا ہو تو کیا پیش آسکتا ہے؟ اگر ایسا انسان غیر اخلاقی اور احمقانہ عمل کا ارتکاب کرے تو زیادہ ناموافقت کا احساس نہیں کرے گا ...دوسری طرف وہ انسان جوزیادہ عزت نفس کا مالک ہے، غالباً وہ ایک برے عمل کے ارتکاب کے وسوسہ کے مقابل مقاومت کرتا ہے، اس لئے کہ بے برے کام اس کے اندر زیادہ سے زیادہ نا موافقت ایجاد کردیتا ہے[3]۔

---

[1] غرر الحکم، تیسری فصل، ص ۲۶۰۔
[2] بحار الانوار، ج ۱۷، ص ۲۱۴۔
[3] روانشناسی اجتماعی، ترجمہ شکرکن، ص ۱۵۰ ، ۱۵۱

۔اس وجہ سے اخلاقی تربیت کی ایک روش شخصیت کا احترام ہے یعنی ایسے امور کا انجام دینا کہ جن سے خود کو یقین ہو یا جس کی تربیت کی جارہی ہے اس کو اپنی قدر و قیمت کا یقین حاصل ہو۔ ایڈلر، A. y.adler جوکہ ایک فردی نفسیات کا موجد ہے اس نے احساس کمتری کو اپنے نظریہ کی اساس قرار دی ہے اور اسے علت اور تمام غیر معمولی رفتار کی علت اور سر چشمہ سمجھتا ہے۔ احساس کمتری رنگین دھاگہ کے مانند جو نفسیاتی اختلال کے تمام حالات میں کھنچا ہوا ہے۔

ایک غصہ ور یا بے صلاحیت بچہ سن رسیدہ ہوکر بھی نفسیاتی تعادل کی قوت نہیں رکھتا ہے۔ نفسیاتی مریض، مجرمین، جنسی منحرفین اور روحی بیمار ساپنی نا رسائی اور ضعف کے احساس کا رنج و الم برداشت کرتے ہیں اور مسلسل شک وتردید اور گمراہی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ایک معتمد و مستحکم مرکز تلاش کرتے ہیں...احساس کمتری طبیعی ارتقا کے لئے رکاوٹ بنتا ہے

اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ بچہ مکمل اس احساس میں غوطہ لگاتا ہے اور لاحاصل ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود خود کو اس حالت سے نجات دینا چاہتا ہے، اس حالت میں بد گمانی اور وحشت احساس کمتری کی راہ کو کھول دیتی ہے اور بچہ نفسیاتی اختلال کا شکار ہوجاتا ہے، اس موقع پر ذہنی ونفسیاتی حرکت، سکون اور سکوت کا شکار ہوجاتی ہے، اس معنی میں کہ بچہ پھر اپنے ضعف اور نقائص کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوتاہے، ناچار اس کے علاوہ کوئی راہ نہیں رکھتا کہ خیالی تعادل بخشنے (جھوٹی تلافی) سے خود کو ماحول کے حوالے کردے۔

احساس کہتر نامی کتاب میں، ایڈلر کے نظریہ کی توضیح کے سلسلہ میں جو احساس کمتری سے پیدا شدہ زندگی کی روش کی اس طرح منظر کشی کرتے ہیں :احساس کمتری درجہ کیفیت اور سب سے پہلے نتیجہ کے اعتبار سے جو اس سے تجربے کے ضمن میں حاصل ہوتا ہے، انسان کے طرز زندگی کی تعیین کرتی ہے۔ یہاں پر تین اساسی ساز وسامان اور اس کے بعد تین طرز زندگی کو مشخص کیا جاسکتاہے، طبیعی جبران کا سازو سامان، گریز وناامیدی کا ساز و سامان اور خیالی جبران کا ساز وسامان۔

۱۔ طبیعی تلافی: یہ تلافی ایک نتیجہ خیز اساسی روش کے پایہ پر استوار ہے کہ جو نفسیاتی محوروں کی واقعی تعیین کرتا ہے، مثال کے طور پر ایک حادثہ کا شکار انسان کہ جو جسمی اور عضوی نقص رکھتا ہے، اسے صحیح کرنے یا مرکزی اعصابی مشین اور دیگر اعضاء کے وسیلہ سے اسی ایک تلافی کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے[۱]۔

۲۔ گریز اور ناامیدی: واقعیت سے فرار کرنے کے علاج یا ناکامی اور محرومیت کے ظاہر ہونے کے علاج کا ساز وسامان ایسے موارد میں استعمال ہوتاہے کہ جب طبیعی تلافی ممکن نہیں ہوتی ہے یا اس کے لئے راہ بند ہوجاتی ہےایسی صورت میں انسان اپنے آپ کوناتوانی اور شکست دوچار سمجھتاہے، اپنی نسبت شک کرتا ہے اور اس کے اندر قوت وجرأت کی کمی محوس ہوتی ہے، اس وقت وہ متعدد اور پے درپے شکستوں اپنے آپ کو پاتا ہے اور ناکامی کی وادی میں پے در پے غوطہ لگاتا رہتاہے، اور یہی شکستیں اس کے پہلے احساسات کو تقویت بخشتی ہیں ایسے موارد میں زندگی کا نقشہ مسٔولیت اور ذمہ داری سے گریز اور ہر قسم کی سعی و کوشش سے لاشعوری کے طور پردوری کری بنیادکھنچے جاتا ہے۔یہ المناک تغیر تدریجاً اور ہر دفعہ زیادہ خلاق انسان کی فعالیت کے دائرہ کو زیادہ سے زیادہ محدود کردیتا ہے۔

۳۔ خیالی تلافی: کچھ موارد میں گریز اور یاس کے غالب ہونے کے بجائے، انسان یا تو خیالی تلافی کی راہ کا انتخاب کرتا ہے یا ان صفات کو معمولی اور بے قیمت شمار کرتاہے جو دوسروں کے اندر پائی جاتی ہیں اور اس میں نہیں ہیں ۔ یا بلافاصلہ ایسی عیاشیوں میں لگ جاتا ہے کہ جو فکراور مشکلات کو وقتی طور پر اس کے ذہن سے دور کردیتی ہیں اور اسے ایسی لذتیں دیتی ہے کہ جو ایک منطبق و موافق عمل کے نتیجہ میں اس کو نصیب ہوتی ہیں [۲]۔

---

[۱] ایڈلر: روانشناسی فردی، ترجمہ حسن زمانی، ص ۵۹۔ ۲۔ ایضاً، ص۵۷۔

[۲] دکتر منصور، احساس کہتری، ص۶۰، ۶۱۔

جیسا کہ ملاحظہ ہوا، ایڈلر کے نظریہ کی بنیاد عملی اختلال کی وضاحت کے سلسلہ میں عزت نفس کے فقدان اور خود اس کی تعبیر کے مطابق احساس کمتری کے اثر پر استوار ہے۔

نفسیات میں من ازم کے نظرئیے بھی کلی طور پر انسان کے نفسیاتی وجذباتی ابعاد و جوانب اور اس کی نظر پر تا کید کرتے ہیں ان کے مشترک اصول درج ذیل ہیں :

۱۔ تمام انسان انقلاب و تحول کے بالاترین درجہ تک پہونچ سکتے ہیں،

۲۔ انقلاب و تحول کے راستہ میں آزادی کا وجود ان بلندیوں تک پہونچنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے

۳۔ عام طور پر موانع خارجی اور بیرونی ہیں۔

''مزلو''اور ''راجرز'' انسان کے اپنے شخصی اور تحقق کے لئے دوسروں سے زیادہ تاکید کرتے ہیں وہ طریقے اور فنون کہ شخصیت کی تنظیم کے حصول کے لئے جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں :

الف۔اکرام واحترام: مزلو ضرورت احترام کو مستقل طور پر ذکر کرتا ہے معاشرے کے نفسیاتیبیماروں کے علاوہ تمام افراد اپنے لئے احترام کے قائل ہیں، ان کی خواہش ہے کہ خود کو بااہمیت محسوس کریں اور اس اہمیت کی بنا محکم اور استوار پایہ پر رکھی گئی ہو۔۔۔توانائی، کامیابی، تجربہ، مہارت، شائستگی، دنیا کا مقابلہ، استقلال، آزادی، مرتبہ اور اعتبار کی ضرورت، (ایسی عزت واحترام کہ لوگ اس کے قائل ہوں) قدرومنزلت، افتخار، شہرت، نفوذ، اہمیت وبزرگی ان سب چیزوں کی طرف میلان اسی خواہش سے پیدا ہوتی ہیں۔۔۔جب اپنے احترام کی خواہش پوری ہوجائے توانسان اپنے خوداعتمادی، اہمیت، توانائی اور کفایت کا احساس کرتا ہے اور اپنے وجود کو دنیا میں مفید اور لازم سمجھتا ہے۔

لیکن ان ضرورتوں اور خواہشوں کا پورا نہ ہونا احساس کمتری، کمزوری اور نا امیدی کا باعث ہوتا ہےسالم ترین اور ثابت ترین عزت نفس، احترام کے اُس پایہ پر استوار ہے جس کے ہم مستحق ہیں۔ نہ یہ کہ ظاہری شہرت چاپلوسی اور خواہشات پر کارل راجرز بھی مکمل طور پر اس کا قائل ہے اور اپنے علاج کا طریقۂ کار اُسی کی بنیاد پر تلاش کرتا ہے۔ اس کی نظر میں دو اساسی چیزیں درج ذیل ہیں :

۱۔ ہر انسان کی عظمت و بزرگی نیز اس کی اہمیت کا نظریہ رکھنا۔

۲۔ اس بات کا معتقد ہونا کہ لوگ اچھے اور قابل اعتماد ہیں۔

راجرز کے علاج اور مشورت کا طریقہ مُراجع محوری کی بنیاد پر ہے؛یعنی تیکنیکی صرف اصالت و حقیقت، غیر مشروط مثبت تعین اور مخلصانہ درک کی نشاندہی کے لئے ہیں۔ احساسی اور جذباتی عناصر معالج اور مُراجع کے رابطہ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ و تیکنیکیںجو اس اکرام واحترام کے احساس کو ،جس کی تربیت کی جاتی ہے اس تک منتقل کر سکتی ہیں، یہ ہیں: موقع و محل کی طرف توجہ اور حضور ذہن رکھنا، اُس پر کان دھرنا، احساسات یا اس کی باتوں کے محتوا اور مفہوم کا ضروری مواقع میں انعکاس (اس لئے کہ تربیتپانے والا سمجھے کہ اس کی باتوں پر توجہ دے رہا ہے) گفتگو کے علاوہ دوسری نشانیا یعنی چہرہ، رخ اور جسم کی حرکتیں اس بات کی عکاسی کررہی ہوں کہ گویا وہ اس کی باتوں کو اہمیت دے رہاہے۔

۱۔ ''خلوص یا مخلصانہ درک'' متربی (یعنی جس کی تربیت کی جاتی ہے) سے رابطہ ایجاد کرنے میں اساسی کردار ادا کرتا ہے۔ راجرز کے بقول ہمدلی و خلوص ایک ایسا طریقۂ کار ہے جودیگرافراد کے متغیراحساسات کی نسبت حساس ہونے اوران کے درمیان عاطفی وجذباتی پیوند کا متضمن ہے۔ایک مدت تک دوسروں کی زندگی جینا اور ان کی احساساتی دنیا میں وارد ہونا اور ان کے احساسات کے بارے میں قضاوت سے اجتناب کرنا (ان کے احساسات کو سمجھنے کے لئے کوشش کرنا)۔ اسی طرح ہمدلی وخلوص مخاطب کے غیر

[1] مزلو، روان شناسی شخصیت سالم، ص۱۵۵،۱۵۴۔

کلامی علائم کے درک کا مستلزم ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہمدلی کے لئے سب سے پہلے تربیت پانے والے کے عاطفی تجربہ کو دقیق انداز میں درک کریں پھر اس کے بعد جو کچھ ہم نے سمجھا ہے کلمات اور اشاروں کے قالب میں اُس تک منتقل کریں۔ ہلکی مسکراہٹ، امید بخش نظر، کبھی اس کے شانہ اور جسم پر ہاتھ رکھنا اور ظریف انداز میں ہنسی مذاق کرنا اس سلسلہ میں مؤثر ہیں۔

ہمدلی، دوستی اور رابطہ برقرار کرنے کے لئے ایک مہارت ضروری ہے جن کا اکثر تربیتی طریقوں جیسے احترام واکرام میں مربی محتاج ہوتا ہے۔ اور اس کو چاہئے کہ اُس تک پہنچنے کے لئے اپنے اندر اس کی آمادگی پیدا کرے ''خود تربیتی طریقہ'' میں اپنی شخصیت کے ساتھ اسی رابطے کا ایجاد کرنا لازم وضروی ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ اور ائمہ معصومین ؑ کی سیرت دوسروں کے حق میں ان کے احترام واکرام سے بھری پڑی ہے جیسے: سلام کرنا نیز سلام کرنے میں پہل کرنا حتیٰ بہ نسبت بھی، بچوں بچوں کے ساتھ کھیلنا ؛ بچوں کے اچھے نام رکھنے کی تاکید کرنا نیز انہیں اچھے القاب سے پکارنا، نو وارد انسان کو جگہ دنیا جس کے بارے میں قرآن کریم کا صریحی حکم ہے[1]۔

نیک گفتاری اور خوش زبانی کی تاکید کرنا (قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُولُوا الَّتِیْ ہِیَ اَحْسَن[2]...) دسیوں دیگر احکام اور تاکیدات کے جو اسلامی معاشرہ میں مومنین کے احترام واکرام کی جانب توجہ کی حکایت کرتے ہیں یہاں تک کہ مومن کی حرمت اور اُس کی رعایت حرمت کعبہ سے بالاتر تصور کی گئی ہے[3]۔

اس کے علاوہ جو چیز بھی مسلمان کی ہتک حرمت اور توہین کا باعث ہو، اسلام میں اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ حضرت علی ؑ نے انبار شہر کے رہنے والوں سے جو ان کے استقبال میں پیادہ اور غلامانہ انداز میں آئے تھے، فرمایا :

---

[1] (یَااَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ...)سورۂمجادلہ، آیت ۱۱ .''ایمان والو! جب تم سے مجلس میں سعت پیدا کرنے کے لئے کہا جائے تو دوسروں کو جگہ دیدو تاکہ خدا تمھیں (جنت میں) وسعت دے... ''۔

[2] سورۂ اسراء آیت۵۳. ''میرے بندوں سے کہدیجئے کہ صرف اچھی باتیں کیا کریں

[3] حضرت امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا: ''المؤمن اعظم حرمۃ من الکعبۃ'' بحار، ۶۸، ص۱۶۔
مومن حرمت کے لحاظ سے کعبہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہ کون سا کام ہے جو تم انجام دیتے ہو؟انھوں نے جواب دیا کہ یہ ایک رسم ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے حکاّم اور فرمانرواؤں کا احترام کرتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا:خداکی قسم تمہارے فرمانروااور حکاّم اس کام سے کوئی استفادہ نہیں کرتے اور تم لوگ بھی اپنے اس عمل سے دنیا میں زحمت ومشقت اٹھاتے ہو۔اور آخرت میں بھی تمہاری بد بختی کا سبب ہے[1]۔

حتّٰی اُن موارد میں بھی کہ ایک عمل ظاہری طورپراکرام ہے لیکن حقیقت میں دوسروں کے ذلیل وخوار ہونے کا باعث ہے۔اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ حسین بن ابی العلاکچھ لوگوں کے ہمراہ مکہ کے سفرمیں ہم سفر ہوا۔ اورہر منزل پراپنے دوستوں کی مہان نوازی میں ایک بھیڑذبح کرتا تھا۔

اور جب سفرکے دوران حضرت امام جعفر صادق ۔کی خدمت میں آیا تو حضرت نے اُس سے کہا:آیامو منین کوذلیل وخوارکرتے ہو؟ حسین بن ابی العلانے امام کے سوال وجواب سے سمجھ گیا کہ اُس کے احباب تنگدستی کی وجہ سے اس کے مانند عمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے لہٰذاوہ اپنے آپ میں ذلت وخواری کا احساس کرتے تھے۔

تربیت پانے والے یا فرزند سے مشورہ کرنا بھی اس کے احترام واکرام کے مانند ہے وہ اس طریقۂ عمل سے خود کو عالی مرتبہ اور عظیم شخصیت خیال کرتا ہے، خداوند عالم حتیٰ پیغمبر اکرم ﷺسے فرماتا ہے: ''اپنی امت اور ماتحت افراد سے مشورہ کرو[2]''۔ فرزند کے لئے کسی گھریا کمرہ کا مخصوص کرنا (جبکہ اس کا امکان ہو) اور بطور کلی ہر قسم کی مالکیت اور تملک کا احساس بھی ان امورمیں سے ہے کہ جوانسان کے احترام واکرام کے احساس کا باعث ہے۔

ب۔بغیر شرط کے مثبت توجہ: محبت اور علاقہ انسان کی اساسی ضرورتوں میں سے ہیں جن کا مختلف ماہرین نفسیات نے مختلف انداز میں کیا ہے، کارن ہورنائے[Hornay,k] ان دونوں کو ''محبت'' اور ''تصویب اعتبار ومحبوبیت '' کے عنوان کے

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۳۷۔
[2] (وَشَاوِرْہُم فِی الْاَمْرِ)سورۂآل عمران، آیت۱۵۹۔

تحند کر کرتا ہے، جان بالبی[Bowlbyj]نے ''محبت ودل بستگی'' کے مفہوم کو اپنے نظریہ کی بنیاد قرار دی ہے اور بچے کی سیرت کے رشدوارتقاء کو دلبستگی کی ضرورت صحیح طور سے پوری کرنے میں خیال کیاہے۔ مزلو جسمانی اور امن وسلامتی کی ضرورتوں کی تأمین وتضمین کے بعد تعلق اور محبت کی ضرورت کو سب سے اہم ضرورت سمجھتاہے۔

محبوب دوستوں کا نہ ہونا ایک بیوی اورایک بچے کو شدت سے احساس ہوتاہے۔وہ دوسروں کے ساتھ عاطفی روابط کے محتاج ہیں بعبارت دیگروہ اپنے گروہ یاخاندان اور فیملی میں ایک مرتبہ کا محتاج ہیں۔ نفسیاتی کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ عشق و محبت کی ضرورتوں سے بے بہرہ ہونا ناکامی اور ناسازگاری کی بنیادہے[1]۔

راجرز کے نظریہ کے مطابق مثبت توجہ بغیر شرط کے انسان کے اندر عزت ونفس کا احساس پیدا کرتی ہے جو کہ دوسروں کی طرف سے خصوصاً اپنے سرپرستوں کی طرف سے گرم اور محبت آمیز، تعلقات روابط،قلبی لگاؤ، قبولیت اور مہربانی کو شامل ہے بے قید وشرطتوجہ مثبت اس معنی میں ہے کہ جوتاثیر وتاثرایک انسان سے دوسرے انسان کے روابط کی بنیاد پر اور اس احساس سے وجود میں آتی ہے کہ تربیت پانے والا ہرصورت میں ایک بااہمیت شخص ہے۔

اگر انسان احساس کرے کہ محبت(مثبت توجہ) اُس صورت میں حاصل کرے گاکہ جب دوست رکھنے کے قابل ہو تو اپنے اندر سے تنفر وبیزاری کے احساس کو دور کرکے دوست رکھنے والی تصویر باقی رکھنے کی کوشش کرتاہے، یہاں پر نہ یہ کہ احساس تنفر خود اس کے خیال میں ناموافق ہے بلکہ انسان کو مثبت توجہ کے کھو جانے پر بھی تہدید کرتا ہے ،ایسے موقع پر زبردستی اس پر فضیلت پیدا کرنے کے شرائط کو لادنا تجربیات کے انکار کا موجب ہوتاہے اور جسم اور اس کی شخصیت درمیان شگاف پیدا ہوجاتا ہے، لیکن اگر والدین (یا مربی) اپنے فرزند کی طرف بدون شرط اور مثبت توجہ رکھتے ہوں اور وہ احساس کرے کہ والدین اس کی اہمیت کے قائل ہیں، تو انکار تجربیات کی پھر کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔

---

[1] روانشناسی شخصیت سالم، ص۱۵۰تا۱۵۴۔ ۲۔ روانشناسی شخصیت ، ص۲۲۱۔

بے شک توجہ مثبت بدون شرط تربیت حاصل کرنے والے کی شخصیت کے احترام وتکریم کا باعث ہوگی اور اس کے اندر عزت نفس کا احساس پیدا کرے گی۔ اہم بات یہ ہے کہ تربیت پانے والا خود ہی یہ احساس کرے کہ وہ ایک منفرد اور مشخص انسان کے عنوان سے مربی کی توجہ اور عنایت کا مرکز ہے،

اگر یہ احساس ثابت ہوجائے تو اس کی ہر ناپسند رفتار وکردار کی (صحیح طرز کے ساتھ) مخالفت کی جا سکتی ہے لیکن اسی حال میں یہ احساس بھی رکھتا ہو کہ خود اُس کو لوگ دوست رکھتے ہیں اور مخالفت حقیقت میں اس کے ناپسندیدہ اعمال ورفتار سے ہے، جیسا کہ قرآن کریم حضرت لوط ۔ کی زبانی ان کی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے :(قَالَ اِنِی لَعَمَلِکُمْ مِن القَالِین[1]) ''انھوں نے کہا: میں تمہارے کردار کا دشمن ہوں''۔

حضرت علی ۔ نے بھی حضرت رسول خدا ﷺ کی حدیث نقل فرمائی ہے '' :اِنَ اللّٰہ یُحِبُّ العَبْدَ وَیَبْغُضُ عَمَلَہ....[2]''۔ ''خداوند سبحان کبھی کبھی کسی بندے کو دوست رکھتا ہے لیکن اس کے عمل کو دشمن رکھتا ہے''۔

بچوں کے ساتھ برتاؤ کے سلسلہ میں بھی روایات میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ قلبی لگاؤ اور نرمی کے ساتھ برتاؤ کرو، انھیں بوسہ دو، ان کے مہر و محبت میں کمی نہ کرو تاکہ محبت کی احتیاج ان کے اندر نفسیاتی الجھنوں وبیماریوں میں تبدیل نہ ہوجائے، جو شخص دوسروں کی محبت سے بہرہ مند ہوا، وہ دوسروں کے ساتھ احسان و محبت کر سکتا ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں : ''بچوں کو دوست رکھو اور انہیں اپنے رحم وکرم کے سایہ میں قرار دواور جب بھی اُن سے وعدہ کرو تو اُسے وفا کرو[3]''۔ حضرت امام جعفر صادق ۔ بھی فرماتے ہیں'' :خداوند سبحان ضرور بالضرور اپنے اُس بندے کو جو اپنی اولاد سے بہت محبت کرتا ہے مورد رحمت قرار دیتا ہے[4]'' ''اپنے فرزندوں کو زیادہ بوسہ دو، کیونکہ بہشت میں ہر بوسہ کے بدلہ ایک درجہ ہوگا[1]''

---

[1] سورۂشعراء، آیت ۱۶۸۔
[2] نہج البلاغہ، خ۱۵۴۔
[3] ''أَحِبُّوا الصبیان وارحموہم وَاذا وعدتموہم شیئاً ففولہم'' کافی، ج۶، ص۵۲۔
[4] ''انّ اللّٰہ لیرحم العبد لشدّة حُبّہ لولدہ'' کافی، ج۶، ص۵۲۔

محبت اور مہربانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور سیرت ہے، نیز انسانوں کی اخلاقی تربیت ہدایت میں آپ کی کامیابی کا راز بھی یہی نکتہ ہے: ''فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم''[۲]

پس اللہ کی رحمت وبرکت سے آپ کے ساتھ نرم خو اور پُر محبت ہیں، اور اگر تند خو اور سخت دل ہوتے تو یقیناً آپ کے آس پاس سے وہ لوگ پراگندہ ہوجاتے۔ لہٰذا اُن سے درگذر کیجئے اور اُن کے لئے بخشش ومغفرت طلب کیجئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور سیرت کے لئے بھی جو اُن کو پتھر مارتے تھے، دعا کرتے تھے: ''اللھم اھد قومی فانھم لایعلمون''[خدایا! میری قوم کی ہدایت کر اس لئے کہ وہ نہیں جانتی ہے]وہ انسانوں کے ساتھ بدون شرط مثبت توجہ کا بالاترین درجہ ہے کہ جو اللہ کی تمام مخلوقات سے گہرے لگاؤ اور عشق سے حاصل ہوتا ہے۔

البتہ توجہ مثبت بلاشرط کی توفیق، صرف تمام انسانوں کے ساتھ عشق کرنے کے نتیجہ میں ممکن ہے۔ اہم یہ ہے کہ نکتہ خالص اور بے ریا محبت دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور گہرے لگاؤ اور شخصیت کے احترام کا باعث ہوتی ہے، نہ کہ جو کچھ تکلف اور دکھاوے سے پیدا ہوتی ہے۔

اپنے عشق و محبت کو اپنے فرزندوں یا تربیت پانے والوں میں ظاہر کرنے کے لئے ہر فرصت سے استفادہ کرنا چاہئے، جیسے اوقات ان کے ساتھ ہم گذاریں؛ مشترک رابطوں اور چاہتوں کو پروان چڑھائیں؛ باہم کھیلیں، ان سے کہیں کہ ہم تمھیں دوست رکھتے ہیں، اُن کے ساتھ اس طرح برتاؤ رکھیں کہ گویا وہ روئے زمین کی سب سے اہم انسان ہیں، ان کے پائدار اور ناقابل فراموش آثار وواقعات وجود میں لائیں، ان کی تعریف کریں وغیرہ وغیرہ[۳]...

---

[۱] ''اکثرو من قبلۃ اولادکم فانّ لکم بکلّ قبلۃٍ درجۃً فی الجنّۃ۔''وسائل الشیعہ، ج۱۵، ص۲۰۲۔
[۲] سورۂآل عمران، آیت ۱۵۹۔
[۳] استفان مارستون، معجزہ تشویق، ترجمہ تور اندخت تمدن، ص۸۱۔

محبت کا ظاہر کرنا اور اس کا بیان کرنا عاطفی روابط میں بہت اہم ہے۔ روائی کتابوں میں اس سلسلہ میں مستقل اور جداگانہ باب پایا جاتا ہے: حضرت امام جعفر صادق ـ نے فرمایا: ''جب کوئی کسی انسان کو دوست رکھے تو اسے اطلاع دے کیونکہ یہ دوستی کے پائدار ہونے کا موجب ہوگا[1]''

خداوند سبحان بھی حضرت موسیٰ ـ کی نسبت اس طرح سے محبت کا اظہار کرتا ہے: ''یقیناً دوبارہ بھی ہم نے تم پر احسان کیا جب ہم نے تمہاری ماں کو وحی کی ... اور اپنی مہر و محبت کو تم پر ڈال دیا تاکہ میرے زیر نگرانی پرورش پاؤ[2]۔'' اور اپنے حبیب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان کی قسم کھاکر محبت اور لطف کا اعلان کرتا ہے: ''آپ کی جان کی قسم وہ لوگ اپنی مستی میں سرگرداں ہیں[3]'' قرآن کی مختلف تعبیریں لوگوں بالخصوص مومنین کی نسبت خداوند عالم کے بے پایان لطف وکرم کو بیان انسانوں کے عظیم مربی کے عنوان سے بیان کرتی ہیں، قومی، عبادی، ''اِنی اَخافُ علَیکُم، ہَل لکَ۔ یاایُّہا الذِیْن آمنوا۔''وغیرہ۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ محبت کے اظہار میں ہمیں اعتدال اور میانہ روی کی رعایت کرنا چاہئے اور محبت میں افراط سے ہمیں اجتناب کرنا چاہئے؛ کیونکہ یہ چیز فرزندوں کو بے حوصلہ وبے اعتماد بنادیتی ہیں، اس وجہ سے مشکلات زندگی کے موقع پر حقارت (کمتری) اور ناتوانی کا احساس کرتے ہیں، کیونکہ سماج اور جس ماحول میں وہ ہیں اس میں اتنی محبت اور مہربانی انھیں نصیب نہیں ہوگی۔ محبت میں افراط تربیت پانے والے کی تربیت میں تاثیر کو زائل کردیتی ہے۔

حضرت امام محمد باقر ـ فرماتے ہیں: ''سب سے بُرے آباء وہ ہیں جو محبت اور نیکی میں افراط سے کام لیتے ہیں[4]''

ج۔ اغماض (چشم پوشی): کمزوریوں اور خطاؤں کا اظہار عزت نفس کے برباد ہونے اور شخصیت کے پامال ہونے کا باعث ہوتاہے، لہٰذا ان سے اغماض اور چشم پوشی ان کے لئے تربیت پانے والے کی شخصیت کی تعظیم وتکریم ہوگی۔ جب کسی سے کوئی خطا

---

[1] ''اذا احببت رجلاً فاخبره بذلک فانّہ اثبت للمودة بینکما '' کافی، ج۲، ص۶۱۵، باب اخبار الرجل اخاه بحبہ (انسان کا اپنے برارد ایمانی اپنی محبت کی اطلاع دینا کو۔

[2] (وَلَقَدْ مَنَّنَا عَلَیْکَ مَرَّةً اُخْرىٰ۔ والقیت علیک محبّةً منی ولتضع علی عینی)(سورۂطٰہٰ، آیت ۳۷تا ۳۸)

[3] (لَعَمْرُکَ اِنَّہُمْ لَفِی سَکْرَتِہِمْ یَعْمَہُوْنَ)سورۂ حجر، آیت۷۲۔

[4] '' شر الاٰباء من دعاه البرالی الافراط ''(تاریخ یعقوبی، ج۳، ص ۵۳)۔

سرزد ہو یا خطا کا احتمال دیں۔ تو اس کی اخلاقی تربیت اور حفظ عزّت نفس کے لئے تین مرحلے نظر میں رکھے جا سکتے ہیں :

۱۔ صحت پر حمل کرنا چاہیئے یا اس کی اچھے طریقہ سے توجیہ کرنی چاہیئے؛ خطا کے ثابت ہونے سے پہلے اگر خطا کی توجیہ کرنے کے قرائن اور احتمالات موجود ہوں تو صحت پر حمل کیا جا سکتا ہے جو کہ اسلامی فقہ میں ایک مسلم الثبوت اصل ہے۔

لہٰذا احتمال خطا کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہیئے اور اپنے تجسس اور کھوج سے کشف فساد اور ایک مسلمان کی آبروریزی کا باعث نہیں ہونا چاہیئے۔ حضرت علی ـ نے فرمایا '' :اپنے [ایمانی] بھائیوں کے کام کی اچھے سے اچھے عنوان سے توجیہ کرو یہاں تک کہ اس کے خلاف تم پر ثابت ہو جائے، نیز ان کی باتوں کی نسبت بھی جب تک کہ اچھی توجیہ کا امکان ہے بدگمانی نہ کرو[1]''۔

۲۔ تغافل اور تجاہل: اگر تربیت پانے والے کی خطا ثابت ہو جائے لیکن وہ پہلی مرتبہ تھی اور حالات کے مطابق ہم تشخیص دیں کہ اس کو نظرانداز کرنا اور اس کی شخصیت کا تحفظ اصلاح کا باعث ہوگا تو تغافل اور تجاہل سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ؛یعنی یہ ظاہر کریں کہ یہ خطا اس سے سرزد نہیں ہوئی ہے اور اس کی توجیہ کو بھی قبول کریں، باوجودیکہ اس کے صحیح نہ ہونے سے باخبر ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق ـ فرماتے ہیں'' :دوسروں کے ساتھ معاشرت اور زندگی گزارنے کے حالات کی اصلاح ایک ایسے ظرف کے مانند ہے جس کا دو ثلث [دو تہائی] زیرکی اور ایک ثلث [ایک تہائی] تغافل ہے[2]'' ''جزئی امور سے تغافل کر کے خود کو بلند مرتبہ اور عالی قدر بناؤ[3]''۔

---

[1] ''ضَع اَمر اَخِیکَ عَلیٰ اَحسنہ حتّیٰ یاتِیکَ مَایقلبک عنہ وَلَاتظنُّنَّ بکلمۃ خرجت من اخیک سواءً وانت تجد فی الخیرسبیلاً'' (کافی، ج۲، ص۳۶۲)۔

[2] ''صلاح حال التعایش والتعاشر ملاء مکیال ثلثاہ فطنۃ وثلثہ التغافل ''۔(اخلاق فلسفی، ص۳۵۹)۔

[3] ''عظموا اقدارکم بالتغافل عن الدنی من الامور'' ۔(ایضاً، ص۲۲۴)۔

حضرت علی ـ نے فرمایا: ''تجاہل وتغافل سے بہتر کوئی زندگی نہیں ہے[۱] تغافل تربیت حاصل کرنے والے کی تکریم و تعظیم کے علاوہ اسے اس بات کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے مربی کے کرم و بخشش کی تلافی کرے اور یہی امر اس کی اصلاح اور خطا کے دوبارہ نہ کرنے کا سبب بنے گا ـ

۳ـ عفوودرگذر: خطاکے مسلم اورآشکارہونے کے بعد، اب بھی چشم پوشی اور نظرانداز کرنے کی گنجائش پائی جاتی ہے اگر ہم یہ احتمال دیں کہ دوسروں کی خطاکو معاف کرنا ان کی بیداری اوراصلاح کا باعث ہوگی (کہ عام طور پر ایساہی ہے) توعفوکرناہی بہترہے۔ خداوند غفور سماج اور معاشرہ میں ایک جاری وساری سیرت کے عنوان سے عفوودرگذرکی تاکید کرتاہے: (خُذِ العَفْوَ[۲]) ـ ''اے پیغمبر!عفوودرگذرکواپنا شعاربنالو'' ـ

ان لوگوں سے درگذرکرو اور ان سے چشم پوشی کرو کہ خدانیکوکا روں کودوست رکھتاہے[۳]عفوودرگذرکرنا چاہئے کیا تم نہیں چاہتے کہ خداتمہیں معاف کردے اور خدابخشنے والااور مہربان ہے[۴]روایات کی نظرسے بھی عفوودرگذشت مکارم اخلاق اورسماجی اور اجتماعی روابط میں نمایاں مرتبہ کا حامل ہےاور دوسروں میں اخلاقی فضائل کی راہ ہموارکرنے والاہے.

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''ایک دوسرے کو معاف کروتاکہ تمہارے درمیان سے کینے اور کدورتیں ختم ہوجائیں[۵]عفوودرگذرخداکے بندوں کی عزت میں اضافہ کرتاہے، لہٰذا عفوکروتاکہ خداتمیں عزیز قرار دے[٦] ـ

حضرت علی ـ سے منقول ہے: ''عفوودرگذشت تمام مکارم اخلاق کا تاج ہے[۷] ـ

---

[۱] ''لاعقل کالتجاہل ''(غرر الحکم ودرر الکلم۔)
[۲] سورۂاعراف، آیت۱۹۹۔
[۳] (فَاعْفُ عَنْہُمْ وَاصْفَحْ، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ)(سورۂمائدہ، آیت ۱۳)۔
[٤] (وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا، اَلَاتُحِبُّوْنَ اَن یَغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ۔)(سورۂنور، آیت۲۲)۔

[٥] ''تعافوا تقسط الضغائن بینکم''(کنز، ۷۰۰۴)۔
[٦] ''العفو لایزید الّا عزاًفاعفوا یعزکم اللّٰہ''۔ (ایضاً، ۱۲،۷۰)۔

[۷] ''العفو تاج المکارم۔''(غرر الحکم، فصل دوم، ص۲۴۵)۔

قرآن بھی فرماتاہے: (فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ[۱])آپ خوبصورتی کے ساتھ درگذر کردیں۔ ''صفح'' ترشروئی اورعتاب کے بغیردرگذر کرنے کے معنی میں ہے۔قدرت رکھنے کے باوجودمعاف کردینے کے بارے میں روایات میں بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔ حضرت امام حسین ۔ فرماتے ہیں: ''لوگوں میں سب سے زیادہ درگذر کرنے والا وہ ہے جو قادر ہونے کے باوجود معاف کردے۔[۲]

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''بہترین عفو درگذشت وہ عفوودرگذشت ہے کہ جوقادرہونے کے باوجودمعاف کردی جائے۔[۳]'' انھوں نے اپنے فرزند حضرت امام حسن ۔ سے وصیت میں عفو و درگذر کو سزا سے زیادہ انسان کی صلاح کاباعث جاناہے: ''جب تمہارے نزدیک کسی سے کوئی خطا سرزد ہوجائے، تو عادلانہ درگذر عقلمند کے لئے سزاسے زیادہ موثرہے[۴]۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی عفوکو موجب اصلاح جانتے ہیں :ایک انسان نے اپنے خدمت گزار وں کے رویہ کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی۔تو حضرت نے فرمایا : انھیں معاف کردو تا کہ ان کے دل نیکیوں کی طرف مائل ہوں ''۔عرض کیا : اے پیغمبر خدا !وہ لوگ کاموں میں سستی کرتے ہیں !فرمایا : انھیں معاف کردو[۵]۔

اغماض وچشم پوشی کے ذریعہ بغیر رفتار کے نفسیاتی نقطۂ نظر (اس کے تحریکی پہلو کے علاوہ) ''خاموشی'' کے طریقہ سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے: خاموشی اس طریقۂ کارکو کہا جاتا ہے کہ اُس میں رفتار کا واقع ہونا بغیر تقویت کے رہ جائے اور تکرار ایک رفتار کی تقویت کے بغیر اُس رفتار کے مکمل توقف کا باعث ہوتی ہے۔.مثال کے طور پر استاد نا مطلوب رفتار سے بے اعتنائی کرے تو طالب علموں

---

[۱] سورۂحجر، آیت۸۵۔
[۲] ''ان اعفی الناس من عفی عنہ قدرتہ ''(بحار، ج۷۴، ص۴۰۱)۔
[۳] ''احسن العفو کان عن قدرة''(غرر الحکم، فصل دوم، ص۲۴۶)۔
[۴] ''اذا استحق احدٌ منک ذنبا فان العفو اشدّ من الضرب لمن کان لہ عقل''(بحار، ج۷۷، ص۳۱۶)
[۵] مستدرک الوسائل، ج۲، ص۸۷۔

کے شور شرابہ کو خاموش کرسکتا ہے[1] البتہ عفو و درگذر کے خاموشی سے بھی کہیں زیادہ عمیق معنی پائے جاتے ہیں، اگرچہ عام طور وہ پر خاموشی کا مستلزم ہے۔

ذمہ داری دینا: جب انسان خود کو قوی اور توانا محسوس کرتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ اُس سے کوئی کام ہوسکتا ہے تو وہ افتخار وعزت کا احساس کرتا ہے، تربیت پانے والے انسان کی تکریم کے لئے اُس کے اندر عزت کا احساس پیدا کرنا چاہئے، تاکہ اُس سے ذلت اور کمتری کا احساس جاتا رہے، لہٰذا ضروری ہے کہ تربیت پانے والے کی توانائیوں کے ظاہر ہونے کا امکان پیدا کریں تاکہ اسے یقین ہو کہ اس سے بھی کام ہوسکتا ہے.

اور وہ بھی کسی کام کا آدمی ہے تربیت پانے والوں اور فرزندوں کے درمیان ذمہ داری دینا اور کاموں کو تقسیم کرنا اُن کی شخصیت کی تعظیم و تکریم کا باعث ہوتا ہے اس کے دوسرے موارد اخراجات کی تنظیم کا امکان،انتخاب اور کسی بات کے طے کرنے کے لئے مہلت دینا، بعض ذمہ داریوں کو سپرد کرنا وغیرہ ہے، اور ذمہ داری کی سپردگی اگر عاقلانہ اور ظریف نگرانی کے ساتھ ہو تو اخلاقی تبدیلی کا باعث ہوسکتی ہے، مندرجہ ذیل داستان نے ''پیاژہ'' نامی معاصر نفسیات کو حیرت میں ڈال دیا ہے، توجہ فرمائیے: ۱۹۳۰ء سنہ ۔ اور ۱۹۳۵ء سنہ ۔ کے درمیان میں نے ایک مؤسسہ وادارہ کا دیدار کیا تو وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوا، یہ مؤسسہ مجرم بچوں سے مخصوص تھا اور یورپ کے مشرقی علاقے میں واقع تھا، یہ ایک ماہر اور مدبر مدیر کے زیر ادارت تھا ، وہ چاہتا تھا کہ جن بچوں اور نوجوانوں کی اُس نے ذمہ داری لے رکھی ہے، ان پر اعتماد کرے، یہاں تک کہ مؤسسہ کے نظم وضبط کو ان کے حوالے کردے اور اہم ترین ذمہ داری اُن میں سے شریر ترین کے حوالے کردے.

اس تجربہ کے دو پہلو نے ہمیں مخصوص انداز میں اپنی طرف مائل کیا، ایک نووارد اور تجربہ کار افراد کی ''تربیت'' دیگر نوجوانوں کے اجتماعی گروہ کے ذریعہ اور دوسرے موسسہ کی داخلی نظم وضبط اور اشارے عدالتی امور بھی ان شاگردوں کے سپرد تھے جو روز

---

[1] سیف، تغییر رفتار ورفتار درمانی، ص۳۸۲۔

شب پر محیط تھے، ذرا تصور کریں ان پر اس قدر اعتماد کہ مدرسہ کے قواعد اور دستورات کو شاگردوں کی جماعت معین کرتی ہے نہ بزرگ افراد، نو وارد افراد میں کیا اثر رکھتی ہے۔

جہاں پر جو بچے اور نو جوان کسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے اور بچوں کے عدالتی محکمہ نے انھیں مجرم قرار دیا تھا اور وہ لوگ طولانی تادیب اور سزا کے منتظر تھے، یکبارگی خود کو اُن نوجوانوں کے درمیان دیکھتے تھے کہ جو جرم کے تمام مراحل گذارنے کے بعد اپنا علاج کرکے نئی زندگی چاہ رہے تھے، ایک منظم گروہ رکھتے تھے اور بلافاصلہ نووارد افراد کو اپنے جرگہ میں قبول کرکے تمام امور، فرائض اور ذمہ داریاں ان کے حوالے کردیتے تھے، کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جب ایسے افراد زندان کے داروغہ سے روبرو ہونے کے بجائے اپنے ساتھیوں سے ملاقات کرتے تھے تو یکبارگی بدل جاتے تھے اور پھر اس کے بعد ان میں کج رفتاری کی تکرار نہیں ہوتی تھی اس مؤسسہ کے ادارہ کرنے والے عظیم مربی کی خوبصورت ترین ایجادیہی بات تھی اگر اس ادارہ کے شاگردوں سے کوئی خطا سرزد ہوتی تھی تو وہ عدالت اُس خطا کی تحقیق کرتی کہ جو ان ہی شاگردوں سے تشکیل پائی تھی اس حیرت انگیز عدالت کی نظریہ اور اس کے احکام وہاں کے اخبار میں شائع ہوئے تھے۔[1]

قرآنی آیات اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت دوسروں کو (خصوصاً نوجوانوں کو) ذمہ داریاں سونپنے کے بارے میں اُن کی استعداد کو بڑھانے اور ان کی شخصیت کا احترام کرنے کے لئے بہت سے واقعات کی نشاندہی کرتی ہیں مثلاً طالوت جیسے جوان کا انتخاب بنی اسرائیل کی قیادت کی ذمہ داری کے لئے، اسامہ کی کمانڈری اور مصعب بن عمیر نامی جوان کا مدینہ کے لئے سب سے پہلے مبلغ کے عنوان سے تعارف کرانا وغیرہ۔

۴۔ اخلاقی اقدار کی دعوت دینا جبکہ پہلی دو روشوں کے مطابق موانع برطرف ہوجائیں اور ماحول موافق وسازگار ہوجائے نیز تکریم شخصیت کی روش سے باطنی آمادگی پیدا ہوجائے مربی کلی استفادہ کے ذریعہ اخلاقی اقدار کی دعوت کی کلی روش سے استفادہ کے ذریعہ

[1] پیازہ: تربیت رہ بہ کجا می سپارد، ۱۰۱، ۱۰۲۔

تربیت پانے والوں کو اخلاقی فضائل کی طرف مائل وجذب کرسکتا ہے، بعبارت دیگر ''اقدار کی تبلیغ'' کرسکتا ہے[1]۔

علم نفسیات تبلیغ کے مخصوص شرائط کو تین عنصر پیغام دینے والے (مبلغ) پیغام لینے والے اور پیغام میں لحاظ کرتا ہے کہ جو پیغام کی تاثیر اور نفوذ کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔پیغام کی بعض مسلّم الثبوت خصوصیات درج ذیل ہیں :

۱۔ مخاطب کو اپنی جانب جلب (مائل) کرے۔ (نیاپن رکھتا ہو اور دیگر امور سے الگ اور ممتاز ہو)۔

۲۔ مخاطب کے نزدیک قابل درک ہو۔

۳۔ اہمیت کے لحاظ سے مخاطب کے نزدیک قابل قبول ہو۔

۴۔ اسے حفظ کرسکتا ہو اور بوقت ضرورت اُسے یاد کرسکتا ہو۔

۵۔ ایک موضوع کے مثبت اور منفی (قوت وضعف) دونوں پہلو بیان کئے جائیں۔

۶۔ پیغام کی تکرار، ترغیب و دلچسپی کے اثر کو مزید بڑھا دیتی ہے، اس شرط کے ساتھ سستی اور خستگی کا باعث نہ ہو۔

۷۔ ایسے پیغامات جو زیادہ خوف ودہشت کے حامل ہوتے ہیں کمتر تاثیر رکھتے ہیں، کیونکہ اضطراب اور گھبراہٹ کو اس درجہ بڑھا دیتے ہیں کہ انسان اس کی صحت کا انکار کرنے لگتا ہے، مگر یہ کہ اُسے کسی اور ذریعہ سے یقین ہوچکا ہو۔

۸۔ پیغام دینے والا یا مبلغ محبوب، باحوصلہ، مخلص، مطمئن، وفادار، قابل اعتماد، عاقبت اندیش، ہوشیار اور صادق ہو۔

پیغام اس بات کے لئے جو کہ خارجی اور مخالف دباؤ کے مقابل تاب لاسکے (قدرت بخش سکے) اس طرح سے جاگزین ہو کہ پیغام قبول کرنے والے کی دلچسپی میں اضافہ ہوجائے :

---

[1] تربیت پانے والا بھی ''خود تربیتی'' روش سے استفادہ کے ذریعہ پیغام دینے والے، پیغام لینے والے اور پیغام کی شرائط ملاحظہ کرسکتا ہے اور زیادہ صحیح اور مطلوب کاانتخاب کرسکتا ہے۔

۱۔ نئے پیغام کو دیگر یقین واعتقاد کے ساتھ مخلوط کرے۔

۲۔ اپنے یقین واعتقاد کی دلیلوں کی تحقیق کرے۔

۳۔ متعارض دلیلوں کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھے اور صحیح ترمیم یا اہم تر کا انتخاب کرے۔

۴۔ رائے اور نظریہ کا بدلنا اپنے آزادنہ انتخاب کے زیر اثر ہو نہ کہ ترغیب دلانے والے کی زور زبردستی سے اس روش کو منطق کی کتابوں میں ''خطابہ'' کہتے ہیں اور اس طرح تعریف کرتے ہیں: خطابہ ایک ایسا علمی طریقہ ہے جس کی مدد سے لوگوں کو اُس چیز میں خاموش جس کی تصدیق کی ہم امید رکھتے ہیں، بصورت امکان خاموش اور قبول کرایا جاسکتا ہے۔ جو امور خطابہ کی تاثیر کو زیادہ کردیتے ہیں، بعض قائل سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ علمی یا اجتماعی اعتبار سے اپنا تعارف کرائے (دوسرے لوگ بھی یہ کام کر سکتے ہیں)

۲۔ اس طرح ظاہر ہوکہ اس کی تعظیم وتکریم نیز اس کی باتوں کی تصدیق کا باعث ہو، جیسے یہ کہ لباس، ہاتھ اور جسم کی حرکتوں، آنکھوں کے اشاروں، حزن و مسرت کی حالت وغیرہ کے اعتبار سے میٹنگ (جلسہ) اور موضوع سخن سے ہم آہنگ اور مرتبط ہو۔
۳۔ ''بات کرنے میں'' اس کی آواز غرض کے مطابق ہو (کبھی بلند تو کبھی آہستہ اور کبھی ترجیع تو کبھی تقطیع و....) آواز کا اچھا ہونا، اچھے انداز میں پیش کرنا اور طرز بیان میں تصرف اور تبدیلی بھی اہم امور میں سے ہے۔

۴۔ ''مخاطبین'' کے عواطف واحساسات کو جلب کرے اور ان کے اندر اس طرح نفسانی تأثر کی حالت اور ذہنی آمادگی ایجاد کرے کہ جو غرض کے مطابق ہو، کبھی رقت و رحمت کی حالت تو کبھی خشم ونفرت کا انداز اور کبھی تبسم اور مسرت ایجاد کرے، اس بات کے لئے کہ جلسہ خشکی اور جمود کی حالت سے خارج ہوجائے اور قائل کی طرف متوجہ ہونیکی کیفیت حالت، ان کے اندر

---

[1] مظفر، المنطق، ص۴۱۵اور اس کے بعد (اس فرق کے ساتھ کہ یہاں پر مفہوم زیادہ عام اور صناعت شعر کو بھی شامل ہوتا ہے)۔

ایجاد کرے، کبھی ضروری ہے کہ انھیں لطیفوں کے ذریعہ ہنسائے یا کسی حکمت آمیز نکتہ سے انھیں حیرت میں ڈال دے کبھی مخاطبین کی تعریف وتوصیف لازم ہے (اعتدال کی حد میں) لیکن ان کی ہر طرح کی توہین و تحقیر سے پر ہیز کیا جائے۔

۵۔ شہادت حال، یعنی عملی صداقت کے گواہ بھی قائل کی بات کے نفوذ میں موثر امور میں شمار ہوتے ہیں، اس طرح سے کہ فضیلت، صدق، امانت، علم اور معرفت سے مشہور ہو یا دوسری جہت سے محبوبیت رکھتا ہو یا یہ کہ اس کی گفتگو میں صدق وصفا اور اخلاص کی علامتیں ظاہر ہوں حضرت امیر المومنین علی۔ کے بقول: ''کوئی بھی شخص کچھ اپنے دل میں پنہاں نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کی زبان کے اچانک کلماتہیں یا چہرے کے آثار سے ظاہر ہوجاتا ہے[1]''۔

بعبارت دیگر قائل کو چاہئے اپنے بیان پر ایمان رکھتا ہو، کیونکہ جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں اثر کرتی ہے'' ''آپ حکمت اور اچھی نصیحت (موعظہ) کے ذریعہ اپنے رب کی راہ کی طرف دعوت دیجئے اور اُن سے بہترین انداز میں بحث وجدال کیجئے۔[2]

قرآن کریم کی زبان میں اس روش کو ''موعظہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے البتہ موعظہ و نصیحت روش کے مرادی جنبہ کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، لیکن قرآن کی اس سہ گانہ تقسیم میں تقریباً اقدار کی دعوت کی روش سے ہم آہنگ ہے۔

موعظہ یعنی انسانوں کے عواطف واحساسات سے[3] انھیں حق کی دعوت دینے کے لئے استفادہ کرنا۔ قرآن نے موعظہ کو صفت ''حسنہ'' سے مقید کیا ہے، کیونکہ: ... نصیحت اُس صورت میں موثر واقع ہوتی ہے کہ ہر طرح کی خشونت، تند کلامی، فوقیت طلبی، طرف مقابل

---

[1] ''ما اضمر احد شیئاً الّا ظہر فی فلتات لسانہ وصفحات وجہہ'' (نہج البلاغہ کلمات قصار ۲۶)۔
[2] سورۂنحل، آیت۱۲۵۔
[3] مفردات راغب معجم مفردات الفاظ قرآن، میں اس کے دومعنی ذکر ہوئے ہیں: ١۔''ایسی زجر وتوبیخ جو خوف دلانے کے ساتھ ہو''کہ جو اقدار کی دعوت کے فنون اور طریقوں میں شمار ہے۔

کی تحقیر وتوہین، ضد اور ہٹ دھرمی وغیرہ سے خالی ہو لہٰذا موعظہ اُس وقت اپنا گہرا اثر چھوڑتا ہے کہ احسن اور خوبصورت انداز میں بیان ہو[1]۔

اخلاقی اقدار کی دعوت کے طریقے درج ذیل ہیں: الف۔ انذار وبشارت: انذار [2] یا ترہیب ڈرانے اور ہوشیار کرنے نیز بُرے اعمال کے بُرے نتائج اور عواقب کی طرف انسان کو متوجہ کرنے کے معنی میں ہے کہ اس میں ایک قسم کا ڈرانا بھی ہے۔ ''تبشیر'' (بشارت دینا) یا ترغیب انسان کو نیک امور اور مطلوب کاموں کے نتائج سے آگاہ کرنے کے معنی میں ہے کہ جو سرور و شادمانی کا باعث ہے۔

انسان فطری طور پر لذت اور نعمت کی طرف راغب ہوتا ہے اور درد والم سے اجتناب و دوری چاہتا ہے۔ اسی لئے اگر انذار وتبشیر مخاطب کے قبول کرنے اور اس کے یقین کے مطابق ہو تو موثر ہے، یعنی اگر مخاطب فکری واعتقادی اصول ومبانی کے لحاظ سے تصدیق کرے کہ یہ عمل ان لذتوں کا حامل ہے یا فلاں آلام کا باعث ہے تو بلاشبہہ ایسا انذار یا تبشیر موثر واقع ہوگا۔

قرآن کریم اور انبیائے الٰہی نے اس وسیلہ سے کثرت سے استفادہ کیا ہے، جیساکہ قرآن تمام انبیاء کو ''مبشرین اور منذرین'' کہتا ہے[3] اور خود کو ''نذیر[4]'' اور ''بشریٰ[5]'' کہتا ہے۔

انذار وتبشیر سے استفادہ کرنے میں قرآن کریم کے تربیتی انداز میں دو نکتہ قابل توجہ ہے :

---

[1] تفسیر نمونہ، ج١١، ص ۴۵۶۔ المیزان میں بھی یہ بات ایک دوسرے انداز سے بیان کی گئی ہے: ''من ہنا یظہر انّ حسن الموعظہ انما ہو من حیث حسن اثرہ فی الحق الذی یراد بہ بأن یکون الواعظ نفسہ متعظا بمایعظ ویستعمل فیہا من الخلق ما یزید وقوعہا من قلب السامع موقع القبول فیرق لہ القلب ویقشعر بہ الجلد ویعیہ السامع ویخشع لہ البصر''۔''ہو التذکیر بالخیر فیما یرق لہ القلب '' خیر کے ساتھ نیصیحت کرنا اس چیز کے بارے میں جس کے لئے دل نرم ہوجائے۔کہ یہی عام معنی یہاں پر مراد ہے۔ المیزان، ج١٢، ص٣٧٣۔ تفسیر نمونہ، ج١١، ص۴۵۵ پراسی عام معنی کو قبول کیا ہے۔

[2] ''الانذار اخبار فیہ تخویف کما ان التبشیر اخبار فیہ سرور۔'' (المفردات)۔

[3] سورۂانعام، آیت٨۔

[4] سورۂمدثر، آیت٣۶۔

[5] سورۂبقرہ، آیت٩٧۔

ایک۔ قرآن کریم میں انذار وتبشیر کا انسانی عواطف واحساسات کے اجاگر کرنے کا اہم رول ہے کہ ایک طرف خوف[۱]، خشیت[۲] اورخشوع[۳] خداوندعالم کی نسبت مخاطبین میں برانگیختہ کرتا ہے اور دوسری طرف محبت[۴]، شوق[۵] اور امید ان کے دل میں پروان چڑھاتا ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے درمیان ایک موازنہ ایسا توازن وتعادل ایجاد کرتا ہے کہ جو نہ یاس اور ناامیدی کا باعث ہوتا ہے اور نہ ہی غرور و بے خیالی کا روایات میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ مبلغ کو چاہئے کہ مخاطبین کو خوف ورجا کے درمیان رکھے[٦]۔

دو۔ انذار وتبشیر کے مصادیق کا استعمال: قران کریم میں اس کا دائرہ وسیع ہے، خداوندعالم ہر انسان کے لئے ''رضوان'' اور ''روح''و ''ریحان'' کی بات نہیں کرتا، بلکہ بعض کو لذیذ غذاؤں خوبصورت اور زربخت لباسوں، فرحت بخش تفریح گاہوں وغیرہ کے وعدےسے امید وار کرتاہے ۔ لہٰذا اخلاقی تربیت کے سلسلہ میں بلند پروازی نہیں کرنی چاہئے،بلکہ افراد کی استعداد اور ظرفیت کے مطابق، مختلف بشارتوں اور نعمتوں سے متعلق گفتگو کرنی چاہئے۔

ب۔ داستان گوئی: داستان میں ایسا جادو ہوتا ہے کہ جو روحوں کو مسحور کرلیتا ہے، وہ کونسا جادو ہے اور کس طرح روحوں پر اثر انداز ہوتا ہے؟کوئی انسان بھی اس کے لئے حد و حدود معین نہیں کرسکتا آیا یہ خیال ہے کہ جو داستان سے پیدا ہوتاہے اور داستان کے محل وقوع اور منزلوں کی یکے بعد دیگر تعقیب کرتا ہے اور اُسے ذہن میں ایک محسوس واقعیت سے تبدیل کردیتا ہے؟ یا انسان کے ''وجدان کی مشارکت'' داستان کے ہیرو کے ساتھ ہوتی ہے کہ جو آدمی کی روح میں اس کی تاثیر کا باعث ہوکرواضح اور روشن انداز میں احساسات وافکار میں جاگزیں ہوجاتی ہے؟

---

[۱] (لمن خاف مقام ربہ جنتان)(سورۂرحمن، آیت۴۶)۔
[۲] (انما انت منذر من یخشاہا۔)(سورۂنازعات، آیت ۴۵)۔
[۳] (الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم لذکر اللّٰہ۔) (سورۂحدید، آیت۱۶)۔
[٤] (والذین آمنوا اشدُّ حبّاً للّٰہ۔)(سورۂبقرہ، آیت۱۶۵)۔
[٥] (ان الذین آمنوا۔۔اولٰئک یرجون رحمۃ اللّٰہ۔)(سورۂبقرہ، آیت۲۱۸)۔
[٦] ''خیر الاعمال اعتدال الرجاء والخوف''۔ (غرر الحکم، فصل ۴،ص ۱۵۶)۔

یا داستانی موقعیت سے انسان کی روح کے متاثر ہونے کی وجہ سے ہے، جب انسان عالم خیال میں خود کو اس کے حوادث وواقعات کے درمیان داخل تصور کرتا ہے اور دور سے ماجرے کا نظارہ کرتا ہے، لیکن یہ چاہتا ہے کہ نجات دینے والا یا نجات یافتہ ہو؟ جو بھی ہو داستان کی یہ سحر انگیز تاثیر قدیم الایام سے انسان کے ساتھ رہی ہے، ہمیشہ اس کی زندگی کے ساتھ روئے زمین پر سیر کرتی رہی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوگی[1]۔

داستان گوئی ایک ایسا طرز اور اسلوب ہے کہ جو جذابیت اور سامع کو اپنے ہمراہ کرنے کے علاوہ داستان کے اغراض ومقاصد کو قبول کرنے کے لئے عاطفی راہ بھی ہموار کرتی ہے قرآن کریم نے انسانوں کی اخلاقی تربیت کے لئے داستان کا زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا ہے داستان سن وسال کے تمام مراحل میں مفید اور مورد توجہ ہے، البتہ داستان کا مضمون سامعین کی سطح اطلاع وآگاہی کے مطابق ہونا چاہئے۔

خداوندعالم اپنے قصہ گوئی کے اہداف سے متعلق قرآن کریم میں فرماتا ہے :(لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِہِمْ عِبْرَۃٌ لِأُوْلِی الْأَلْبَابِ، مَاکَانَ حَدِیْثاً یُفْتَرٰی وَلٰکِن تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ وَتَفْصِیْلَ کُلَّ شَیْئٍ وَہُدًی وَرَحْمَۃً لِقَوْمٍ یُؤْمِنُوْنَ[2]۔) ''یقیناً ان کے واقعات میں صاحبان عقل کے لئے سامان عبرت ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے گھڑ لیا جائے یہ قرآن پہلے کی تمام کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اس میں ہر شے کی تفصیل ہے اور یہ صاحبان ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت بھی ہے ''۔ یہ اہداف درج ذیل ہیں :

ایک۔ عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے۔

دو۔ واقعیت اور حقیقت کا بیان ہے اور جھوٹ اور افتراء پردازی سے مخلوط نہیں ہے۔

تین۔ حقائق امور کو بیان کرکے تجزیہ و تحلیل کرتا ہے۔ چار۔ ہدایت و رحمت کا ایک وسیلہ ہے۔

[1] نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی، ص۱۲۴۔
[2] سورۂیوسف،آیت ۱۱۱۔

قرآنی داستان میں عواطف کو تحریک کرنے اور اُسے ابھارنے کے علاوہ، تعقل و خردمندی کی پرورش بھی پائی جاتی ہے، قرآنی قصے انسانوں کے درمیان اخلاقی روابط کو واضح انداز میں بیان کرتے ہیں اور آخر کار، یہ اخلاقی فضائل ہیں جو کامیابی کے ساتھ میدان سے باہر آتے ہیں اور پستیاں اور ذلتیں اور سیاہ رو ہوجاتی ہیں ہابیل وقابیل، موسیٰ وفرعون، موسیٰ وقارون، موسیٰ اور عبد صالح، آدم وحوّا، بنی اسرائیل کی گائے، ابراہیم اور اسماعیل، یوسف اور ان کے بھائی، لوط اور ان کی قوم وغیرہ کی داستانیں بہت سے اخلاقی اور تربیتی نکات کی حامل ہیں۔ وہ نکتہ جو قرآنی داستانوں میں توجہ کو جلب کرتا ہے، یہ ہے کہ پست میلانات کا ذکر نہیں چھیڑتا اور مرد وعورت کے روابط سے متعلق داستانوں میں حریم حیا کو محفوظ رکھتا ہے اور جزئیات کے ذکر سے اجتناب کے ذریعہ پردہ دری نہیں کرتا ہے۔

داستان سے مناسب اور بجا استفادہ خصوصاً قرآنی داستانوں یا ائمہ طاہرین علیہم السلام اور بزرگان دین سے متعلق داستانوں سے آسان زبان میں بیانات کی مقبولیت میں حیرت انگیز اثر ایجاد کرتا ہے[1]۔

ج۔ تشبیہ وتمثیل: ''تمثیل''ایک موضوع کا کسی دوسری صورت میں بیان کرنا ہے اس طرح سے کہ دونوں قسموں کے درمیان شباہت پائی جاتی ہو اور اس کے ذکر سے پہلا موضوع زیادہ سے زیادہ واضح ہوجائے[2] مَثَل جو کچھ پوشیدہ اور نامعلوم ہے اسے آشکار کردیتی ہے اور ماہیت امور کو واضح کردیتی ہے، مسائل کا بیان امثال کی صورت میں مخفی اور پوشیدہ معانی سے پردہ اٹھادیتا ہے اور مبہم اور پیچیدہ نکات کو واضح کردیتا ہے۔

مثل پند ونصیحت کی تلخی کو کم کرتی اور مسرت وشادمانی کا باعث ہوتی ہے اور مختصر الفاظ میں بہت سے معانی کا افادہ کرتی ہے اور کنایہ کے پردہ میں مطالب کی تعلیم دیتی ہے اور نہایت سادہ، آسان نیز محسوس زبان میں عقلی پیچیدگیوں کو ذکر کرتی ہے[3]۔

---

[1] مثنوی معنوی اخلاقی داستانیں اسی طرح کی ہیں۔
[2] ''المثل عبارة عن قولہ فی شي ء یشبہ قولاً فی شيء آخر بینہما مشابہۃ لیبین احدہما الاخر ویصورہ'' المفردات راغب۔
[3] اصول وروش ہای تربیت در اسلام، ص ۲۶۲ ملاحظہ ہو۔

بلاشبہہ عام لوگوں کے درمیان متعارف اور شناختہ شدہ تربیتی وسائل میں سے ایک ضرب الامثال، تمثیلوں اور تشبیہوں سے مناسب استفادہ کرنا ہے۔ قرآن کریم نے بھی متعدد مقامات پر ان مثلوں سے استفادہ کیا ہے[1]۔

''قرآنی مثلیں بہت سے فوائد کی حامل ہیں لہٰذا دقیق انداز میں ان کے معنی کے بارے میں غور وخوض کرو اور (بغیر توجہ کے) ان سے گزر نہ جاؤ[2]''۔

قرآنی مثالیں، جیسے دنیا کے سرانجام کی تشبیہ سرسبز گھاس کے پژمردہ ہونے سے، کفار کے اعمال کی تشبیہ سراب سے، منافقین کے بارے میں متعدد تشبیہیں، اُس بوڑھی عورت سے تشبیہ جو دھاگا کاتتی ہے وغیرہ وغیرہ، یہ سب مثالیں قابل غور ہیں۔ قرآنی مثلیں تربیت کے لحاظ سے درج ذیل فوائد کی حامل ہیں :

تعلیم عبرت، تفکر وتامل، تشویق وترغیب، تنبیہ وآگاہی، تبیین وتقریر، پند ونصیحت اور پیچیدہ مسائل کو ذہن سے قریب کرنا۔ مثالوں میں اہم نکتہ یہ ہے کہ اس کے سطحی معانی میں توقف نہیں کرنا چاہئے بلکہ تعقل وتفکر کے ساتھ اُس کے عمیق اور گہرے معانی میں ڈوب جانا چاہئے۔

تربیت کے لحاظ سے بھی مربی کو یہ نہیں چاہئے کہ مثل میں موجود تمام نکتوں کو تربیت پانے والے کے لئے واضح وبیان کرے بلکہ اسے موقع دے کہ وہ اپنی تلاش وکوشش سے زیادہ سے زیادہ معانی کشف کرے۔

د۔ سوال وجواب: کبھی ایک سوال کا ذکر مطلب کی طرف افراد کی توجہ اور حواس کے یکجا ہونے کا باعث ہوتا ہے، سوال کا ذکر کرنا اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخاطبین کی تحقیق وتلاش کی حس بیدار ہو اور جواب دہی کے لئے ضرورت محسوس کریں، بالخصوص اگر سوال اس طرح پیش کیا جائے کہ ان کے لئے نیاپن اور جاذبیت رکھتا ہو اور اس آسانی سے جواب نہ دے سکیں، ایسی صورت میں

---

[1] ۲۴۵ضرب المثل اور ۵۳ مورد تمثیل ہاے دینی۔
حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں :
[2] ''امثال القرآن لہا فوائد فامنعوا النظر فتفکروا فی معانیہا ولا تمروا بہا''۔

دل وجان سے قائل کی طرف آئے تاکہ اس کی باتیں سنیں۔ قرآن نے بھی متعدد مقامات پر اس روش سے استفادہ کیا ہے :

(ہَلْ اَتاکَ حَدیثُ الْغاشِیَۃِ[۱]) ''کیا تمھیں ڈھانپنے والی قیامت کی بات معلوم ہے؟''۔

(اَلْقارِعَۃ ما الْقارِعَۃ وَما اَدْرٰکَ ما الْقارِعَۃ ؟) ''کھڑکھڑانے والی، اور کیسی کھڑکھڑانے والی اور تمھیں کیا معلوم کہ وہ کیسی کھڑکھڑانے والی (قیامت) ہے؟''۔

(ہَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسانِ حینٌ مِنَ الدَّہرِ لَمْ یَکُن شَیْئا مَذْکُورا ؟[۲]) ''کیا انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے کہ جب وہ کوئی قابل ذکر شے سے نہیں تھا؟''۔

کبھی سوالات کودوسروں کی زبان سے بھی بیان کرتا ہے :(یَسْئَلُونَکَ عَنِ الْاَنْفالِ[۳])

''(اے پیغمبر!) آپ سے یہ لوگ انفال کے بارے میں سوال کرتے ہیں''۔ (یَسْئَلُونَکَ عَنِ الْاَہِلَّۃِ[٤]) ''(اے پیغمبر!) یہ لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں''۔

(یَسْتَفْتُونَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیکُمْ فِی الْکَلالَۃِ[٥]) ''(اے پیغمبر!) یہ لوگ آپ سے فتویٰ دریافت کرتے ہیں تو آپ ان سے کہد یجئے کہ خداوند کلالہ (بھائی بہن) کے بارے میں حکم بیان کرتا ہے...''۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات میں بھی سوال وجواب کے طریقے کثرت سے پائے جاتے ہیں'' :آیا تم میں سب سے افضل شخصکے بارے میں خبر نہ دوں...''؟''آیا خدا کے نزدیک بہترین اعمال کی خبر نہ دوں...''؟'

---

[۱] سورۂغاشیہ، آیت۱۔ ۳۔ سورۂقارعہ، آیت ۱تا۳۔
[۲] سورۂانسان، آیت۱۔
[۳] سورۂانفال، آیت۱۔
[٤] سورۂبقرہ، آیت۱۸۹۔
[٥] سورۂنساء، آیت۱۷۶۔

آیا تمہیں لوگوں میں سب سے بڑے انسان کی خبر نہ دوں...''؟''آیا تمہیں ایسے لوگوں سے باخبر نہ کروں جو اخلاق میں مجھ سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں...؟

اخلاقی اقدار کی دعوت کے لئے کلی طور پر آیات وروایات، نصیحت آمیز اشعار اور بزرگوں کے کلمات سے استفادہ کہ جو ''مقبولات عقلی'' شمار ہوتے ہیں، دعوت کی تاثیر میں دوگنا اضافہ کردیتا ہے۔اخلاقی اقدار کی طرف دعوت کی روش سے استفادہ ''خود تربیتی'' کی صورت میں یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو اس دعوت کے معرض میں قرار دیتے ہیں۔

دوسری فصل

اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے

۵۔ عقلانی قوت کی تربیت

(اقدار اور موعظہ کی دعوت)گذشتہ روش کے برعکس کہ عام طور پر انسان کے عاطفی پہلو پر تاکید کرتی ہے، اس روش میں بنیادی تاکید انسان کے شناختی، معرفتی اور ادراکی پہلو پر ہے، جس طرح عاطفی محرّک رفتار کے اصول ومبادی میں شمار ہوتا ہے، فائدہ کا تصور وتصدیق بھی شناخت کیاصول ں ومبادی میں سے ہے کہ یہ روش اس کی ضرورت پوری کرنے کی ذمہ دار ہے۔ قرآن کریم اور معصومین علیہم السلام کے ارشادات وتعلیمات اس روش اور طریقے پرتاکید کرتے ہیں، اور اس کے حدود، موانع اور مقتضیات کوبیان کرتے ہیں۔

قرآن نے تعقل، تفقہ، تدبر، لب، حجر، نہیٰ، حکمت، علم وفہم جیسے الفاظ کا استعمال (ان ظریف تفاوت کے لحاظ سے بھی جو ان کے درمیان پائے جاتے ہیں) کا اس روش سے استفادہ کے لئے کیا ہے۔ قرآنی آیات مندرجہ باتوں کے ذریعہ اپنے مخاطبین کی معرفت اور عقشلانی قوت کی پرورش کرتی ہے:

استفہام تقریری یا تاکیدی کے ذریعہ سے[1] گذشتہ افراد یا اکثریت کی اندھی تقلیداورپیروی کرنے کی ممانعت ہے،[2] ان لوگوں کی مذمت جوتعقل نہیں رکھتے،[3]

---

[1] سورۂبقرہ، آیت۴۴۔سورۂقیامت، آیت۲۔
[2] سورۂزخرف، آیت۲۲۔۲۳۔۲۴ اور سورۂانعام، آیت۱۱۶۔
[3] سورۂانفال، آیت۲۲۔

ان لوگوں کی مذمت جو بغیر دلیل کے کسی چیز کو قبول کر لیتے ہیں،[1] تعقل وتدبر کی دعوت،[2] موازنہ اور تطبیر[3]، احسن انتخاب پر ترغیب وبشارت[4] وغیرہ۔

روایات بالخصوص اصول کافی کی کتاب عقل وجہل اور دیگر روائی ماخذ میں بھی عقل وتعقل کو عظیم مرتبہ کا حامل قرار دیا گیا ہے اورانسان کے اخلاقی تربیت سے متعلق خاص طور پر اس کے نقش وکردار کو موردتوجہ قراردیا گیا ہے[5]۔

علمائے اخلاق کی تربیتی روش میں بھی ان کی اصلاحی تدبیروں راہنمائیوں کا ایک قابل توجہ حصہ انسان کی شناختی پہلوسے متعلق ہے ،جیسے انسان کے ذہنی تصورات کی ایجاد یا تصحیح خود عمل یا اخلاقی صفت سے، اعمال کے دنیوی اور اخروی عواقب و نتائج کی ترسیم، اخلاقی امور کے بُرے یا اچھے لوازم اور ملزومات ان کے اخلاقی نظریہ میں بھی، غضب اور شہوت کی قوتوں پر عقلانی قوت کے غلبہ کواخلاقی رذائل سے انسان کی نجات اور اخلاقی فضائل کی طرف حرکت کا سبب ہے، اس لئے کہ قوۂ عقل کے غلبہ سے تمام قوتوں کے درمیان اعتدال پیدا ہوتا ہے اور فضیلت کا معیار بھی اعتدال۔ تفکر وتعقل کے وہ موارد جو اخلاقی تربیت میں موثر ہو سکتے ہیں، آیات وروایات میں ان کا تعارف کرایاگیا ہے :

۱۔ طبیعت: ’’زمین وآسمان میں کتنی زیادہ علامتیں اور نشانیاں ہیں کہ جن پر سے لوگ گذرتے ہیں اس حال میں کہ اُن سے روگرداں ہوتے ہیں[6]‘‘۔

---

[1] سورۂانعام، آیت۱۱۶۔ سورۂزخرف، آیت۲۰۔
[2] سورۂیوسف، آیت ۱۰۵۔
[3] سورۂزمر، آیت۹، سورۂرعد، آیت ۱۶ اور سورۂنحل، آیت۷۶۔
[4] سورۂزمر، آیت ۱۸۔
[5] اصول کافی، ج۱، باب جنود عقل وجنود جہل۔
[6] سورۂیوسف، آیت۱۰۵۔

۲۔تاریخ: حضرت علی ـ فرماتے ہیں'' :حضرت اسماعیل کے فرزندوں،اسحاق کے فرزندوں اور یعقوب کے فرزندوں سے عبرت حاصل کرو، کس قدر ملتوں کے حالات آپس میں مشابہ اور ان کے افعال وصفات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اُن کے پراگندہ اور متفرق ہونے کے بارے میں غور کرو، جس وقت روم وفارس کے بادشاہ اُن کے ارباب بن گئے تھے[۱]...

میرے بیٹے! یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے گذشتہ افراد کی عمر کے برابر زندگی نہیں پائی ہے، لیکن اُن کے کردار میں غور وفکر کیا ہے، ان کے اخبار کے بارے میں تفکر کیا ہے اور ان کے آثار میں سیر وسیاحت کی ہے کہ ان میں سے ایک کے مانند ہوگیا،بلکہ گویا جو کچھ ان کی تاریخ سے مجھ تک پہنچا ہے ان سب کے ساتھ میں اول سے آخر تک ہمراہ تھا[۲]''۔

۳۔قرآن: ''آیا قرآنی آیات میں غور وفکر نہیں کرتے؟یا (یہ کہ) ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں[۳]''۔

۴۔انسان: حضرت امام حسین ـ کی دعائے عرفہ کے پہلے فقرات سے اور توحید مفضل (بحار، ج۳) سے مفید اور کار آمد نکات معلوم ہوتے ہیں :

اخلاقی قواعد کا اثبات اور تزکیہ باطن عام طور پر بغیر عقلانی قوت کی تربیت کے ممکن نہیں ہے، یہ روش خود سازی اور دوسروں کی تربیت سے وجود میں آسکتی ہے شناخت و معرفت کے ماہرین نفسیات بالخصوص ''پیاژہ''اس روش کی بہت زیادہ تاکید کرتا ہے وہ اخلاقی نمونوں تک رسائی کو ''قابل تعمیر'' اور فعّال وخود سازی روش جانتا ہے نیز معتقد ہے کہ اخلاقی تحول وانقلاب شناخت کے رشد وتحول کے بغیر ممکن نہیں ہے:

یہاں پر ایک قسم کی عجیب وحیرت انگیز ہماہنگی، اخلاقی وعقلانی تربیت میں پائی جاتی ہے جسے یوں ذکر کیا جاتا ہے کہ آیا جو کچھ تربیت خارج سے انسان کو دیتی ہے تاکہ اس کے اکتسابی یا فردی ادراک کو بے نیاز اور مکمل کرے، سادہ قواعد اور حاضر آمادہ معراف میں

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ، ۱۹۲۔
[۲] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔
[۳] (أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا۔)(سورۂمحمد، آیت۲۴)

محدود منحصر ہوسکتا ہے ؟ایسی صورت میں آیا مراد یہ نہیں ہے کہ (صرف) کچھ تکالیف ایک طرح کی اور حس اطاعت انسان پر لازم کی جائے... یا یہ کہ اخلاقی تربیت سے استفادہ کا حق عقلی تربیت حق کے مانند یہ ہے کہ انسان حق رکھتا ہو کہ عقل واخلاق کو اپنے اندر واقعاً جگہ دے یا کم ازکم ان کے فراہم کرنے اور ان کی تعمیر میں شریک اور سہیم ہو،تاکہ اس مشارکت کے نتیجہ میں وہ تمام افراد جو ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں،ان کی تعمیر پر مجبور ہوجائیں۔ لہٰذا اخلاقی تربیت کی راہ میں، ''خود رہبری'' کا مسئلہ عقلی خود سازی کے مقابلہ میں ان افراد کے درمیان جو اس کی تلاش میں ہیں ذکرکیا جاتا ہے[1]۔

جو طریقے اس روش کے تحقق میں استعمال کئے جا سکتے ہیں درج ذیل ہیں :

الف ۔افکار کی عطا اور اصلاح: اخلاقی اعمال فکر کی دو قسموں سے وجود میں آتے ہیں :پہلی قسم : انسان کا اپنی ھستی کے بارے میں آگاہ ہونا، دنیا، نظام عالم، مبدأ اور معاد کی نسبت وہ کلی یقین ومعتقدات ہیں کہ انھیں خداشناسی اور فلسفہ حیات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ واضح ہے کہ انسان کی نگاہ اپنے اطراف کے عالم پر اُس کی اخلاقی رفتار میں موثر ہے۔ اعتقادات جیسے خدا کی قدرت کااحاطہ اور حضور عالم کا توحیدی انجام یا نظام تقدیر، خدا پر توکل، تمام امور کا اس کے حوالہ کرنا، تسلیم ورضا وغیرہ سارے کے سارے ہمارے اخلاقی رفتار میں ظاہر ہوتے ہیں۔

آج کل سلامتی کے ماہرین نفسیات اس نکتہ کی طرف توجہ رکھتے ہیں کہ خدا شناسی اور انجام عالم کی حس کی نسبت، انسان کی مقاومت کے لئے ایک ایسا مرکز فراہم کرتی ہے کہ جو اخلاقی متانت کہ انسان کی سلامتی کے لئے عالم کو دباؤ میں ڈالنے والے حوادث کے مقابل تاثیر گذار ہے۔

[1] پیاژہ: تربیت رہ بہ کجا می سپرد، ص۵۳۔

انسجام کی حس ایک مقابلہ کا مأخذ ہے، حس انسجام (دنیا کے نظم وضبط میں تنظیم ویگانگی کا احساس کرنا) ایک قسم کی خداشناسی ہے کہ جس سے مراد مندرجہ امور کی نسبت دائمی اور مستمر اطمینان کے احساس ہے:

ا۔ ایسے محرک جو انسان کی پوری زندگی میں باطنی اور بیرونی ماحول سے پیدا ہوتے ہیں، تشکیل شدہ منظم، پیشین گوئی کے قابل اور قابل توجیہ ہیں۔

۲۔ انسان ان ضرورتوں سے روبرو ہونے کے لئے کہ جن کو ان محرکات نے ایجاد کیا ہے، کچھ وسائل ماخذ رکھتا ہے؟

۳۔ یہ ضرورتیں، ایسی کوششیں ہیں جو سرمایہ گذاری اور وقت صرف کے لائق ہیں۔ یہ لوگ دنیا کو قابل درک اور قابو میں کرنے کے لائق جانتے ہیں اور زندگی کے واقعات وحوادث کو بامعنی محسوس کرتے ہیں[1]۔

دوسری قسم: ایسے افکار ہیں کہ جو عمل کی اصلاح اور صحت سے متعلق ہیں اور یہ کہ یہ خاص رفتار عمل کرنے والے کے ہدف سے یگانگت رکھتی ہے۔ اور حقیقت میں اطلاعات دینے کے ایک طریقہ سے مربوط ہے۔

البرٹ الیس شناخت سے متعلق ماہر نفسیات ہے کہ جو اپنی نجاتی روش کے سلسلہ میں عقلی اور عاطفی علاج سے استفادہ کرتا ہے اُس نے غیر عقلی تفکر کے نمونے پیش کرنے کے شاتھ اُس کا علاج جدید آمادگی اور جدید افکار ومعتقدات کو اُن کا جاگزین کیا جانا ہے کبھی غیر اخلاقی رفتار یانا مطلوب صفات غلط نظریہ اور خیال کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ جو دھیرے دھیرے انسان کے فکری نمونے بن جاتے ہیں اور ایسے نظریوں کا تبدیل ہونا اخلاقی تربیت کے لئے ضروری ہے، غیر عقلی (غیر معقول) تفکر کے بعض نمونے ہر طرح کی اخلاقی رفتار کی تبدیلی سے مانع ہوسکتے ہیں، الیس ان موارد کو اس طرح بیان کرتا ہے :

---

[1] Psyhology Health/.p۳۲۷

۱۔انسان اس طرح فرض کرے کہ اُن افراد کی جانب سے جو اس سے متعلق اور اُس کے لئے اہم ہیں مورد تائید،اور لائق محبت و احترام واقع ہو۔

۲۔جب بھی انسان سے کوئی لغزش ہوجائے تو اس کے لئے صرف اتنا اہم ہے کہ وہ مقصر کا سراغ لگائے اور اسے سزا دے۔

۳۔اگر مسائل اس کی مراد کے مطابق نہ ہوں تو اُس کے لئے حادثہ آمیز چیز ہوگی۔

۴۔سب سے زیادہ آسان یہ ہے کہ انسان مشکلات اور ذمہ داریوں سے فرار کرے،نہ کہ اُن کا سامنا کرے۔

ب۔ اخلاقی استدلال: پیاژہ اور کلبرگ نے اس روش سے استفادہ کیا ہے اس طرح سے کہ داستانوں کو بچوں کے شناختی تحوّل وانقلاب کی میزان کے مطابق اس طرح بیان کرتے تھے کہ ان کے ضمن میں داستان کا ہیرو اخلاقی دوراہہ پر کھڑا ہے اور یہاں پر داستان کے مخاطب کو چاہئے کہ جو استدلات وہ بیان کرتا ہے ان سے اپنی اخلاقی قضاوت کا استخراج کرے مربی جزئی دخالتوں سے اس اخلاقی بحران کی بحث چھیڑے (البتہ ان سے آگے قدم نہ بڑھائے یا کوئی استدلال پیش نہ کرے) اور صرف بالواسطہ ہدایت کرے اور ان کے استدلات کو صاف وشفاف کرے۔ یہ استدلات تربیت پانے والے کے ذہن میں نقش چھوڑتے ہیں اور اُسے انجانے طریقہ سے اس کی اخلاقی رفتار میں ہدایت کرتے ہیں۔

اخلاقی استدلال بلاواسطہ اور خود عمل پر بھی ناظر ہو سکتے ہیں؛ یعنی انسان کا روبرو ہونا اپنے اعمال کے نتائج کے ساتھ۔ علمائے اخلاق کی روش میں بھی اس طرح کے اقدامات پائے جاتے ہیں: عمل کے نتائج و آثار روش سے واضح انداز میں انسان کے لئے مجسّم ہوتے ہیں اور مخاطب کو یقین حاصل ہوتا ہے کہ یہ عمل اس طرح کے نتائج وآثار کا حامل ہے،

درحقیقت ہم اس کے لئے موقعیت کی توصیف کرتے ہیں (بغیر اس کے کہ اُس میں امر و نہی درکار ہو) اور یہ خود انسان ہے کہ جو ان نتائج کو درک کرکے انتخاب کرتا ہے اور اس کے عمل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے قرآنی آیات کبھی عمل کے ملکوتی کو مجسّم کرکے اس روش اور اسلوب سے استفادہ کرتی ہیں :

''اے صاحبان ایمان !... تم میں سے بعض بعض کی غیبت نہ کرے آیا تم میں سے کوئی چاہتاہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یقیناً اُسے ناپسند کروگے (لہٰذا) بے شک خدا سے ڈرو کہ خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے[1]''۔

کبھی اعمال کے دنیوی یا اخروی نتائج کی منظر کشی کرکے افراد کو ان کے عواقب سے آشنا کرتا ہے :

''ایک دوسرے سے مجرموں کے بارے میں سوال کریں گے : ''کس چیز نے تمہیں سقر (کی آگ) میں جھونک دیا ہے؟ '' وہ کہیں گے : ''ہم نمازگذاروں میں سے نہیں تھے،اور مسکینوں اور بے نواؤں کو ہم کھانا نہیں دیتے تھے[2]...

ج۔ مطالعہ اور اطلاعات کی تصحیح: مطالعہ لغت میں ان معانی میں استعمال ہوتا ہے: کسی چیز کے معلوم کرنے کے لئے اُس کو دیکھنا ، کسی کتاب یا کسی نوشتہ کا پڑھنا اور اس کا سمجھنا......۔

آخری سالوں میں اطلاعات فراہم کرنے والوں کے اقدام نے بہت سے ماہرین نفسیات کی توجہ اپنی طرف جلب کرلی ہے[3]

کیونکہ جو اطلاعات انسان کے ذہنی سسٹم میں وارد ہوتی ہیں، وہ انسانی رفتار کو جہت دینے میں ایک اہم اور قابل تعیین کردار ادا کرتی ہیں۔ البتہ اطلاع کی فراہمی کا انداز بھی اہم ہوتا ہے کہ افکار کی عطا کی بحث میں ان کی طرف اشارہ ہواہے۔ بِک[Beck] منجملہ ان کے ماہرین نفسیات میں سے ہے کہ جو اسی طریقۂ عمل سے افسردگی کی بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔

---

[1] سورۂحجرات، آیت ١٢۔
[2] سورۂمدثر، آیت ۴٠تا ۴۴۔
[3] روان شناسی رشد بانگرش بہ منابع اسلامی، ج٢، ص۶٢۶۔

اخلاقی بیماریوں کا علاج کرنے یا کلی طور پر صحیح اخلاقی تربیت یا فضائل اخلاقی کی راہ پیدا کرنے میں اسی طرز واسلوب سے مدد لے سکتے ہیں، یعنی اخلاقی مشکلات کے سلسلہ میں علم اخلاق کی مناسب کتابوں کا مطالعہ اور جدید اطلاعات کے حصول سے انسان اپنے عمل کے اسباب وعوامل کو پہچان لیتا ہے اور اس میں تبدیلی یا اصلاح انجام دیتا ہے اور بالواسطہ طور پر اخلاقی تربیت کا باعث ہوتا ہے۔ کبھی اس کی سابق اطلاعات سے متعارض اطلاعات اُسے غور وفکر اور فیصلہ کرنے نیز تجدید نظر کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

د ۔ مشورت ومشاورہ: اس سے مراد مربی اور تربیت دےئے جانے والے یا والدین اور فرزندوں کے درمیان ایک طرح کا معاملاتی رابطہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مدد اور حمایت سے مسئلہ کا تجزیہ وتحلیل کریں اور اخلاقی مسائل میں ایک مشترک راہ حل تک رسائی حاصل کریں۔ یہ طرز تربیت پانے والی شخصیت کے احترام واکرامُ

کے علاوہ اخلاقی تربیت کے اعتبار سے رشد عقلی کا باعث ہوتا ہے'' :مَن شَاوَرَ ذَوِی العُقُول استَضَاء بانوار العقول[1]''

''جو انسان صاحبان عقل وہوش سے مشورہ کرے، وہ ان کے نور عقل وخرد سے استفادہ کرتا ہے''۔

اسلامی روایات، مشورہ کو رشد وہدایت کا ذریعہ سمجھتی ہیں اور شایستہ افراد سے مشورہ کرنے کی زیادہ سے زیادہ تاکید کرتی ہیں :

''دوسروں سے مشورہ کرنا ہدایت کا چشمہ ہے اور جوکوئی خود کو دوسروں کے مشورہ سے بے نیاز تصور کرے تو اُس نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا ہے[2]''۔

اس روش میں تربیت پانے والے کا مقصد عقلانی توانائی کا حصول اور اخلاقی مسائل میں فیصلہ کرنا ہے، یعنی مشورت کے ذریعہ اسے آمادہ کریں کہ ''خود رہبری'' اور ''فعّال'' کی روش کو ہدایت کے سالکین کو اخلاقی تربیت کی راہ میں لے آئے اور اپنی اخلاقی

---

[1] غرر الحکم ودرر الکلم،ج۵،ص۳۳۶،ش ۸۶۳۴۔
[2] الاستشارة عین الهدایة وقد خاطر من استغنی برایہ نہج البلاغہ ابن ابی الحدید،ج۱۹،ص۳۱۔

مشکل کو حل کر سکے، مشورہ میں پہلا قدم مراجع (تربیت دیا جانے والا) نہیں اٹھاتا؛ بلکہ مربی کو اس سے نزدیک ہونا چاہئے اور رابطہ ایجاد کرکے یا کبھی مسائل میں اُس سے راہ حل طلب کرکے، اُسے اپنے آپ سے مشورت سے کرنے کی تشویق کرنی چاہئے[1]۔

٦۔ عبرت حاصل کرنے کے طریقے کلمہ ''عبر'' ایک حال سے دوسرے حال میں گذرنے اور عبور کرنے کو کہتے ہیں اور اعتبار (عبرت آموزی) ایک ایسی حالت ہے کہ مشہور چیز دیکھنے اور جو کچھ اس کے نزدیک حاضر ہونے سے ایک نامشہود پیغام تک رسائی حاصل کرلیں لہٰذا اس روش سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اندر امور و حوادث کے دقیق مشاہدہ اور اس میں غور و خوض کرنے سے باطنی تبدیلی حاصل ہوجاتی ہے کہ اس انفعال نفسانی کی حالت کے نتیجہ میں، اُس حادثہ کی گہرائی میں موجود پیغام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے، عینی مشاہدہ وہ بھی نزدیک سے انسان میں ایسا اثر کرتا ہے کہ سننا اور دوسروں کا بیان کرنا اتنا اثر نہیں رکھتا۔ اس کی دلیل پہلے مشاہدات کا زیادہ سے زیادہ قابل قبول ہونا ہے؛ سنی سنائی چیزوں کے برعکس کہ اُس میں عام طور پر شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ برہان عقلی میں یقینیات میں سے ایک مشاہدات یا محسوسات ہیں۔ دوسرے حادثہ کی جانب اس کے جزئیات سمیت توجہ دینا، کے شناختی وعاطفی قالب اور ڈھانچوں کے مطابق دیکھنے والے اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ وہ واقعہ بہتر جا گزیں ہو اور انسان کے نفسیاتی قالب میں جگہ پائے۔ البتہ کبھی تاریخی یا داستانی بیانات بیان کرنے والے کی ہنر نمائی کے زیر اثر اس درجہ دقیق ہوتے ہیں کہ گویا سننے والا یا پڑھنے والا خود اس حادثہ کے اندر اپنے موجود محسوس کرتا ہے۔ نمائشی ہنر میں جیسے فیلم وغیرہ میں اس طرح کا امکان پایا جاتا ہے۔ قرآن وروایات میں عبرت آموزی کا طریقہ کثرت سے استعمال کیا گیا ہے، عبرت آموزی کے طریقے درج ذیل ہیں :

الف۔گذشتگان کے آثار کا مشاہدہ : تاریخ کے صفحات ایسے لوگوں کے وجود سے بھرے پڑے ہیں جنھوں نے خطا کے بار کو کاندھے پر اٹھایا اور غیر صحیح راہ پر گامزن ہوگئے ہیں، گذشتگان کے باقی ماندہ آثار میں غور وفکر کرنے سے ہمیں تعلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہر

---

[1] اسلامی تعلیمات مختلف جہات سے مشورت کے مسئلہ پر تاکید کرتی ہیں؛ مزید معلومات کے لئے سید مہدی حسینی کی کتاب ''مشاورہ وراہنمائی درتعلیم وتربیت'' ملاحظہ ہو۔

گناہ وخطا سے کنارہ کشی کے لئے لازم نہیں ہے کہ خود تجربہ کریں اور اس کی سزا اور انجام دیکھیں۔ تاریخی عمارتیں، میوزیم، کھنڈر، دفینے وغیرہ ان انسانوں کی علامتیں ہیں جنھوں نے انھیں وجود بخشا ہے۔

قرآن ہمیں ان کی جانب سیر وسفر اور گذشگان سے تجربہ حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے'' :آیا ان لوگوں نے زمین میں گردش نہیں کی ہے تاکہ اپنے پہلے والوں کے انجام کا مشاہدہ کریں کہ وہ کس طرح تھا؟ وہ لوگ ان سے زیادہ قوی تھے اور انھوں نے روئے زمین پر زیادہ ثابت اور پائدار آثار چھوڑے ہیں، خدا نے انھیں ان کے گناہوں کے عذاب میں گرفتار کردیا اور خدا کے مقابل ان کا کوئی بچانے والا نہیں تھا[۱]''۔

عمار ساباطی نقل کرتے ہیں: حضرت امیر المومنین علی ۔ مدائن آئے اور ایوان کسریٰ میں نازل ہوئے اور ''دلف بن بحیر'' ان کے ہمراہ تھا، آپؑ نے وہاں نماز پڑھی اور اٹھ گئے.... حضرتؑ کی کے خدمت میں ساباطیوں کا ایک گروہ تھا، آپؑ نے منازل کسریٰ میں چکر لگایا اور دلف سے فرمایا'' :کسریٰ اس جگہ مقام ومنزلت کا حامل تھا''دلف نے کہا: خدا کی قسم ایسا ہی ہے، جیسا آپؑ فرمارہے ہیں۔

پھر اس گروہ کے ہمراہ اُن تمام جگہوں پر گئے اور دلف کہہ رہے تھے: ''اے میرے سید وسردار آپ اس جگہ کے بارے میں اس طرح آگاہ ہیں گویا آپ ہی نے ان چیزوں کو یہاں رکھا ہے۔

جب حضرتؑ مدائن کی طرف سے گذرے اور کسریٰ اور اس کی تباہی کے آثار مشاہدہ کئے تو حضرتؑ کی خدمت میں موجود افراد میں سے ایک نے یہ شعر پڑھا :جرت الریاح علی رسوم دیارھم فکأنھم کانوا علی میعادان کے گھروں کے مٹے ہوئے نشانات پر ہوائیں چل رہی ہیں پس گویا وہ اپنی وعدہ گاہ پر ہیں۔

---

[۱] سورۂمومن ،آیت۲۱۔

حضرت نے فرمایا: تم نے یہ آیات کیوں نہیں پڑھیں؟واہ! انھوں نے کیسے کیسے باغات اور بہتے چشمے چھوڑے ہیں، کھیتیاں اور عمدہ مکانات چھوڑ گئے ہیں اور وہ نعمتوں میں مزے اڑا رہے ہیں، (ہاں) ایسا ہی تھا اور ہم نے دیگر لوگوں کو ان کی میراث دے دی پھر تو ان پر آسمان وزمین نے گریہ وزاری نہیں کی اور نہ انھیں مہلت دی گئی[1]۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا: یہ لوگ گذشتگان کے وارث تھے پس وہ خود بھی آئندہ والوں کے لئے میراث چھوڑ کر گئے، انھوں نے نعمت کا شکر ادا نہیں کیا لہذا ناشکری کے زیر اثر اُن سے ساری نعمتیں سلب ہوگئیں، نعمات کی ناشکری سے پرہیز کرو کہ تم پر بلائیں نازل ہوجائیں گی[2]۔

نہج البلاغہ میں اس نکتہ کی طرف زیادہ توجہ دلائی گئی ہے '' تمہارے لئے گذشتہ امتوں کی سرنوشت میں عبرتیں ہیں، عمالقہ اور ان کی اولاد کہاں ہیں؟ فراعنہ اور ان کے اخلاف کہاں ہیں؟ اصحاب رس جنھوں نے پیغمبروں کو قتل کیا ہے کی سنتوں کو پامال کیا ہے اور جباروں کی رسومات کو باقی رکھا، کہاں ہیں[3]؟۔

خداوند متعال فرماتا ہے: ''پھر آج تم [فرعون]کو تمہارے بدن کے ساتھ بچا لیتے ہیں تاکہ ان کے لوگوں کے لئے جو تمہارے بعد آئیں گے، عبرت ہو[4]۔

قبروں کی زیارت اور ان لوگوں کے حالات کے بارے میں غور وفکر جو روئے زمین پر سرکشی اور تکبر کرتے تھے اور آج بغیر حرکت کے اورانتہائی ذلت وخواری کے ساتھ خاک میں دفن ہیں، انسان کو خاضع بلکہ اسے فرمانبردار بنا دیتا ہے، کبرو نخوت کو فروتنی وخاکساری سے تبدیل کردیتا ہے اورآدمی کو یہ فرصت دیتا ہے کہ خود کو درک کرے اور اپنی عاقبت کے بارے میں غور کرے۔

---

[1] سورۂ دخان آیات ۲۵، ۲۹۔
[2] بحارالانوار ،ج۷۸،ص۹۲۔
[3] نہج البلاغہ ،خطبہ۱۸۲۔
[4] (فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک آیۃ)(سورۂیونس ،آیت۹۲)۔

حضرت علی ـ نے آیہ شریفہ: ''کثرت مال واولاد کے باہمی مقابلہ (یا اس پر تفاخر) نے تمھیں غافل بنا دیا ہے یہاں تک کہ تم نے قبروں سے ملاقات کرلی[1]'' کی تلاوت کے بعد فرمایا'' :آیا اپنے آباء واجداد کے مقام نزول پر افتخار کرتے ہیں ؟ یہ لوگ فخر وافتخار سے زیادہ عبرت کے سزاوار ہیں اگرچہ اُن کے آثار بینا نہیں ہیں اور ان کی زندگی کی داستان ختم ہو چکی ہے،

لیکن عبرت آموز نگاہیں ان کی طرف دیکھ رہی ہیں اور عقلمندوں کے گوش شنوا آوازوں کو درک کرتے ہیں اور بے زبانی سے ہم سے گفتگو کرتے ہیں[2]۔

مربی حضرات معمولی توجہ اور بصیرت و عبرت آموزی کی دعوت سے، ان تفریح گاہوں سے جو تاریخی جگہوں پر برپا ہوتی ہیں، اخلاقی اور تربیتی ضرورت کا استفادہ کر سکتے ہیں، گروہی یا فردی مسافرت وسعت نظر اور دل ایجاد کرنے کے علاوہ بہت زیادہ مفید اور عبرت آمیز ہے۔

ب ـ طبیعت اور موجودات کی طرف نظر: زمین میں سیر و سیاحت کرنے سے انسان کو عجائب خلقت سے بہرہ مند ہوتا ہے ''اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے! زمین میں گردش کرو پھر موجودات کی وجہ تخلیق کے بارے میں غور و فکر کرو ۔ '' قرآن کریم نے موجودات طبیعت سے عبرت حاصل کرنے کو مورد توجہ قرار دیا ہے'' :چوپاؤں کے وجود میں تمہارے لئے عبرت کے (اسباق) ہیں کہ ان کے شکم اندر سے گوبر اور خون کے درمیان سے تمھیں خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لئے انتہائی خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے اچھی اور پاکیزہ روزی حاصل کرتے ہو، صاحبان عقل وہوش کے لئے اس میں واضح نشانیاں ہے[3]'' ''خدا شب و روز کو دگرگوں کرتا ہے، اس میں صاحبان بصیرت کے لئے ایک عبرت ہے[4]''۔

---

[1] سورۂتکاثر آیت ۱، ۲۔
[2] بحار الانوار ،ج۷۷، ص۴۳۰و۴۳۲۔
[3] سورہ، نحل ،آیت ۶۶تا۶۷۔
[4] سورۂ نور،آیت ۴۴۔

عالم کی حیرت انگیز چیزیں، انسان کو خاضع اور خاشع بناتی ہیں، بہت سی گندگیوں کا سرچشمہ اور اخلاقی پستیوں کا منبع ''خود خواہی[۱]'' اور خود بینی وتکبر ہے، اس وجہ سے اخلاقی تربیت کے اہداف میں ''خود خواہی'' سے دوری اختیار کرنا ہے،پیاژہ کے بقول: ''... اخلاقی تربیت کے دو بنیادی مسئلے یہ ہیں: ''انضباط کا برقرار کرنا'' اور ''خود پسندی سے نکلنا[۲]''،عالم کی عظمت کی اور اس کے عجائب کی طرف، انسان کو خودی سے باہر نکالتے ہیں اور مکارم اخلاق کے قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

ج ۔ موجودہ حوادث اور واقعات کی جانب توجہ: ہم اپنے زمانے میں زندگی گزارتے ہیں اور قبل اس کے کہ تاریخ کے سینہ میں حوادث اور واقعات دفن ہوجائیں ہم اُن سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں حضرت امیر المومنین علی ـ فرماتے ہیں: ''میں اپنے قول کا خود ذمہ دار اور اس کی صحت کا ضامن ہوں، جو شخص بھی زمانے کے ناگوار حوادث سے عبرت حاصل کرے، شبہات میں مبتلا ہونے کے وقت تقویٰ اس کی حفاظت کرے گا[۳]''۔

اپنے بارے میں ایک سرسری نظر اوران مختلف واقعات کا نظارہ کہ کبھی ہم زمان ہونے کا حجاب ہمیں اُس سے غافل کردیتا ہے، شخصیتوں کی پستی وبلندی اور ان کی ظاہری عزت وذلت کا گردش زمانہ میں ہمیں پتہ دیتا ہے، عمل کی جزائیں اور پوشیدہ حکمتیں راہ حوادث کے پس پردہ انتہائی نصیحت آموز ہیں اور یہ عینی تجربے عبرت کے قیمتی ذخیروں میں سے ہیں۔

د ۔ گذشتگان کے قصوں میں غور و فکر: گذشتہ افراد کی داستان زندگی بھی ہمارے لئے عبرت آموز ہوسکتی ہے۔ یہاں پر عبرت حاصل کرنے والا گذشتہ افراد کے آثار کے واقعی میدانوں اور وقت حاضر نہیں ہوتا، لیکن داستان اور اس کے نشیب وفراز میں غور وفکر کے ساتھ، اس کی خالی فضا میں پرواز کرتا ہے کہ اس کا عبرت آمیز رخ عینی مقامات سے کمتر ہے لیکن اس سے نزدیک ہے۔

ۂ

[۱] من رضی عن نفسه ظهرت علیه المعایب، ما اضرّالمحاسن کا لعجب۔(غررالحکم) فصل ۶، ص۳۰۸)۔
[۲] تربیت ره به کجا می سپرد، ص۹۳۔
[۳] نهج البلاغه خطبه ۱۶۔

قرآن حضرت یوسفؑ کی داستان نقل کرتے ہوئے فرماتاہے: ''ان کی داستانوں میں صاحبان عقل کے لئے درس عبرت ہے[۱]۔
یا غزوہ نضیر کے واقعات نقل کرنے کے بعد فرماتاہے: ''پس اے صاحبان بصیرت عبرت حاصل کرو[۲]''۔
ایک دوسرے جگہ پر جنگ بدر کے اہم واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں عبرت حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے:
''یقیناً اس ماجرہ میں صاحبان بصیرت کے لئے ایک عبرت ہے[۳]۔

قرآنی آیات اور روایات کے طرز تربیت میں جو کہ عبرت آموز ی کی تاکید کرتی ہیں، دونکتے قابل توجہ ہیں :
۱۔ عبرت حاصل کرنا ایک[۴] دور اندیش عقل[۵] اور بیدار دل[٦] رکھنے کا مستلزم ہے۔

اسی لئے یہ روش عقلانی قوت کی روش کی پرورش کے بعد ذکر ہوئی ہے،یعنی عام طور پر عقلانی عمیق نظر کے بغیر عبرت آموزی ممکن نہیں ہے۔ اسی لئیحضرت امیر المومنین علی ۔ نے مکرر فرمایا ہے: ''عبرتیں کتنی زیادہ ہیں اور عبرت حاصل کرنے والے کتنے کم ہیں[۷]۔

۲۔ دوسرے یہ کہ آیات وروایات کی روشنی میں عبرت کے لئے ان صفات کا ہونا ضروری ہے: عصمت وپاکدامنی، دنیا سے کنارہ کشی، لغزش وخطا کی کمی، اپنی معرفت، طمع وآرزو کا کم ہونا، فہم ودرک اور تقویٰ[۸]۔

---

[۱] سورۂیوسف ،آیت ۱۱۱۔
[۲] سورۂحشر ،آیت۲۔
[۳] سورۂآل عمران، آیت۱۳۔
[٤] ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار)سورۂآل عمران، آیت۱۳۔
[۵] لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب)سورۂیوسف،آیت۱۱۱۔
[٦] (ان فی ذلک لعبرۃ لمن یخشی) سورۂنازعات، آیت ۲۶۔
[۷] نہج البلاغہ خطبہ ۲۹۷۔
[۸] میزان الحکمۃ ،ج۶،ص۳۸تا ۳۹۔

۷۔ عمل کی پابندی اور مداومت یہاں تک ان طریقوں کی بحث تھی جو اخلاقی (عاطفی یا شناختی رفتار کے مبادی پر اثر انداز ہوتی ہیں یا وہ روشیں جو ماحول کے عوامل میں موثر ثابت ہوتی ہیں۔ پیاژہ نفسیاتی عوامل کے تحول کے شمار میں رشد داخلی کے علاوہ اجتماعی تعامل وتعویض اور اکتسابی تعادل جوئی، تمرین ومشق اور اکتسابی تجربہ کو ایک مستقل عامل جانتا ہے[1]۔

اخلاقی تربیت میں ہدف یہ ہے کہ تربیت پانے والا اخلاقی رفتار کے کمال تک پہنچ جائے یعنی عمل کرے۔ جتنا اس عملی تجربہ کی تکرار ہوگی اور اس کی مداومت کی جائے گی ''ظاہر سازی[2]'' کی صورت میں جدید نفسیانی شکلیں تشکیل پا جائیں گی، بعینہ جیسے اخلاق کی اصطلاح میں جنھیں ملکات اخلاقی کہتے ہیں۔

قرآن کریم عمل کو خاص اہمیت دیتا ہے: ''انسان کے لئے اس کی کوشش اور تلاش کے سوا کچھ نہیں ہے اور اس کی کوشش [کا نتیجہ] عنقریب دکھائی دے گا[3]''۔

بہت سی آیات میں قرآن ایمان کو کافی نہیں جانتا بلکہ عمل کو اس کی تکمیل کے لئے لازم وضروری شمار کرتا ہے : جو لوگ نیک عمل کرتے ہیں خواہ مرد ہوں یا عورت، جبکہ مومن ہوں، وہ لوگ جنت میں داخل ہوجائیں گے اور خرمے کی گٹھلی کے گڑھے کے برابر بھی ان پر ستم نہیں ہوگا[4]''۔

شایستہ کاموں (عمل صالح) سے مراد غالباً وہی اخلاقی اعمال ہیں۔ افراد کے درجات ومراتب بھی ان کے اعمال کے اعتبار سے ہیں، یعنی افراد کی درجہ بندی کا ایک معیار ان کا عمل ہے۔

---

[1] دیدگاہ پیاژہ، ص ٣٥تا٣٧۔

[2] وہ فعالیت جو آدمی کے پہلے والے نفسیاتی تار وپود کو کو تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ خود کو اس ماحول کے حالات کے موافق بنائے جس میں وہ موجود ہے۔ (روانشناسی ژنیتک، ص٢۴۴)۔

[3] سورۂنجم ،آیت٣٩، ۴٠۔

[4] (مَنْ یَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثیٰ وَہُوَ مُؤمِنٌ فَاُوْلٰءِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَایُظْلَمُوْنَ نَقِیْراً)(سورۂنساء، آیت١٢۴)۔

''ان میں سے ہر ایک کے لئے جو عمل انھوں نے انجام دیا ہے، اس کے مطابق مرتبے ہیں اور تمہا را رب وہ جو کچھ کرتے ہیں اس سے غافل نہیں ہے[١]''۔

روایات بھی عمل کی ترغیب وتشویق کے ساتھ اسے ایک فائق مرتبہ دیتی ہیں: حضرت علی ۔: ''آج عمل کا دن ہے اور کوئی محاسبہ نہیں ہے، اور کل محاسبہ کا وقت ہے اور عمل کی گنجائش نہیں ہے[٢]''۔

حضرت امام محمد باقر ۔ فرماتے ہیں: ''کوئی بھی شخص جو کچھ خدا کے نزدیک اُس کے لئے فراہم ہوا ہے اسے نہیں پاسکتا مگر عمل کے ذریعہ[٣]''

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''انسان کی ہمراہی عمل کے سوا کوئی بھی نہیں کرے گا[٤]''عمل کے استمرار اور اس کی مداومت کے بارے میں درج ذیل آیات و روایات کو بعنوان شاہد پیش کیا جاسکتا ہے'' :اگروہ لوگ راہ راست میں ثبات قدمی اور پائداری کا مظاہرہ کریں تو یقیناً انھیں خوشگوار پانی نوش کرائیں گے[٥]''۔

حضرت علی ۔: '' وہ کم اعمال جس کی پابندی اور مداومت کرو، ایسے زیادہ اعمال سے زیادہ امید بخش ہیں کہ جن سے تھک جاتے ہو[٦]۔

امام محمد باقر ۔ : ''خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ عمل ہے جس پر مداومت اور پابندی ہو، اگرچہ کم ہی ہو[٧]''۔
سلوکی مکتب کے ماہرین نفسیات پاولف، ثراندایک اور اسکینر میں سے ہر ایک حصول تعلیم کے متعلق عمل کی مشق اور تکرار کے

---

[١] (لِکُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا، وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ۔)(سورۂانعام، آیت١٣٢)۔
[٢] ''الیوم عمل ولا حِساب وغداً حساب ولا عمل ''۔(نہج البلاغہ، خ٤٢)۔
[٣] ''لا ینال ما عند اللّٰہ الّا بالعمل'' (وسائل الشیعہ ،ج١،ص ٦٩)۔
[٤] ''المرء لایصبحہ الّا العمل''(غرر الحکم، فصل٤، ص١٥١)۔
[٥] (وَاَنْ لَواسْتَقَامُوا عَلَی الطَّرِیْقَۃِ لَاَسْقَیْنَاہُم مَاءً غَدْقاً)(سورۂجن، آیت١٦)۔
[٦] ''قلیل تدوم علیہ ارجی من کثیر مملول منہ۔''(شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج١٩، ص١٦٩)۔
[٧] ''احب الاعمال الی اللہ عزوجل مادام العبد علیہ وان قلّ''(وسائل الشیعہ ،ج١ ،ص٧٠)۔

بارے میں ایک نظر رکھتے ہیں، ثراندایک اپنے قانون تمرین[١] میں کہتا ہے: ''محرک اور جواب کے درمیان پیوند اور ارتباط استفادہ کے زیر اثر قوی ہوجاتے ہیں[٢]''

گاتری ایک دوسرا سلوکی ماہر نفسیات ہے جو اپنے تعلیم وتربیت کے نظریہ میں اس سلسلہ میں کہ کیوں مشق نتیجۂ عمل کو بہتر بناتی ہے لکھتا ہے: . کسی عمل کا سیکھنا یقیناً مشق کا محتاج ہے، ہماری نظر میں اس امر کی دلیل یہ ہے کہ عمل ایسا نتیجہ دیتا ہے کہ جو مختلف موقعیت کے تحت اور مختلف حرکتوں کے ذریعہ کہ جو ان موقعیتوں سے مناسبت رکھتی ہیں حاصل ہوتا ہے، ایک عمل کا سیکھنا ایک حرکت کے (جیسے جسم کے کسی حصہ کا عام طور سے سکڑنا جو کہ تداعی سے حاصل ہوتا ہے) سیکھنے کے برعکس یقیناتمرین ومشق کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ ضروری ہے کہ مقتضی حرکتیں اپنی نشانیوں کے ساتھ ایک دوسرے کو وجود بخشیں۔

حتی کہ ایسا سادہ عمل جیسے کہ ایک کھلونا ،فاصلہ جہت اور کسی چیز کی موقعیت کی بنیاد پر مختلف حرکتوں کو شامل ہوتا ہے۔ ایک کامیاب تجربہ اس بات کے لئے کہ بچوں کو کسی عمل کے لئے آمادہ کرے، کافی نہیں ہے، کیونکہ جو حرکت ایک حالت میں حاصل ہوتی ہے ممکن ہے کہ دوسری بار کامیاب نہ ہو[٣]''۔

پھر مہارت اور تشکیل عادت کے بارے میں کہتاہے :دلیل اس بات کی کہ کامل مہارت حاصل کرنے کے لئے کیوں زیادہ مشق اور تکرار کی ضرورت ہے؟ یہ ہے کہ یہ مہارتیں محتاج ہیں کہ زیادہ اور خاص حرکتیں بہت سی محرکانہ موقعیتوں کے ساتھ جڑی ہوں، ایک مہارت، ایک عام عادت نہیں ہے، بلکہ عادتوں کا ایک عظیم مجموعہ ہے کہ جو مختلف موقعیتوں میں ایک معین نتیجہ دیتا ہے... خلاصہ یہ کہ ایک مہارت کثرت عمل سے تشکیل پاتی ہے[٤]تھوڑا سا غور کہا جاسکتا ہے کہ اخلاقی ملکات اور فضائل بھی اس نظریہ میں مہارتوں سے مانند وجود میں آتے ہیں اور انسان میں ثبات پاتے ہیں، اس وجہ سے اگرچہ صرف مکتب سلوکیت کا نظریہ (تعلیم وتعلم میں شناختی یا

---

[١] ہرگنہان نظریہ ھای یاد گیری، ترجمہ یوسف،٢٧٥۔
[٢] ہرگنہان نظریہ ھای یاد گیری، ترجمہ یوسف، ص٧٨۔
[٣] ہرگنہان نظریہ ھای یاد گیری، ترجمہ یوسف ، ص٢٧٥و٢٧٦۔
[٤] ایضاً، ص٢٧٧۔

عاطفی کے عوامل کی جانب توجہ نہ ہونا) ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہے[1] لیکن کسی عمل کی مشق کا اثر ایک اساسی عامل کے عنوان سے قابل انکار نہیں ہے۔ ارسطو ''اخلاق'' نامی کتاب میں کہتا ہے: ''جس طرح ہم گھر بنا کے معمار ہوجاتے ہیں، عادلانہ عمل انجام دینے سے عادل ہوجاتے ہیں اور پرہیزگاری کا عمل انجام دے کر پرہیزگار بن جاتے ہیں اور کوئی بہادری کا کام کرنے سے بہادر ہوجاتے ہیں[2]'' اور یہ بالکل اسی دقیق طور پر مداومت عمل کی روش کو بیان کرتا ہے۔

اخلاقی کتابوں کے مؤلفین بھی عملی روش پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اخلاقی بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں نظری روش ساتھ یا اس عمل پہلو پر بڑی تاکید کرتے ہیں کہ جس سے مقصود اخلاقی فضائل کے مطابق افعال انجام دینے کا اہتمام وتمرین ہے ایسے اعمال میں مشغول ہونا ہے جو اخلاقی رذائل کے خلاف ہیں ۔

ملا محمد مہدی نراقیؒ اخلاقی بیماریوں کے طریقہ علاج کے بارے میں فرماتے ہیں'' :انحراف اورکج روی (عدم اعتدال)کی علت اگر جسمانی بیماری ہو تو اس کے برطرف کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جلد سے جلد طبی علاج کریں، اور اگر اس کی علت نفسانی ہو تو اس کا علاج وہی بالکل جسمانی علاج کی طرح ہے،

جسمانی علاج میں سب سے پہلے ایسی غذا سے جو بیماری کی ضد ہو علاج کرتے ہیں، مثال کے طور پر سرد مزاج بیماری کا علاج گرم مزاج اور تند غذاؤں سے کرتے ہیں، اگر فائدہ نہ ہوا تو پھر دوا سے، اس کے بعد زہر مار کے ذریعہ آخر میں عضو کو جلاکے یا کاٹ کے (جراحی) کے ذریعہ معالجہ کرتے ہیں۔ نفسانی بیماریوں میں بھی قانون ایسا ہی ہے، اس طرح سے کہ انحراف اور کجروی کو جاننے کے بعد اس اخلاقی فضیلت کو حاصل کرنے لئے کہ جو اس انحراف کی ضد ہے، اقدام کرے اور ان افعال سے جو اس فضیلت کے

---

[1] مکاتب روانشناسی ونقد آن ،ج۶،ص۱۴۱۔
[2] ارسطو، اخلاق نیکو ماخس، ترجمہ ابو القاسم حسینی، ج۱، ص۳۷۔

آثار شمار ہوتے ہیں یہ امر غذا کے مانند اس اخلاقی رذیلت کو زائل کرنے میں اثر کرتا ہے۔ پھر اگر مفید واقع نہ ہوتو پھر مختلف صورتوں میں فکری، زبانی اور عملی طور پر اپنے نفس کو مورد توبیخ و سرزنش قرار دے۔

پھر اگر وہ بھی موثر نہ ہو تو پھر ایک منفی اور متضاد صفت کے آثار کو کہ جو اس اخلاقی صفت سے تضاد رکھتے ہوں حد اعتدال میں انجام دے گا، جیسے ڈرپوک انسان دلیرانہ عمل انجام دے اور خود کو خطرناک کام میں ڈال دے اور کنجوس انسان اس صفت کے زوال کے لئے جود و بخشش کا سہارا لے۔ یہ مرحلہ جسمانی مداوا میں تریاق اور زہرمار دوا کے مانند ہے۔ اگر اس مرحلہ تک بھی اخلاقی بیماری مستحکم طور پر برطرف نہ ہوئی، تو پھر خود کو طرح طرح کی ان سخت تکلیفوں اور ریاضتوں کے ساتھ رنج وزحمت میں مبتلا کرے جو اس اخلاقی رذیلت کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کا باعث ہوں، یہ مرحلہ جسمانی علاج میں عضو کے جلانے اور قطع کرنے کے مشابہ ہے کہ جو آخری مرحلہ ہے[1]۔

۱۔ جیساکہ معلوم ہے کہ اخلاقی تربیت کے سلسلہ میں علمائے اخلاق نے عمل اور مشق پر خاص طور سے توجہ دی ہے، اس وجہ سے اس روش کے تحقق کے لئے درج ذیل طریقوں کو بیان کیا جاسکتا ہے :

الف ۔ مشق اور عادت ڈالنا: ہم یہاں پر ''عادت'' کے متعلق اخلاقی فلسفہ کے لحاظ سے بحث نہیں کرنا چاہتے جیسے یہ بحث کہ آیا اخلاقی فعل عادت کی حاکمیت اور اس کے غلبہ کے ساتھ اخلاقی ہونے سے خارج ہوجاتا ہے یا نہیں[2]؟

اور نہ نفس شناسی کے لحاظ سے بحث کرنا چاہتے ہیں مثال کے طور پر عادت کیا ہے، اس کی کتنی قسمیں ہیں اور کس طرح وجود میں آتی ہے[3]؟ بلکہ اس سے یہاں پر مراد یہ ہے کہ مشق اور تکرار کے ذریعہ ایسے مرتبہ تک پہنچا جاسکتا ہے کہ اخلاقی مسائل ملکات میں تبدیل

---

[1] جامع السعادات ،ج۱ ،ص۹۷، ۹۸۔

[2] استاد مطہری، تعلیم وتربیت دراسلام، ص۷۵ پر ملاحظہ ہو۔
[3] احمد صبور اردوبادی: معمائے عادت۔

ہوجائیں، جیساکہ حضرت علی ـ نے فرمایا ہے: ''اَلعَادَۃ طبع ثانٍ[1]'' ''عادت انسان کی دوسری طبیعت اور سرشت ہے''۔
بلند ترین اصول ومبادی اور مکارم اخلاق میں تربیت کی مرکزیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تربیت پانے والے کے لئے کچھ حد تک جسمانی، نفسیاتی اور اخلاقی پسندیدہ عادات حاصل ہوں،تاکہ زیادہ سے زیادہ ارادہ اور توانائی کا مصرف ان کی جانب توجہ دینے سے آزاد ہوجائے۔

اس موضوع میں اسلام کی تربیتی روش سے متعلق دو نکتے قابل توجہ ہیں :

١۔دینی واجبات اور فرائض میں عمل کا استمرار اور پابند اس حد تک اہمیت کی حامل ہے کہ ترک عمل کے لئے اس کی قضا اور کبھی کفار بھی لازم ہوجاتا ہے، اخلاقی امور میں بھی ''نذر'' اور ''عہد وقسم''کو اخلاقی فعل کو اپنے لئے ایک فریضہ کی صورت میں اپنا سکتا ہے، اگرچہ ان روشوں سے زیادہ استفادہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اپنی حیثیت اور منزلت کو کھوبیٹھے گا یا انسان پر بہت گراں اور شاق گزرے گا، البتہ معمولی انداز میں بھی خود سے تعہد کرسکتا ہے کہ اخلاقی فعل کو پابندی کے ساتھ انجام دے گا، تاکہ اُس کا ملکہ نفس میں راسخ ہوجائے۔

٢۔کیفیت عمل کی جانب توجہ کرنا : اسلام میں عمل کی ظاہری شکل وصورت آخری مقصود نہیں ہے، بالخصوص اخلاقی فعل اسلام کی نظر میں خاص اخلاقی اصول و مبادی کا حامل ہونا چاہئے، جیسے صحیح نیت، عمل کی صحیح شکل وصورت اور لوازم عمل کی جانب توجہ (جیسے یہ کہ عمل کے بعد ریا، منّت گذاری اور اذیت کے ذریعہ اس عمل کو ضائع نہ کرے)۔

[1] غرر الحکم، فصل٢، ص٣٢٢۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ نے خداوند عالم کے ارشاد: (لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا[1]) (تاکہ خدا تمھیں آزمائے کہ تم میں سب سے بہتر عمل کرنے والا کون ہے ؟) کے متعلق فرمایا: ''اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ کوئی زیادہ عمل کا مالک ہو، بلکہ خشیت خداوندی اور درست نیت کے لحاظ سے بہتر اعمال مراد ہیں[2]۔

ب ۔ اضداد سے استفادہ: اخلاقی رذائل کو زائل کرنے سے متعلق یہ طریقہ تربیتی طریقوں میں سے سب سے زیادہ مؤثر ہے، اضداد سے سلوکی مکتب کے نظریات میں ''تقابلی ماحول سازی'' کے عنوان سے رفتار بدلنے کے لئے استفادہ کیا جاتا ہے۔ تقابلی ماحول سازی ایسا نتیجہ ہے کہ جس میں ایک ماحول کا جواب ایک دوسرے ماحول کے جواب سے جو اُس سے ناسازگار اور ناموافق ہوتا ہے ،جانشین ہوتا ہے، اور یہ سبب ہوتا ہے کہ اس ماحول کا جواب جو کہ نامطلوب ہے (اور ہم چاہتے ہیں کہ تبدیل ہوجائے) جدید ماحول کے محرک کے ہوتے ہوئے نہ دیا جائے، اس کا اہم ترین فن منظم طریقہ سے (خیالی) حساسیت کا ختم کرنا اور واقعی حساسیت اور خود حساسیت کا ختم کرنا ہے[3]۔

اخلاقی کتابوں میں بھی اس روش سے کثرت کے ساتھ استفادہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پرابو حامد غزالی ''کبر'' کے ختم کرنے سے متعلق لکھتا ہے'' :اگر کوئی اپنے دوست ورفیق سے علمی مناظرہ میں کوئی حق بات سنے اور احساس کرتا ہے کہ رقیب کی حقانیت کا اعتراف اُس کے لئے مشکل ودشوار ہے، تو اسے چاہئے کہ اس کبر کے معالجہ کے لئے اپنے اندر کوشش کرے.....

.عملی طریقہ اس طرح ہے کہ رفیق کی حقانیت کا اعتراف جو کہ اس کے لئے دشوار ہے، اپنے اوپر لازم کرے اور اُسے برداشت کرے اور اس کی تعریف وتوصیف کے لئے اپنی زبان کھولے اور مطلب سمجھنے کے سلسلہ میں اپنی ناتوانی اور کمزوری کا اقرار کرے

[1] سورۂہود ،آیت ۷۔
[2] کافی ، ج۲،ص ۱۶۔
[3] علی اکبر سیف، تغییر رفتار و درمانی،ص ۲۵۲۔

اور اس کا چونکہ اُس نے اُس سے ایک بات سیکھی ہے، شکریہ ادا کرے.... لہٰذا جب بھی اس امر کی متعدد بار پابندی کرے گا، اُس کے لئے طبیعی اور عادی ہوجائے گا اور حق قبول کرنے کی سنگینی، آسان ہوجائے گی[1]''۔

مرحوم نراقی نے بھی علاج کے طریقوں میں ایک طریقہ اخلاقی رذائل کے خلاف افعال کا انجام دینا قرار دیا ہے، اس توضیح کے ساتھ کہ کبھی اخلاق کی ایک منفی صفت کے زائل ہونے کے لئے ایک دیگر منفی صفت (کہ جو اعتدال کی حد میں ہو) کا سہارا لیں، مثال کے طور پر خوف ختم کرنے کے لئے جسارت آمیز اور شجاعانہ عمل انجام دینا چاہئے تاکہ خوف ختم ہوجائے۔

حضرت امیر المومنین علی ۔ فرماتے ہیں: ''جب کسی چیز سے ڈر محسوس کرو تو اُس میں کود پڑو، کیونکہ کبھی کسی چیز سے ڈرنا، خود اس چیز سے سخت اور ناگوار ہوجاتا ہے[2]''۔

اس روش سے متعلق قرآن کا تربیتی نکتہ یہ ہے کہ بری عادات اور اخلاقی رذائل کا یکبارگی اور اچانک ترک کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ اسے مرحلہ وار اور تدریجاً انجام دیا جائے۔ شراب خوری، ربا، جوئے بازی اور بعض دیگر امور کے بارے میں قرآن نے تدریجی مقابلہ پیش کیا ہے۔

ج۔ ابتلاء اور امتحان: ''ابتلا'' ''بلیٰ'' کے مادہ سے ہے یعنی اس کی اصل ''بلیٰ'' ہے بوسیدہ اور فرسودہ ہونے کے معنی میں اور ابتلا (یعنی آزمائش) کو اس لئے ابتلا کہتے ہیں کہ گویا کثرت آزمائش کی وجہ سے فرسودہ ہوجاتا ہے۔ ابتلا افراد کے متعلق دو نکتوں کا حامل ہے: ۱۔ جو کچھ اس کے لئے مجہول اور نامعلوم ہے اُس سے آگاہی اور شناخت۔

۲۔ انسان کی نیکی یا برائی کا ظاہر ہونا[3]۔

---

[1] احیاء علوم الدین، ج۳، ص ۳۴۴۔
[2] ''اذا ہبت امراً فقع فیہ فانّ شدّۃ توقیہ اعظم ممّاتخاف منہ''۔(نہج البلاغہ، ح۱۷۵)۔
[3] المفردات

امتحان کی تعبیر بھی ابتلا اور آزمائش کی نوع پر بولی جاتی ہے[1] امتحان اور آزمائش ہمیشہ عمل کے ذریعہ ہے، کیونکہ ابتلا بغیر عمل کے بے معنی ہے، عمل کے میدان میں انسان کے باطنی صفات ظاہر ہوتے ہیں اور اس کی صلاحتیں قوت سے فعلیت تک پہنچتی ہیں۔ اسی لئے ابتلا اور امتحان فیزیکل اعتبار سے ایک عملی طرز ہے یا عمل کی پابندی کرنا ہے اس میں اور تمرین و عادت میں فرق یہ ہے کہ مشق وتمرین ایک اخلاقی فضیلت کی نسبت ملکہ ایجاد کرنے کے لئے معین ہے لیکن طرز ابتلاء میں، کام عمل اور سختیوں اور مشکلوں کی تہ میں واقع ہونا مقصود ہے۔

اس روش اور طرز کی بنیاد پر مربی کو چاہئے کہ تربیت حاصل کرنے والے کو عمل میں اتار دے تاکہ خود ہی پستیوں اور بلندیوں کو پرکھے اور تلخ وشیرین کا تجربہ کرکے میدان سے سرفراز اور سربلند باہر آئے۔ تربیت پانے والے خود بھی مستقل طور سے ایسے شیوہ پر عمل کرسکتے ہیں۔

''المیزان'' میں مرحوم علامہ طباطبائی کا کلام الٰہی کے امتحانوں کے سلسلہ میں تربیتی عنوان سے قابل توجہ ہے: ''...اس وجہ سے انسانوں کے لئے عام الٰہی تربیت حُسن عاقبت اور سعادت اس دعوت دینے کے اعتبار سے امتحان ہے کیونکہ انسان کے لئے حالات کو مشخص و معین اور آشکار کرتی ہے کہ آیا یہ شخص کس عالم سے متعلق ہے: عالم ثواب وا جزا یا عالم عقاب و سزا۔ اس وجہ سے خداوند متعال اپنے تصرفات کو حوادث کی تشریع اور توجیہ کے عنوان سے بلاء، ابتلأ اور فتنہ نام دیتا ہے، مثال کے طور پر عام عنوان سے فرماتا ہے: (اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِینَۃً لَہَا لِنَبْلُوَہُمْ اَیُّہُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً [2]) ''بے شک ہم نے روئے زمین کی ہر چیز کو زمین کی زینت قرار دیا ہے تاکہ ان لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے'' یا فرماتا ہے: (وَنَبْلُوکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَۃً [3])...

[1] المفردات
[2] سورۂکہف ،آیت ۷۔
[3] سورۂ انبیاء ،آیت ۳۵۔

اور ہم اچھائی اور برائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے...'' یا فرماتا ہے: (اَنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ[1]) ''تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں'' وغیرہ۔

یہ آیات جیسا کہ آپ ملاحظہ کررہے ہیں انسان سے متعلق ہر مصیبت وبلا کو ''الٰہی امتحان وآزمائش'' شمار کرتی ہیں تمام امور کے لئے جیسے اس کا وجود، اس کے اجزا اور اعضاء جیسے آنکھ، کان یا اس کے وجود سے خارج چیزیں جو اُس سے مربوط ہیں جیسے اولاد، بیوی، رشتہ دار، احباب، مال، جاہ و مرتبہ مقام اور وہ تمام امور کہ جن سے وہ کسی قسم کا فائدہ حاصل کرتا ہے، اسی طرح ان کے مقابل امور جیسے موت اور تمام مصیبتیں ۔ ان آیات میں افراد کے اعتبار سے بھی ایک عمومیت پائی جاتی ہے یعنی مومن وکافر، نیکوکار اور گناہگار، انبیاء اور ان سے کم درجہ والے سارے افراد معرض بلا و امتحان میں ہیں، لہٰذا یہ اللہ کی ایک جاری وساری سنت ہے کہ کوئی اس سے الگ نہیں ہوسکتا[2]'' ۔

یہ بات کہ امتحان اور ابتلاء جملہ امور میں تمام افراد کے لئےاللہ کی بلا استثناء ایک جاری سنت ہے ، ابتلا کے تربیتی روش سے منافات نہیں رکھتی، کیونکہ اس طرح کے امور کے ساتھ ہمارے طرز عمل کو ایک تربیتی طرز کے عنوان سے مانا جاسکتا ہے یعنی مشکلات میں صبر وتحمل اور نعمات میں شکر کہ جس کی بازگشت ہمارے طرز عمل ہی کی جانب ہے، خود اخلاقی تربیت کے عوامل میں محسوب ہوسکتا ہے: اور ہم قطعی طور پر تم کو کچھ چیزوں جیسے خوف، بھوک، اموال، نفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو بشارت دیدو، (وہی لوگ) کہ جب ان پر مصیبت پڑتی ہے، کہتے ہیں: ''ہم خدا ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے[3]''

اس کے علاوہ اگرچہ آیات میں خیر وشر، نعمت ونقمت، سختی اور سہولت سب کو امتحان اور ابتلا کے مصادیق میں شمار کیا گیا ہے حتی کہ بعض روایات میں شکر وکشادگی کی منزل میں طرز عمل کو صبر وناگواری کے وقت سے زیادہ سخت جانا گیا ہے، لیکن جو چیز

---

[1] سورۂ تغابن ، آیت ۱۵ ۔
[2] المیزان ،ج۴ ،ص۳۶۔
[3] سورۂبقرہ ،آیت ۱۵۵۔۱۵۶۔

امتحان کے موقع پر افراد کی توجہ کا زیادہ تر مرکز ہوتی ہے وہ ناگوار، رنج آمیز اور اندوہگین حوادث وواقعات کا مقابلہ کرنا ہے، چنانچہ مذکورہ آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ خوفناک اور ہولناک امور، بھوک، دلبندوں اور عزیزوں کے فقدان، اموال اور سرمایہ حیات کی نسبت آفات وحوادث وغیرہ سے (کہ جنھیں اصطلاح میں ''مصیبت'' کہا جاتا ہے) تمھیں آزمائیں گے، ان امور کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادگی اور اُن سے ہمارا طرز مقابلہ ان میدان کو ایک تربیتی اور اصلاحی مدرسہ بنا سکتا ہے۔

ابتلاء اور سختیوں سے مقابلہ کے تربیتی علائم روایات میں یوں بیان ہوئیہیں: گناہ سے پاک ہونا، باطنی خاکساری وتذلل اور خارجی سرافرازی وسربلندی، کبر ونخوت کا زائل ہونا، درجہ بلند ہونا، شدائد ومشکلات کے سامنے ثابت قدمی، آخرت اور خدا کی ملاقات کا اشتیاق۔

...''یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ خدا نے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے (عمل میں) آزمائش کرے اور جو کچھ تمہارے ضمیر کی حقیقت ہے اُسے آشکار کردے اور خدا سینوں کے اسرار سے آگاہ ہے[1]۔

حضرت امام جعفر صادق ـنے بھی فرمایا: '' وہ لوگ آزمائش کی بھٹی میں آزمائے جائیں گے، جس طرح سونے کو بھٹی میں آزمایا جاتا ہے اور خالص کئے جائیں گے جس طرح سونا کھرا اور خالص کیا جاتا ہے[2]۔

سید قطب کی تحریر کے مطابق: تمام وسائل پر حوادث کی ایک تربیتی وسیلہ کے عنوان سے فضیلت وبرتری یہ ہے کہ ایسی خاص حالت روح میں پیدا کرتے ہیں کہ گویا اس کو پگھلادیتے ہیں۔ حادثہ روح کو کامل طور سے جھنجھوڑدیتا ہے ورد عمل (تاثیر وتاثر) ایک حرارت اس کے باطن میں ایجاد کردیتا ہے کہ کبھی نرم کرنے کے لئے یا نرم کرنے کی حد تک پہنچنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

[1] (وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِى صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِى قُلُوبِكُم، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ)(سورۂآل عمران ،آیت ۱۵۴)۔
[2] ''یفتنون کما یفتن الذہب، یخلصون کما یخلص الذہب''۔(کافی ،ج۱،ص ۳۷۰۔)

یہ حالت روح میں نہ ہمیشہ پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی نفس کے لئے آسان ہے کہ سکون واطمینان اور امن وامان یا راحت طلبی کی حالت میں اس تک پہنچ جائے۔

... ''ایک مثل لوگ کہتے ہیں: جب تک لوہا گرم ہے کوٹ لو، کیونکہ لوہے کی گرمی کے وقت اُس پر ہتھوڑا مارنا آسان ہے اور اسے جس شکل میں چاہے بدل سکتے ہیں... اس وجہ سے سختیوں اور حوادث سے استفادہ کرنا تربیت کے اہم مطالب میں سے ہے، کیونکہ نفس کے پگھلنے اور گداز ہونے کی صورت میں مربی تربیت دئے جانے والے کو ارشاد وتہذیب کے جس رنگ میں چاہے رنگ سکتا ہے وہ اس طرح کہ کبھی اس کا اثرزائل نہیں ہوگا یاکم ازکم جلدی زائل نہیں ہوگا[1]۔

اسی طرح سختیوں سے استفادہ اور عیش وراحت سے دوری کو اس شیوہ کا مکمّل (پوراکرنے والا) جانا جا سکتا ہے، سختیاں انسان کے گوہروجودکو جلا بخشتی ہیں، اور اس میں نکھاراورچمک پیدا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سختی، مقاومت کہ جوحادثوں اور سختیوں کی طوفان میں ہمیں حاصل ہوتی ہے، انسان کو نادرست اخلاقی میلانات اور رجحانات کے مقابل محفوظ رکھتی ہے اس وجہ سے روایات میں تاکیدکی گئی ہے کہ بچہ تھوڑا سا کو مشکلات اور سختیوں سے دوچارکرو۔

حضرت امام موسیٰ کاظم ۔ فرماتے ہیں '' :بہترہے بچہ عہد طفولیت میں زندگی کی ناگزیر سختیوں اور مشکلوں کا سامنا کرے جو کہ حیات کا تاوان ہے تاکہ جوانی اوربڑھاپے میں بردباراورصابرہو[2]۔

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں '' :جنگل، ہوا اور طوفان میں پرورش پانے والے درخت باغبان کے پروردہ اور تروتازہ درختوں سے بہتر ہوتے ہیں[3]۔

[1] روش تربیتی اسلام، ص۲۸۸،۲۸۷۔
[2] وسائل الشیقہ، ج۵، ص۱۲۶۔
[3] نہج البلاغہ، نامہ، ۴۵۔

اسلام میں جہاد اسی زاویہ سے قابل توجہ و تحقیق ہے دین کے دشمنوں سے جہاد اور مقابلہ خواہ صدر اسلام میں ہو یا بعد کے زمانوں میں (بالخصوص آخری دفاع مقدس کے دوران) ایک تربیتی اور اخلاقی مدرسہ رہا ہے ،اور اخلاق کی بلندیوں پر فائز انسان اُس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئے ہیں'' :ہم یقیناً تمہیں آزمائیں گے تاکہ تم میں سے مجاہدین اور صابرین کو جان لیں اور (اس طرح) تمھارے حالات کو باقاعدہ جانچ لیں[1]۔

ڈاکٹر ''ویکٹور فرانکل ''،سویڈن کا ماہر نفسیات ہے اور ہیومنسٹ معالجین میں سے محسوب ہوتا ہے اور خود بھی ایک طولانی مدت تک جرمنی کے نازیوں چھاؤنی میں دوسری عالمی جنگ میں اسیر رہا ہے، اس نے اپنی آنکھوں سے جو انسان سوزی کی بھٹیاں دیکھیں اور بھوک، سردی، بیماری اور سخت ترین رنج والم اٹھائے لیکن اس کی جان بچ گئی۔ چھاؤنی سے آزاد ہونے کے بعد اُس نے اپنے معنوی علاج کے مکتب(Logothrapy) کی بنیاد ان تین راہوں میں سے ایک راہ کے کشف وتفہیم پر رکھی : ا :۔اچھے امور کا انجام دینا ۔ ٢ :۔ تجربۂ اعلیٰ جیسے عشق۔ ٣رنج والم برداشت کرنا۔

وہ تیسری راہ کی وضاحت میں کہتا ہے: رنج والم کابرداشت کرنا انسان کی بہترین وجودی جلوہ گاہ ہے اور جو بات اہم ہے وہ انسان کا رنج والم کے ساتھ فکر اور سلوک کا انداز ہے۔ ہدف زندگی رنج والم سے فرار کرنا نہیں ہے، بلکہ زندگی کو بامعنی بنانا ہے کہ اُسے واقعی مفہوم عطا کرے۔ ہرچیز کوایک انسان سے لیاجاسکتا ہے مگر انسان کی آخری آزادی کو اس کی رفتار کے انتخاب میں ڈاسٹایوفسکی کے بقول: میں صرف ایک چیز سے ڈرتاہوں اور وہ یہ کہ اپنے رنج والم کی شائستگی اور لیاقت نہ رکھوں[2]۔

د ۔معاشرت و مجالست: اخلاقی ملکات کے رسوخ کے لئے ایک دوسرا عملی شیوہ صالح اور اخلاقی فضائل کے حامل افراد کے ساتھ زندگی گذارنا اور ناپاک نیز اخلاقی رذائل میں مبتلا افراد کی مجالست وہمنشینی سے اجتناب کرنا ہے، نفس شناسی کے دلائل بہت سی جہتوں سے قابل توجہ ہیں کہ جو تفصیل اور تکرار کے محتاج نہیں ہیں،

---

[1] سورۂمحمد ،آیت٣١۔
[2] دیکٹور فرانکل: انسان درجستوی معنا۔

منجملہ ان کے تقلید اور دوسروں کے اعمال کا مشاہدہ (باندوار کا نظریہ)،قوت بخش چیزوں کے وجود کے ساتھ ماحول سازی اور تداعی (موافقت وہماہنگی) کی ایجاد (اسکینز کا فعال ماحول سازی کا نظریہ،یعنی مثال کے طور پر ایک اچھے اور صالح گروہ میں اگر ایک اچھا باعمل انسان سے صادر ہو تو دیگر تمام افراد کے ذریعہ اس کی تقویت کی جائے)۔ (نظریہ تسہیل اجتماعی[1])ہے (دوسروں کا وجود حتی غیر فعال تماشائیوں کا وجود انسان کی فعالیت کو قوت بخشتا ہے (کیونکہ انسان کے مقصد کو بلندی عطا کرتا ہے)۔

آیات وروایات میں نیکو کاروں کی معاشرت اخلاقی تربیت کے ایک شیوہ کے عنوان سے مورد تاکید واقع ہوئی ہے اور بزرگوں نے بھی اس سلسلہ میں مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔

قال الحواریون لعیسیٰ ـ : یاروح اللہ مَن نجالس اذاً؟ قال: من یذکرکم اللہ رؤیتہ ویزید فی علمکم منطقہ ویرغبکم فی الآخرۃ عملہ[2]۔ حواریوں نے حضرت عیسیٰ ـ سے پوچھا :اے روح اللہ!اس وقت ہم کس کے ساتھ ہمنشینی رکھیں؟انھوں نے فرمایا: جس کا دیدار تمھیں اللہ کی یاد دلائے، جس کی بات تمھارے علم میں اضافہ کرے اور جس کا عمل تمھارے اندر آخرت کے متعلق رغبت پیدا کرے۔

یا ابن مسعود، فلیکن جلساؤک الابرار واخوانک الاتقیاء والزہاد لان اللہ تعالیٰ قال فی کتابہ: (الاخلاء یومئذ بعضہم لبعض عدو الآ المتقین[3])۔

اے ابن مسعود!تمھارے ہمنشین نیک لوگ ہونے چاہئیں اور تمھارے بھائی (دوست) متقی وزاہدین ہونے چاہئیں اس لئے کہ تم خدائے تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: ''اس دن صاحبان تقویٰ کے علاوہ تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے''۔

امام علی ـ : جالس العلماء تزدد حلما[4]۔ علمائے کی ہمنشینی اختیار کرو کہ ان کی ہمنشینی حلم میں اضافہ کرتی ہے۔

---

[1] زمینہ روانشناسی ، ج۲ ،ص۲ ۳۷۔
[2] بحار الانوار ،ج۷۷ ،ص۱۴۷۔
[3] بحار الانوار ،ج۷۷ ،ص۱۰۰۔
[4] غرر الحکم ،فصل ۳،ص ۴۷۔

امام حسین ـ: مجالس الصالحین داعیۃ الی الصلاح[1]۔صالحین کی مجالس (نشست) صلاح ونیکی کی طرف دعوت دیتی ہے۔

امام علی ـ: جالس العلماء یزدد علمک ویحسن ادبک وتزکوا نفسک[2]۔ علماء کی ہمنشینی اختیار کروکہ اس سے تمھارے علم میں اضافہ ہوگا، تمھارا ادب اچھا ہوگا اور تمھارا نفس پاک ہوگا۔

امام علی ـ: علیک باخوان الصدق فاکثر من اکتسابھم فانھم عدۃ عند الرخاء وجُنّۃ عند البلاء[3]۔ تم پر سچے (نیک) دوستوں کی ہمنشینی لازم ہے پس ان سے زیادہ زیادہ سے زیادہ کسب فیض کرو اس لئے کہ وہ آسائش کے وقت وسیلۂ دفاع ہیں اور مصیبت کے وقت سپر ہیں۔

امام علی ـ: جانبوا الاشر وجالسوا الاخیار[4]۔ بروں سے پرہیز کرو اور نیکوں کی ہمنشینی اختیار کرو۔

حضرت امام محمد باقر ـ: لاتقارن ولاتواخ اربعۃ: الاحمق والبخیل والجبان والکذاب[5]۔ چار افراد سے ہمنشینی اور دوستی اختیار نہ کرو: احمق، کنجوس، ڈرپوک اور جھوٹے سے۔

امام علی ـ: مجالسۃ اہل الھویٰ منساۃ للایمان[6]۔ خواہش پرست کی ہمنشینی ایمان کو بھلادیتی ہے۔ ''تنبیہ''بھی لغت میں آگاہ کرنے،بیدار کرنے،تادیب اور سزادینے کے معنی میں ہے (فرہنگ معین)۔ یہاں پر تنبیہ سے مراد انسان کے لئے تکلیف دہ اسباب ووسائل سے عمل انجام دینے کے بعد عمل کو دور یا کم کرنے کے لئے استفادہ کرنا ہے۔ اس وجہ سے تشویق یا تنبیہ کو خود انسان یا دوسروں کے ذریعہ عملکو کنٹرول کرنے کا ایک سسٹم جاننا چاہئے کہ پسندیدہ یا ناپسندیدہ عمل کے بعد اس عمل کی زیادتی یا کمی کے لئے ان چیزوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

---
[1] بحار الانوار ،ج۷۸ ،ص۱۴۱۔
[2] غرر الحکم ،فصل ۱،ص ۴۳۰۔
[3] بحار الانوار ،ج۷۴ ،ص۱۸۷۔
[4] غرر الحکم
[5] بحار الانوار ،ج۷۴ ،ص۱۸۷۔
[6] نہج البلاغہ ،ج۸۶۔

تشویق یا تنبیہ کا نفسیاتی مبنیٰ، فعال ماحول سازی کے نظریہ کے مطابق، درج ذیل آزمائشوں پر استوار ہے :

۱۔ ہر جواب جو ایک قوت بخش محرک کے نتیجہ میں حاصل ہو، اس کی تکرار کی جاتی ہے ۔

۲۔ قوت بخش محرک ایک ایسی چیز ہے کہ جواب ملنے کے احتمال کو بڑھاتا ہے۔

۳۔ ان قوت بخش چیزوں جو ذاتی طور پر تقویت کرنے کی خاصیت کے حامل ہیں، اولین یا غیر شرطی قوت بخش کہتے ہیں، اولین مثبت قوت بخش جاندار کی جسمانی قوت ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جیسے: پانی، غذا، ہوا، وغیرہ ۔ اولین منفی قوت بخش چیزیں ذاتی طور پر تکلیف دہ خاصیت رکھتی ہیں جیسے: مارپیٹ، گالم گلوج، زیادہ حرارت اور زیادہ نور وغیرہ ۔

۴۔ ثانوی یا شرطی قوت بخش چیزیں وہ ہیں جو کلاسیک ماحول سازی (اولین بخش چیزوں کے ساتھ ہمراہی چیزوں کے ساتھ ہمراہی اور تداعی) کے اصول کے مطابق تقویت کرنے کی خاصیت رکھتی ہیں جیسے: روپیہ، انعام، نمبر وغیرہ ۔

۵۔ اگر کوئی رفتار کسی چیز کی تقویت سے بڑھ جائے اور اسے ایک مدت تک تقویت نہ کریں، تو وہ تدریجاً موقوف ہوجائے گی کہ اُسے ''خاموشی'' بھی کہتے ہیں۔

۶۔ تنبیہ، ایک نادرست اور نا مطلوب رفتار کے دور کرنے کے لئےتکلیف دہ محرک و سبب کے وارد کرنے کے معنی میں ہے۔

۷۔ کبھی کبھی تقویت مسلسل تقویت سے زیادہ اثر رکھتی ہے، لہٰذا اگر مربی (تربیت دینے والا) ہر بار مطلوب اور پسندیدہ رفتار کے ظاہر ہونے کے بعد جزا و سزا دے، تو ناخواستہ طور پر اس کے وقوع کا احتمال کم ہوتا جائے گا، لیکن اگر مربی کبھی کبھی چند بار مطلوب رفتار انجام دینے کے بعد جزا دے، تو اس کے توقعکا احتمال زیادہ ہوجائے گا زیادہ موثر یہ ہے کہ تربیت کی ابتدا میں مسلسل جزا ہو اور رضایت بخش سطح تک پہنچنے کے بعد نوبت وار کبھی کبھی ہوجائے ۔

۸۔ آغاز میں اجتماعی قوت بخش (ستائش،تائید اور مسکراہٹ وغیرہ) محسوس طور پر قوت بخش چیزوں کے ساتھ استعمال کی جائے اور اس کے بعد محسوس قوت بخش چیزیں ترک کردی جائیں ،آیات وروایات میں تشویق وتنبیہ کے تربیتی کردار پر تاکید کی گئی ہے۔

حضرت امیر المومنین علی ۔ مالک اشتر کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں'' :تمہارے نزدیک نیکو کار اور بد کاریکساں نہ ہوں، کیونکہ یہ امر (یکساں قرار دینا) نیکو کاروں کے نیکی ترک کرنے اور نااہلوں کی بدکاری میں اضافہ کا باعث ہوگا، لہٰذا ادب کی رعایت کے لئے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ حالات کے مطابق برتاؤ رکھو[۱]۔

''نیکوکاروں کی اصلاح ان کا ادب و احترام کرنے سے ہوتی ہے اور بدکاروں کی اصلاح ان کی تادیب کرنے (سزا دینے)سے[۲]۔

''جوکچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب خدا کے لئے ہے،تاکہ جن لوگوں نے برا کیا ہے وہ ان کے کرتوت کی انھیں سزا دے اور جن لوگوں نے احسان ونیکی ہے انھیں اچھا بدلہ دے [۳]۔

''خداوند سبحان نے جزا اپنی اطاعت پراور سزا اپنی معصیت پر قرار دی ہے،تاکہ اپنے بندوں کو اپنے عذاب سے باز رکھے اور بہشت کی طرف روانہ کرے[۴]۔

ادیان الٰہی اور اسلام میں قانون عذاب وثواب کو دو اعتبار سے دیکھا جاسکتا ہے: اول یہ کہ ان کا اعلان کرنا انذار وتبشیر کا پہلو رکھتا ہے، دوسرے یہ کہ ثواب وعقاب کی واقعیت عینی ہے کہ اُن میں سے بعض دنیا میں (جیسے سکون واطمینان، راحت وچین، زندگی کی آسائش اور عیش وعشرت کو احساس) اور درک کرتا ہے،اس لحاظ سے تشویق وتنبیہ اُن دونوں کی تطبیق واقع سے دور نہیں ہے۔

---

[۱] بحار الانوار ،ج۷۷ ،ص۴۶۔
[۲] ''استطلاح الاخیار باکرامہم والاشراربتأدیبہم''(بحار الانوار ،ج۷۸ ،ص۲۴۵)۔
[۳] سورۂنجم ،آیت ۳۱۔
[۴] نہج البلاغہ ،حکمت ۳۶۸۔

اُس کا اخروی حصہ جیسے حور وقصر ومحلات وغیرہ بھی ایمانی بصیرت (انسان کا دوسرے عالم اور وعدہ الٰہی کے قطعی ہونے اور اس بات پر اعتقاد رکھنا کہ انسان اپنے اعمال سے اس ثواب یا عقاب کو اس وقت بھی عینی تجسم بخشتا ہے) کے اقضا کے مطابق حاضر وموجود ہیں اور انھیں بھی تنبیہ وتشویق کے مصادیق میں شمار کر سکتے ہیں۔

اس بناپر بہشت ودوزخ اور اللہ کے وعدہ و وعید سے متعلق تمام آیات ایک طرح بندوں کی تشویق اور تنبیہ کے لئے ہیں تاکہ وہ اپنی عادت اور روش کو بدل ڈالیں اور فلاح وکامیابی اور فضائل اخلاقی کے حامل ہونے کی راہ میں گامزن ہوجائیں۔ لیکن ان لوگوں کے لئے جن کا عقیدہ وایمان کمزور ہے، ان کے لئے وہ آیات انذار وتبشیر ہی کی حد میں ہوں گی ۔

دوسرانکتہ جس کی ہمیں تاکید کرنی ہے یہ ہے کہ یہاں پر تشویق، ترغیب اور تحریض (ابھارنے) کے علاوہ ایک چیز ہے، تشویق عمل انجام دینے کے بعد کی چیز ہے، لیکن ترغیب وتحریض قبل از عمل سے مربوط ہیں۔ تشویق وتنبیہ کے وہ طریقے جن میں ایک طرح منطقی ترتیب کا لحاظ کیا جاسکتا ہے، درج ذیل ہیں :

الف ۔ عاطفی توجہ: محبت آمیز نگاہ ، مسکرانا،اور ہر قسم کی تائید ، مہر ومحبتاور طلف کا احساس تربیت پانے والے کو عزت نفس کے عمیق احساس میں مبتلا کر دیتاہے، کیونکہ ہر انسان حُب ذات کے زیر اثر غیروں کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کا محتاج ہوتا ہے[۱]۔

درج ذیل آیات اس سلسلہ میں قابل توجہ ہیں

:(وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ [۲])

''اور جو صاحبان ایمان آپ کی اتباع کرلیں ان کے لئے اپنے شانوں کو جھکا دیجئے''۔

[۱] اس بات کی مزید توضیح ''تکریم شخصیت کی روش ''کی بحث میں گذر چکی ہے۔
[۲] سورۂشعراء ،آیت۲۱۵۔

(وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهُ وَلَاتَعْدُ عَیْنَاکَ عَنْهُمْ[1]

'اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ صبر آمادہ کرو جو صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اسی کی مرضی کے طلبگار ہیں اور خبردار تمھاری نگاہیں ان کی طرف سے نہ پھر جائیں۔

ان آیات میں خداوند متعال اپنے مہربان حبیب سے چاہتا ہے کہ مومنین کے لئے لطف ومرحمت کے بازو جھکادیں، ان کی طرف سے چشم محبت نہ ہٹائیں اوران کے ساتھ ہمراہی اور صبر وشکیبائی کریں دوسری آیت میں اپنے رسول کی بلند ترین ان صفات کے حامل ہونے اور مومنین کے ساتھ ایسی معاشرت رکھنے پر معاملات کرنے کی توصیف کرتا اورفخرو مباہات کرتا ہے: ''یقیناً تمھارے پاس تمھیں میں سے وہ پیغمبر آیا ہے کہ تمہاری ہر مصیبت پراس کے لئے بہت ناگوار ہے وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حرص رکھتا ہے اور مومنین پر دلسوز ومہربان ہے[2]۔

جی ہاں، وہ روح پرورنگاہ جو انسانوں پر عشق ومحبت کے ساتھ پڑتی ہے، انسان کو متحرک کرنے کے لئے کافی ہے اور بلال وسلمان کی صف میں بٹھادیتی ہے۔

ب۔ زبانی تشویق: تعریف وتمجید، دعا، شکریہ ادا کرنا اور زبانی قدردانی بھی اُن عام وسائل اور اسباب میں سے ہیں کہ بلند مقاصد اور گرانمایہ اخلاقی اعمال تک رسائی کے لئے اُن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے خداوند عالم اپنے پیغمبر سے چاہتا ہے کہ مومنین سے زکات لینے کے بعد ان کے لئے دعا کریں[3]۔

حضرت امیر المومنین علی ۔ نے بھی مالک اشتر سے خطاب کرتے ہوئے انھیں اس نکتہ کی یاد آوری کی ہے :

---

[1] سورۂکہف آیت۲۸۔
[2] سورۂتوبہ آیت ۱۲۸۔
[3] سورۂتوبہ آیت ۱۰۳۔ ۴۔ نہج البلاغہ ،نامہ ۵۳۔

...ان کی پے درپے تشویق کرو اور جو انھوں نے اہم کام انجام دئے ہیں انھیں شمار کرو (اہمیت دو) کیونکہ ان کے نیک کاموں کی یاد آوری ان کے دلیروں کو زیادہ سے زیادہ حرکت کرنے پر ابھارتی ہے، اور وہ لوگ جو کام میں سستی کرتے ہیں انھیں کام کرنے کا شوق پیدا ہوگا، انشاء اللہ۔

زبانی تشویق میں اہم نکتہ یہ ہے کہ اور موقع و محل سے اس حد تک استفادہ ہو اور افراط وتفریط یا چاپلوسی کی حالت پیدا نہ ہو

امام علی ۔ نے فرمایا ہے :جب تم تعریف وثنا کرو تو اختصار پر اکتفا کرو[١]۔

سب سے زیادہ بے عقلی اور حماقت، تعریف وستائش یا مذمت میں زیادتی کرنا ہے[٢]۔

''استحقاق سے زیادہ تعریف کرنا چاپلوسی ہے اور اس (استحقاق) سے کم تعریف کرنا حسد یا عاجزی کی علامت ہے[٣]۔

بہت سے افراد اپنی تعریف وتمجید ہونے سے مغرور ہوجاتے ہیں[٤]۔

ج ۔ عملی تشویق: انعام، ہدیہ، تحفہ وغیرہ دینا، نمبر، تنخواہ یا حقوق یا مزدوری میں اضافہ کرنا، سیاحت اور تفریح کے لئے لے جانا، کھیلنے کی یا دوستوں کے ہمراہ باہر جانے کی اجازت دینا وغیرہ ، یہ سب عملی تشویق شمار ہوتی ہے کہ موقعیت کے اعتبار سے ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت میں ایسے متعدد مقامات پائے جاتے ہیں کہ کسی ایک آدمی کے نیک عمل کا مشاہدہ کرنے کے بعد اُسے صلہ اور ہدیہ دیتے ہیں حتی کبھی اپنا لباس بھی دیدیتے تھے، جیسے کمیت بن زیاد اسدی کی داستان کہ

---

[١] ''اذا مدحت فاختصر ''(غرر الحکم، فصل ۴،ص۴۶۶)۔
[٢] ''اکبر الحمق الاغراق فی المدح والذم '' (غرر الحکم، فصل ۷،ص۷۷)
[٣] ''الثناء بأکثر من الاستحقاق ملق والتقصیر عن الاستحقاق عیٌّ أوحسدٌ'' (بحارالانوار ،ج۷۳،ص ۲۹۵)۔
[٤] ''رُبّ مفتون بحسن القول فیہ''(بحارالانوار ،ج۷۳،ص ۲۹۵)۔

حضرت امام زین العابدین کی خدمت میں پہنچے اور کہا : میں نے آپ کی مدح وثنا میں کچھ اشعار کہے ہیں اور چاہتا ہوں کہ انھیں پیغمبر ﷺ سے تقرب کا وسیلہ قرار دوں ۔ پھر اپنا معروف قصیدہ آخر تک پڑھا، جب قصیدہ تمام ہو گیا،

امام ۔ نے فرمایا: ''ہم تمہاری جزا نہیں دے سکتے، امید ہے کہ خداوند عالم تمہیں جزا دے ۔ ''پھر اس کے بعد اپنے بعض لباس انھیں دیدیئے اور اُن کے حق میں اس طرح دعا کی: ''خدایا! کمیت نے تیرے پیغمبر کے خاندان کی نسبت، اس حالت میں نیک فریضہ ادا کیا کہ اکثر لوگوں نے اس کام سے بخل کیا اور شانہ خالی کیا ہے جو حق دوسروں نے پوشیدہ رکھا تھا اس نے آشکار کر دیا ۔ خدایا! اسے سعادت مند زندگی عطا کر اور اُسے شہادت نصیب کر اور اُسے نیک جزا دے کہ ہم اُس کی جزا نہیں دے سکتے جزا ور ناتواں ہیں ۔

کمیت نے بعد میں کہا : ''میں ہمیشہ ان دعاؤں کی برکت سے بہرہ مند رہا ہوں'' حضرت نے اس طریقہ سے کمیت کی روح شجاعت اور حق گوئی کی تشویق اور تائید کی ۔ اسی کے مشابہ داستان حضرت امام علی رضا ۔ کے بارے میں بھی دعبل خزاعی کی نسبت ہے جب وہ قصیدہ پڑھ چکے تو حضرت نے وہ دس ہزار درہم کہ جن پر آپ کا نام کندہ تھا اُنھیں عطا کیا اور دعبل نے ہر درہم کو اپنی قوم کے درمیان (دس) درہم میں فروخت کیا[1] ۔

درج ذیل نکات کی رعایت تشویق کی تاثیر میں اضافہ کرتی ہے :

۱ ۔ تشویق ابھارنے اور قوت بخشنے کا ذریعہ ہے لہٰذا خود وہی ہدف نہیں بن جانا چاہئیکہ اور تربیت پانے والے کے تمام افکار واذہان کو اپنے ہی لئے سرگرم رکھے ۔ تشویق کبھی کبھی کرنا، اس کا فیزیکی سطح سے اجتماعی ومعنوی بلندی کی طرف لے جانا اور تشویق کا مستحق ہونا (رشوت کی حالت کا نہ رکھنا) ایک حد تک مذکورہ اشکال واعتراض کو برطرف کر دیتا ہے ۔

---

[1] عیون اخبار الرضا ۔، ج۱، ص۱۵۴۔

۲۔ تربیت پانے والے کو تشویق کی علت مکمل طور پر واضح اور معلوم ہونی چاہئے۔

۳۔ تشویق موقع و محل کے اعتبار سے ہو تاکہ کار آمد اور موثر ثابت ہو۔

۴۔ تشویق کرتے وقت اُس کا کسی دوسرے سے مقائسہ اور موازنہ نہیں کرنا چاہئے ؛کیونکہ اُس پر بُرا اثر پڑے گا۔

۵۔ مجمع میں تشویق و تحسین کرنا زیادہ اثر رکھتا ہے کیونکہ دوسروں کو بھی آمادہ کرتا ہے۔

د۔ جزاے محرومیت اور نیکو کار کو جزا دینا : اس مرحلہ کے بعد تنبیہ کے طریقوں میں داخل ہو جائیں گے۔ مربی تربیت دئے جانے والے کی نا شائستہ حرکات و سکنات کو ختم کرنے کے لئیاسے ان بعض جزاؤں اور مواہب سے محروم کردے جن کی وہ امید رکھتا ہے یا یہ کہ نیکو کاروں کو جزا دے کر اُسے اپنی محرومیت کی جانب متوجہ کرے اور اس کے اشتباہ و خطا کی نشاندہی کرے۔ حضرت علی ۔ کے گہربار اور زریں کلام میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''نیکو کار کو جزا دے کر بدکار کو ان کی بدکاری سے روک دو[1]۔
(أفَمَن کَانَ مُؤمِناً کَمَن کَانَ فَاسِقاً لَایَستَوون [2])

''کیا وہ شخص جو صاحب ایمان ہے اس کے مثل ہوجائے گا جو فاسق ہے؟ ہرگز نہیں، دونوں برابر نہیں ہو سکتے''۔

(لَایَستَوِی اَصحَابُ النَّارِ وَاَصحَابُ الجَنَّةِ [3]) ''اصحاب جنت اور اصحاب جہنم ایک جیسے نہیں ہو سکتے''۔

(وَمَایَستَوِی الاعمیٰ والبصیر والذین آمنوا وعملوا الصالحات ولاالمسيء قلیلا ماتتذکرون [4])۔

''اور یاد رکھو کہ اندھے اور نابینا برابر نہیں ہو سکتے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے ہیں وہ بدکاروں جیسے نہیں ہو سکتے ہیں، مگر تم لوگ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو''۔

---

[1] ''از جرالمسيء بثواب المحسن''بحار، ج۷۵، ص۴۴، باب ۳۶
[2] سورۂ سجدہ، آیت ۱۸۔
[3] سورۂحشرآیت ۲۰۔
[4] سورۂغافر، آیت ۵۸۔

خداوند عالم ان آیات میں واضح طور پر نیکوکاروں اور بدکاروں کے مساوی نہ ہونے کا اعلان کرتا ہے، اس سے اس کا مقصود یہ ہے کہ سب جان لیں کہ اچھے لوگوں کے لئے جزا ہے اور ناشائستہ اور قبیح اعمال والوں کے لئے محرومیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہ۔جرمانہ اور تلافی: جرمانہ نمبر کم کرنے ،پیسہ دینے، دوستوں کے لئے مٹھائی خریدنے وغیرہ کی صورتوں میں ہوتا ہے۔ تلافی جیسے اس انسان سے عذر کرنا جس کی توہین کی ہے یا جس جگہ کوئی نقصان پہنچایا ہے اس کی تعمیر کرے یا مرمت کرے جرمانہ کے سلسلہ میں توجہ رکھنا چاہئے کہ ادا کرنے یا کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور بے چارگی اور بیزاری کی حالت پیدا نہ ہو۔ جرمانہ کے شیوہ سے استفادہ کی شرط یہ ہے کہ انسان کی ایک مدت تک تقویت کی جائے تاکہ پہلے جو اُسے جزائیں دی گئی ہیں بعد میں اُس سے واپس لی جاسکیں۔ اسلام میں دیت کا قانون اس کے حقوقی جنبہ کے علاوہ تربیتی جنبہ سے بھی ایک قسم کا جرمانہ حساب ہوتا ہے۔

و۔ سرزنش وتوبیخ اور جسمانی توبیخ وتنبیہ: توبیخ، غیض وغضب کی نظر سے شروع ہوتی ہے اور علانیہ توبیخ تک پہنچتی ہے[1]۔

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''عقلمندوں کی سزا کنایہ اور اشارہ کی صورت میں ہوتی ہے اور نادانوں کی سزا واضح اور صریح انداز میں ہوتی ہے[2] ''تعریض (کنایہ میں توبیخ کرنا) عقلمند کے لئے آشکار توبیخ سے کہیں زیادہ سخت ہے[3]''

حضرت امام جعفر صادق ۔ ''شعرانی'' جوکہ پیغمبر کے چاہنے والوں میں سے تھے، خلوت میں بالواسطہ طور پر نصیحت کے ذریعہ انھیں ان کے ناپسند عمل (شرابخوری) کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں'' :اچھا کام سب کے لئے اچھا ہے اور تمہارے لئے سب سے بہتر ہے اس انتساب کی وجہ سے جو تم ہم (اہل پیغمبرؐ)سے رکھتے ہو اور برا کام سب کے لئے برا ہے لیکن تم سے سب سے زیادہ برا ہے اس انتساب کی وجہ سے کہ جو تم ہم سے رکھتے ہو[4]۔

[1] ایک اعتبار سے مخفی اور پوشیدہ توبیخ کو جرمانہ اور تلافی سے قبل جاننا چاہئے)۔
[2] ''عقوبۃ العقلاء التلويح وعقوبۃ الجہال التصريح ''(ميزان الحكمۃ ج۱،ص ۷۲)۔

[3] ''التعريض للعاقل اشد من عقابہ'' (ميزان الحكمۃ ج۱،ص ۷۲)۔
[4] ''يا شقر اني انّ الحسن لكل احد حسن وانہ منک احسن لمكانک منّا وان القبيح لكل احدٍ قبيح وانّہ منک اقبح''(بحار الانوار ،ج۴۷ ،ص۳۴۹ ،باب ۱۱)۔

جسمانی تنبیہ سب سے آخری مرحلہ میں ہے کہ گذشتہ مراحل میں ناکامی کی صورت میں خاص شرائط وحالات پائے جانے کی صورت میں اُس سے استفادہ ہوتا ہے، تنبیہی طریقہ کلی طریقے پر اور جسمانی تنبیہ خاص طور پر صاحبان نظر کے نزدیک محل اختلاف میں ہے، بعض جیسے سعدی و مولوی جسمانی تنبیہ کے طرفدار تھے،اور اس سے استفادہ کو جائز سمجھتے ہیں کہ بعض دیگر جیسے غزالی، بوعلی اور ابن خلدون نے مربی کو جسمانی تنبیہ سے تین بار سے زیادہ یا غصہ کی حالت میں روکا ہے[۱]۔

ماہرین نفسیات کے درمیان بھی بعض جیسے رین اور ہولز خاص شرائط وحالات پائے جانے کی صورت میں تنبیہ سے استفادہ کو رفتار تغییر کے معاملہ میں مفید جانتے ہیں[۲]

اس کے باوجود اکثر ماہرین نفسیات رفتار کی تبدیلی اور تربیت کے لئے تنبیہ سے استفادہ کے مخالف ہیں۔اسکینر نہایت تاکید کے ساتھ تنبیہ سے استفادہ کو کلی طور پر خطرناک ،نامطلوب اور بے اثر شمار کرتا ہے اور متعدد دلائل بھی اپنے مدعا کے لئے پیش کرتا ہے[۳]:

۱۔تنبیہ دوسرے نامطلوب مضر آثار کا پیش خیمہ ہوتی ہے، جیسے عمومی خوف۔

۲۔تنبیہ اجسم کو پتہ دیتی ہے کہ کیا کام نہ کرے نہ یہ کہ کیا کام کرے۔

۳۔تنبیہ دوسروں کو صدمہ پہنچانے کی توجیہ کرتی ہے۔

۴۔تربیت پانے والا اگر مشابہ موقعیت میں واقع ہو جائے اور قابل تنبیہ نہ ہوتو ممکن ہے وہ اسی کام کے کرنے پر مجبور ہو جائے۔

۵۔تنبیہ، تنبیہ کرنے والے اور دوسروں کی نسبت پر خاش ایجاد کرتی ہے۔

۶۔تنبیہ عام طور پر ایک نامطلوب جواب کو دوسرے نامطلوب جواب کا جانشین بنا دیتی ہے، جیسے بد نظمی کی جگہ رونا۔

---

[۱] نقش تربیت معلم، دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ۔
[۲] ہیلگارد:روان شناسی یادگیر ،ص ۳۳۷۔
[۳] ہرگنھان: روان شناسییاد گیری ،ص۱۳۳۔

اسکینر اس کے بعد تنبیہ کے لئے بہت سی جانشین چیزوں کا ذکر کرتا ہے، جیسے ایسے مقتضیات کی تبدیلی جو نامطلوب رفتار کا باعث ہوتی ہے اور ناموافق رفتار کی نامطلوب رفتار سے تقویت، آخر میں نتیجہ نکالتا ہے کہ نامطلوب عادات کے ختم کرنے کا بہترین طریقہ انھیں نظرانداز کرنا یا پھر خاموشی (تغافل اسی کے مانند ہے) اسلام کی نظر میں[1] اگر تربیت نچلے درجوں اور طریقوں سے ممکن ہو تو جسمانی تنبیہ سے استفادہ جائز نہیں ہے اور اس کے علاوہ جسمانی تادیب اور تنبیہ (اس شرط کے ساتھ کہ اس حد میں نہ ہو کہ دیت لازم آجائے تو) جائز ہے انسان کے ولی کے علاوہ کی طرف سے بھی اجازت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اس کی مقدار بھی محدود ہے (زیادہ سے زیادہ تین سے دس ضرب تک) فقہاء کے فتاویٰ بھی اسی طرح ہیں[2]۔

تنبیہ کی نفی پر اسکینر کے اعتراضات کے بارے میں کلی طور پر کہا جاسکتا ہے:

۱۔ بعض ماہرین نفسیات جیسے رین اور ہولز خاص شرائط وحالات کے تحت (جیسے یہ کہ تنبیہ نامطلوب کاموں کے بعد فوراً بلافاصلہ ہو اور اس حد تک ہو کہ انسان کے لئے تکلیف دہ ہو۔ تنبیہ کو رفتار کی تبدیلی میں موثر جانتے ہیں اور اس سلسلہ میں آزمائشیں بھی کی ہیں۔

۲۔ تنبیہ کے ہیجان آور نتائج (جیسے خوف یا پرخاش) کہ اسکینر جس کا ذکر کرتا ہے اس صورت میں منفی ہوجائیں گے جبکہ پہلے سے مربی اور تربیت پانے والے کے درمیان صرف ایک عاطفی ررابطہ رہا ہو کہ تنبیہ کی تاثیر کی شرط بھی اس طرح کے رابطہ موجود ہونا ہے۔

حضرت امیرالمومنین ۔ کے ایک چاہئے والے نے چوری کی تو حضرت نے اُس کے ہاتھ کو قطع کردیا۔ ''ابن کواء'' جو کہ خوارج میں سے تھا اس نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے سوال کیا: کس نے تمھارے ہاتھ کو قطع کردیا ہے؟ اس نے جواب دیا: میرے ہاتھ کو پیغمبروں کے اوصیاء کے سید وسردار، قیامت کے دن سرخرو حضرات کے پیشوا، مومنین کی نسبت سب سے زیادہ

---

[1] البتہ تنبیہ کے موضوع پر اسلام کی فقہی نظر کا استخراج (حکم اولیہ اور ثانویہ کی صورت میں) مستقل فرصت کا محتاج ہے۔
[2] امام علی رضا ۔: ''التادیب ما بین ثلاث الی عشرةٍ''، مستدرک الوسائل، ج۳، ص۲۴۸۔ تحریر الوسیلۃ، ج۲، ص ۴۷۷۔

حقدار ... نے ابن کواء غصہ میں بولا: وائے ہو تم پر! وہ تمہارے ہاتھ کو قطع کرتے ہیں اور تو ان کی اس طرح مدح وثنا کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا: کیوں تعریف نہ کروں جبکہ ان کی محبت میرے گوشت وخون میں ملی ہوئی ہے، خدا کی قسم میرے انھوں نے ہاتھ کو صرف حق کی خاطر قطع کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ مجھے آخرت کی سزا سے نجات دیں[1]۔

۳۔ تنبیہ ناپسند استعدادوں اور صلاحیتوں کے کنٹرول کرنے اور خاموش کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان لوگوں کے لئے جن کے بارے میں نرم رویہ نتیجہ بخش ثابت نہیں ہوتا ہے، صرف ممکن طریقہ یہ ہے کہ ایک توبیخ و سرزنش یا پھر نفسیاتی جھنجھوڑ ان کے اندر ایجاد کریں، بالخصوص اگر تسلط پسند اور طغیان آمیز طبیعت رکھتے ہوں، جس طرح انسان کے جسم میں بدبودار اور کثیف غدود کو قطع کردیتے یا جلادیتے ہیں تاکہ دیگر حصوں تک سرایت نہ کرے۔ ''البرٹ الیس''ان ماہرین نفسیات میں ہے کہ جو اپنے علاج اور مشاورہ میں ناگہانی سرزنش وتوبیخ اور اس کے مانند دوسری چیزوں سے استفادہ کرتا ہے اور ایک جھٹکا دے مشاورہ کے درمیان مراجع کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔

اسلام کا سزائی اور جزائی نظام بھی جوکہ خاص جسمانی سزاؤں پر مشتمل ہے، اپنے حقوقی پہلوؤں کے علاوہ، تربیتی رخ سے بھی قابل توجہ ہے، کیونکہ انسان کو جرم کی تکرار سے روکتا ہے۔

مذکورہ نکات کے علاوہ تنبیہ کے استعمال میں درج ذیل چیزیں اس کی تربیتی تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں :

۱۔ ہر قسم کی تنبیہ سے پہلے ناپسند عمل کی علت کی شناخت سے مطمئن ہوں، بسااوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختلف گھریلو اور روحی مسائل ومشکلات کی بنا پر جوکہ ہم پر پوشیدہ ہیں، یہ خطا سرزد ہوگئی ہو، ایسی صورت میں تنبیہ مشکلات اور پیچیدگی کو اضافہ کرتی ہے۔

---

[1] بحار الانوار ،ج۴۰ ،ص۲۸۲،۲۸۱۔

۲ ۔ وہ تنبیہ مؤثر ہے جو جذبۂ انتقام اور غیض و غضب کی عنوان سے نہ ہو،اس وجہ سے بے جا سرزنش اور حد سے زیادہ تحقیر و توہین سے پرہیز کیا جانا چاہئے۔

۳ ۔تنبیہ سنجیدہ اور حسب ضرورت ہو اور میزان خطا سے آگے نہ بڑھ جائے۔ حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''ملامت میں زیادہ روی ضد اور ہٹ دھرمی کی آگ کو بھڑکا دیتی ہے[1]''۔

۴۔تنبیہ انسان کی نامطلوب صفت یا عمل سے دقیق رابطہ رکھتی ہو اور اسے تنبیہ کی علت کی نسبت مکمل آگاہی حاصل ہو۔

۵ ۔اگر انسان اپنے عمل سے شرمندہ وپشیمان ہوگیا اور اپنی رفتار سے باز آگیا تو اسے لطف و مہربانی کے ساتھ قبول کرلینا چاہئے۔

[1] ''الافراط فی الملامۃ یشبّ نار اللجاجۃ'' (غرر الحکم ،ج۱،ص ۸۸)۔

تیسری فصل

اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے

۹۔ خود پر ناظر ہونا یہ روش مکمل طور پر ''خود تربیتی'' صورت میں انجام پائے گی، اپنے آپ پر نظارت سے مراد یہ ہے کہ انسان کامل ہوشیاری اور مراقبت کے ساتھ قبول شدہ اخلاقی اقدار کی نسبت کوشش کرے کہ جو (جوارحی یا جوانحی) رفتار وکردار اخلاقی فضائل کے منافی ہیں اس کے وجود میں راستہ پیدا نہ کرنے پائیں اور اُس کے اخلاقی ملکات وقوتوں کے زوال اور سستی کا باعث نہ بنیں۔ اپنے آپ پر روش نظارت کے نفسیاتی مبانی میں دو مرحلے قابل تفکیک ہیں: پہلا مرحلہ اس روش کے استعمال سے متعلق ہے کہ تربیت پانے والا شوق اور مقصد کے اعتبار سے باندازۂ کافی آمادگی رکھتا ہو[1]۔

یہ مرحلہ گذشتہ روشوں کی مدد سے بالخصوص اقدار کی طرف دعوت کی روش اور عقلانی توانائی کی تربیت کی روش کے ذریعہ عملی ہونا چاہئیے، یعنی ایک شخص اس نظریہ تک پہنچے کہ یہ اقدار اور اخلاقی مقاصد اُس کے وجود میں پائدار رہیں اور اخلاقی رذائل اُس سے مٹ جائیں دوسرا مرحلہ اس روش کی تاثیر کی کیفیت کو واضح کرنا ہے۔

نفسیاتی نظام کے صادرات اور واردات تدریجی صورت میں ہماری وجودی شکل کی تعمیر کرتے ہیں، اور نفس شناسی کی اصطلاح میں ہمارے تزکیہ باطن اور ظاہر کو ایک تعادل پسندی کی طرف آگے بڑھاتی ہے، اس وجہ سے واردات وصادرات کی نوع کیفیت پر نظارت (کہ جو ہماری نیات اور مقاصد کو بھی شامل ہوتی ہے) اس شکل کو جہت دینے میں کہ جو ان کا نتیجہ ہے، مؤثر بلکہ قابل تعیین ہوسکتی ہے۔

[1] اخلاقی کتب میں اسے ''مقام یقظہ'' یعنی مقام بیداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(اسکینز کے)فعال ماحول سازی کے نمونہ میں یہ روش تقریبی طور پر ایک مستقل روش کے عنوان کے تحت تین مرحلہ بیان کی جاتی ہے[1]۔

۱ ۔اپنا مشاہدہ : اپنی رفتار کو دقت کے ساتھ جزئی اور کمی (مقدار ک)لحاظ سےثبت وضبط کرتا ہے۔

۲ ۔خود سنجی: (اپنے کو تولنا) موجودہ رفتاروں آئیڈیل نمونہ کے ساتھ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے مقایسہ اور موازنہ کیا جاتا ہے۔

۳ ۔ خود تقویتی: (اپنے آپ کو قوت پہنچانا) ایسی رفتار جو ہدف کو زیادہ قریب کرتی ہے اور اُس سے سنخیت رکھتی ہے، اس پر جزا دی جاتی ہے اور اس کے مدمقابل رفتار کو منفی تقویت کے ساتھ اور کبھی تنبیہ کے ذریعہ قابو اور کنٹرول میں رکھا جاتا ہے ۔

اس طرح سے رفتاری آثار ونتائج (پاداش اور تنبیہ)سے استفادہ کرنے سے اپنے آپ پر ایک دائمی نظارت اور مراقبت عمل میں آتی ہے دوسرے طریقے جو اسکینز اپنے کنٹرول اور ضبط نفس کے لئے اس سلسلہ میں ذکر کرتا ہے، یہ ہیں: اور اسباب وشرائط کا آسان یا تنگ کرنا (مثال کے طور پر فضول خرچ انسان، اپنی جیب میں کم پیسہ رکھے)، محرومیت، عاطفی شرائط وحالات پر تسلط، تکلیف دہ محرک سے استفادہ (جیسے گھنٹی والی گھڑی)اور دوسرے امور کی انجام دہی۔

مکتب سلوکیت کا نمونہ اسکینز کے نظریہ کے مطابق رفتار کی نظارت اور جانچ معمولی اور کم اہمیت کی حامل ہیں، لیکن ہم اس نمونہ اور توضیح سے بالاترین سطحوں کے لئے اور اپنے آپ پر نظارت کے لئے استفادہ کر سکتے ہیں اور نیات، اہداف ومقاصد حتی کہ اپنی رفتار وکردار کی خوبیوں پر کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اخلاقی کتابوں میں یہ روش بہت زیادہ مورد توجہ رہی ہے اور اس سے متعلق مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں[2]۔

---

[1] Psychoegyobhelthp.۱۰۳;۱۰k

[2] جیسے ان کے محاسبۃ النفس از سید ابن طاؤس اور محاسبۃ النفس کفعمی)

ان کتابوں میں مراقبہ، محاسبہ یا مرابطہ مرزبانی[دشمن سے سرحد کی حفاظت] کے عناوین کے تحت یہ بحث کی گئی ہے[1]۔

ابو حامد بندوں کے درمیان صرف صاحبان بصیرت جانتے ہیں کہ خداند عزوجل ان کا محافظ اورنگراں ہے اور محاسبہ میں دقت سے کام لیا ہے اور ان کی نسبت بہت جزئی امور میں بھی سوال اورباز پرس کرتا ہے، لہٰذا یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان امور سے نجات کا راستہ محاسبہ اور مراقبہ کے لزوم کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ کہ نفس کو حرکات اور لحظات کی نسبت جانچتے رہیں، لہٰذا جو اپنے نفس کو روز قیامت کے حساب وکتاب سے پہلے مورد محاسبہ قرار دے تو اُس دن اُس کا حساب آسان اور سوال کے وقت اُس کا جواب آمادہ ہوگا اورنتیجہ نیک اور اچھا ہوگا۔

اورجو کوئی اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرے گا اس کی حسرت دائمی اور قیامت کے مواقف میں اُس کا توقف طولانی ہوگااور اس کی برائیاں اسے ایسی ذلت وخواری کے گڑھے میں ڈھکیل دیں گی لہٰذا معلوم ہوا کہ خداوندعالم کی اطاعت کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور اُسی نے صبر مرزبانی کا حکم دیا ہے :

(یا اَیُّہا الَّذِین آمَنُوا اصْبِرُوا وَصابِرُوا وَرَابِطُوا[2])

''اے صاحبان ایمان تم لوگ صبر کرو، صبر کی تعلیم دو اور مرابطہ یعنی دشمن سے جہاد کے لئے تیاری کرو...'' لہٰذا تم مرابطہ ومرزبانی کرو پہلے مشارطہ کے ذریعہ اس کے بعد مراقبہ کے ذریعہ پھر محاسبہ اور پھر معاقبہ (سزا دینے) کے ذریعہ پھر اس کے بعد مجاہدہ اورمعاتبہ (عتاب کرنے) کے ذریعہ[3]...

---

[1] اخلاقی تربیت کی روش میں عرفاء شیعہ نے آخری دوسو سال میں (ملاحسین قلی ہمدانی، میرزا علی آقا قاضی، مرحوم بہاری، حاج میرزا جواد تبریزی ، مرحوم علامہ طباطبائی اور امام خمینیؒ تک نے)اپنے آپ پر نظارت (مراقبہ ومحاسبہ) کی روش پر بہت تاکید کی ہے اور اسے اپنے سلوک کی بنیاد قرار دیا ہے۔

[2] سورۂآل عمران ،آیت ۲۰۰۔

[3] احیاء العلوم، غزالی ،ج۴،ص ۴۱۷، ۴۱۸۔

اس لحاظ سے ایک دوسرے رخ سے بھی اپنے آپ پر نظارت اور نگرانی کا لزوم معلوم ہوا، محاسبۂ اعمال کردار کے تولنے کے لئے موازین قسط کے قرار دینا، قیامت کے دن حساب وکتاب کرنا اور ہمارے نامہ اعمال میں ان کے جزئیات کو ضبط کرنا کہ جن کو ہر شخص واضح طور پر دیکھے گا، ان سب باتوں کے قطعی ہونے کے پیش نظر محاسبہ اوراعمال پر نظارت کے لزوم کے سلسلہ میں کوئی تردید نہیں رہ جاتی اورخداوند اس سے کہیں زیادہ کریم ہے کہ اپنے بندوں سے دوبارہ حساب کا مطالبہ کرے ۔

قرآنی آیات اس سلسلہ میں بہت زیادہ واضح ہیں'' :ہم عدل وانصاف کا ترازو قیامت کے دن قرار دیں گے، پس کسی نفس پر بھی کسی چیز میں ستم نہیں جائے گا، اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا اُسے ہم لے آئیں گے اور ہم سب کا حساب کرنے کے لئے کافی ہیں[1] ۔

''اور جب نامۂ اعمال سامنے رکھا جائے گا، اُس وقت مجرمین کو اپنے نامۂ اعمال کے مندرجات سے خوفزدہ دیکھوگے اور وہ کہیں گے : اے ہم پروائے ہو، یہ کیسا نامۂ اعمال ہے کہ جس میں کوئی [کام]چھوٹا ہو یا بڑا چھوڑا نہیں گیاہے، بلکہ سب کو جمع کرلیاہے اور جوکچھ انھوں نے انجام دیا ہے وہ سب اس میں موجود پائیں گے اور تمہارا رب کسی پر ستم روا نہیں رکھتا[2] ۔

اپنے آپ پر نظارت کے طریقے درج ذیل ہیں :الف ۔ توبہ: اپنے آپ پر نظارت کی روش میں جب بھی انسان اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہے تو عام طور پر اپنے صحیفۂ اعمال کو اخلاقی رذائل سے آلودہ دیکھتا ہے ۔

ایسی صورت میں اگر ان برائیوں سے الگ اور جدا ہونے کی کوئی راہ اور امید نہ ہو تو انسان بدبختی اور شقاوت کے بھنور میں مکمل طور پر پھنس جائے گا، اورنا امیدی اور رذائل کے ہلاکت بار گڑھے میں گر جائے گا، اس کے علاوہ روحی اور نفسیاتی اعتبار سے گناہ کے اندر اسی حالت پیدا کرتا ہے کہ اگر رذائل نہ ہوں تو آئندہ مواقع پر اور بھی زیادہ گناہوں کے ارتکاب کرنے پر آمادہ ہوجاتاتا ہے ۔

---
[1] سورۂانبیاء ,آیت۴۷۔
[2] سورۂکہف ,آیت۴۹۔

اس وجہ سے اپنے اعمال کی غیر ارادی بنیادوں کے لحاظ سے ضروری ہے جیساکہ پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں '' :جب انسان سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو اُس کے دل میں سیاہ نقطہ ایجاد ہوجاتا ہے، پس اگر توبہ کرلیتا ہے تو مٹ جاتا ہے اوراگروہ گناہ جاری رکھا تو سیاہی اس کے پورے دل کوڈھانپ لیتی ہے اور کامیابی کی راہ مسدود ہوجاتی ہے[1]۔

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ''گناہ'' کے مختلف مفاہیم ہیں :نافرمانی اور بے وفائی کا احساس، اپنے آپ کو صدمہ پہنچانا، روح کو خراش لگانااور سزا کا مستحق ہونا۔ اگر یہ احساس گناہ انسان کی روح پر غالب آجائے اور سلسلہ باقی رہے، تو ذہنی افسردگی کا پیش خیمہ ہوگا اور انسان کو ہر قسم کی اپنی معنوی تعمیر اور اخلاقی فضائل کسب کرنے سے روک دے گا،اس وجہ سے توبہ اپنی از سرِ نو تعمیر کے لئے دوبارہ بازگشت کو کہتے ہیں، وہ تجدید اعمال کے لئے صاف وروشن نامۂ اعمال کے ہمراہ رحمت خداوندی کی امیدوار، مقلب، پختہ ارادہ کی مالک تعمیر کرتی ہے اور یہ توبہ وہی خدا کا لطف اور اس کی رحمت ہے،

حضرت امام جعفر صادق ۔ کے بقول ''توبہ اللہ کی رسی اور عنایت ربوبی ہے، لہٰذا بندے ہمیشہ توبہ کی کوشش کریں اور ہر گروہ کا ایک خاص توبہ ہے توبہ درحقیقت اپنے اوپر نظارت ہے[2]۔

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''اپنے نفس سے جہاد کرو اورتوبہ کو مقدم رکھوتاکہ اپنے رب کے مقام طاعت تک پہنچ جاؤ[3]۔

یہاں پر توبہ سے مراد راہ خطا اور عمل خلاف سے حسرت وندامت کے ساتھ واپس آنا ہے، یہ حسرت وندامت ہی کی آگ ہے جو اخلاقی گراوٹ اور پستی سے پاکسازی کے لئے راہ ہموار کرتی ہے اورایسا سوز وگذار ہے کہ جو انسان کے ذہن میں عفو و بخشش کا مزہ شیریں بناتی ہے اور طراوت، تازگی، طہارت وپاکیزگی کو انسان کے اندر وجود بخشتی ہے، ہر ابتدا اور ہر قدم کے لئے اپنی تربیت کے

---

[1] اذا أذنب الرجل خرج فی قلبہ نقطۃ سوداء فان تاب انمحت وان زاد زادت حتّی تغلب علی قلبہ فلا یفلح بعدہا ابداً''(کافی ،ج۲،ص ۲۷۱)۔
[2] مصباح الشریعۃ ،ص ۹۷۔ غررالحکم۔
[3] بحار الانوار ،ج۷۸ ،ص۷۲۔

سلسلہ میں توبہ لازم ہے تاکہ وہ انسانی عزّت وکرامت کا احساس واپس آجائے، ''اپنے متعلق اپنے قیمتی تصورات کا مشاہدہ کرے اور اخلاقی تربیت کے لئے آمادہ ہوجائے۔

''گناہوں کے اشجار کو اپنے قلب ونگاہوں کے سامنے قرار دیتے ہیں اور آب ندامت سے اُس کی آبیاری (سینچائی) کرتے ہیں، پھر صحت وسلامتی، رضا وکرامت کا پھل حاصل کرتے ہیں''۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں'' :جب کوئی بندہ واقعی (نصوح، خالص) توبہ کرتا ہے تو خدا کا محبوب ہوجاتا ہے اورخداوندعالم دنیا وآخرت میں اس کے گناہ کو پوشیدہ کردیتا ہے...... وہ دو فرشتے جو نامہ اعمال کو ثبت کرتے ہیں انھیں غافل بنا دیتا ہے اور اعضا وجوراح کو حکم دیتا ہے کہ اس کے گناہوں کو مخفی رکھیں اور زمین کے مختلف حصوں سے کہتا ہے کہ وہ سارے گناہ جو تم پر انجام دئے ہیں انھیں نظر انداز کردو، پھر خدا سے وہ ایسی حالت میں ملاقات کرتا ہے کہ ایسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جو اس کے گناہوں کی گواہی دے۔

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''توبہ دلوں کو پاک کرتی ہے اورگناہوں کو دھودیتی ہے[1]۔

امام خمینیؒ بھی توبہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں :توبہ نام ہے نفس کا مادیت روحانیت کی طرف رجوع کرنے کا، جبکہ گناہوں اور نافرمانی کی کدورت کے ذریعہ روحانیت (معنویت) اورنورانی فطرت، طبیعت کی ظلمت میں محجوب ہوجاتی ہے۔

اور اس انحصار کی تفصیل یہ ہے کہ نفس ابتدائے فطرت میں ہر طرح کے کمال، جمال، نور اور درخشندگی اور چمک دمک سے خالی ہوتا ہے، جس طرح سے کہ ان کے مقابل ومخالف صفات سے بھی خالی ہوتا ہے، گویا ایک ایسا صفحہ ہوتا ہے جو مطلق نقوش سے خالی ہوتا ہے، جس میں نہ کوئی روحانی اورمعنوی کمالات پائے جاتے ہیں اورنہ ہی صفات اضداد سے متصف ہوتا ہے۔

---

[1] ''التوبۃ تطہر القلوب وتغسل الذنوب''۔(غرر الحکم، فصل۵،ص۱۹۵)۔

لیکن ہر مقام و منصب کے حصول کی استعداد ولیاقت کا نور اُس میں بطور ودیعت رکھا گیا ہے اور اس کی فطرت استقامت پر ہے اور اس کا خمیر انوار ذاتیہ سے گوندھا ہوا ہے اور جب معاصی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے ذریعہ اُس کے دل میں ایک کدورت پیدا ہوجاتی ہے اور گناہ جس قدر زیادہ ہوتے ہیں، کدورت اور ظلمت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ دل بالکل ہی تاریک اور ظلمانی ہوجاتا ہے (یعنی گناہوں کی کثرت سے دل میں سیاہی اور ظلمانی پردہ حائل ہوجاتا ہے پھر اُس پر کوئی بات اثر نہیں کرتی) اور نور فطرت خاموش ہوجاتا ہے اور ابدی شقاوت وبد بختی تک پہنچ جاتا ہے،

اگر ان حالات کے دوران، دل کے تمام صفحہ پر ظلمت کے چھانے سے قبل خواب غفلت سے بیدار ہوجائے تو پھر بیداری کی منزل کے بعد توبہ کی منزل میں وارد ہو جاتا ہے اور طبیعی کدورت اصلی نور فطرت اور ذاتی معنویت کی طرف واپس ہوجاتی ہے گویا کہ تمام کمالات اور اس کی اضداد سے خالی ایک صفحہ ہوجاتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے: ''التائب من الذنب کمن لاذنب لہ ''۔گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کے مانند ہے[1]۔

اس بات کے لئے کہ انسان توبہ کرے اور مایوسی وناامیدی اس پر غالب نہ آئے، توبہ کی طرف دعوت دینے والی آیات کو پے در پے پڑھنا چاہئے اور یہ جاننا چاہئے کہ خداوند عالم کی عفو و بخشش اور رحمت ورأفت کا دامن نہایت وسیع ہے :

(وَتُوبُوا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعاً اَیُّہَا المؤمِنُون لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُون [2]) اور اے صاحبان ایمان!تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہو کہ شاید اسی طرح تمھیں فلاح اور نجات مل جائے''۔

---

[1] چہل حدیث ،ص۲۳۱، ۲۳۲۔
[2] سورۂنور ،آیت۳۱۔

(قُل یا عِبادِیَ الَّذِینَ اَسرَفُوا عَلیٰ أنفُسِہِم لَا تَقنَطُوا مِن رَحمَۃِ اللّٰہِ اِنَ اللّٰہَ یَغفِرُ الذُّنُوبَ جَمِیعاً اِنَّہُ ہُوَ الغَفُورُ الرَّحِیمُ[1]) ''پیغمبر! آپ پیغام پہنچا دیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہے اور وہ یقیناً بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے''۔

(یا اَیُّہا الَّذِینَ آمَنُوا تُوبُوا اِلَی اللّٰہِ تَوبَۃً نَّصُوحاً عَسیٰ رَبُّکُم اَن یُکَفِّرَ عَنکُم سَیِّئاتِکُم[2])

''اے ایمان والو! خلوص دل کے اللہ سے توبہ کرو عنقریب تمھارا پروردگار تمھاری برائیوں کو مٹادے گا''۔

ان باتوں کو بھی جان ودل سے سماعت فرمائیں :

...بالفرض اس فرض کی بنیاد پر ہے کہ اہل نجات اور اس کی عاقبت سعادت ہو پھر بھی اُس عالم میں گناہوں کی تلافی کوئی آسان کام نہیں ہے، پہلے شدائد، زحمات و مشکلات کا برداشت کرنا ضروری ہے تاکہ انسان شفاعت کے قابل بنے اور ارحم الراحمین کی رحمت اُس کے شامل حال ہوجائے، پس اے عزیز! جتنا جلدی ممکن ہو کمر ہمت کس لو اورعزم کو محکم اور ارادہ کو قوی کرلو اورگناہوں سے توبہ کرو کیونکہ ابھی جوانی کی عمر یا دنیاوی زندگی میں ہو،اور خداداد فرصت کو ہاتھ سے نہ گنواؤ اور شیطانی دھوکوں اور نفس امارہ کی چالوں پر توجہ نہ دو[3]۔

فرعون کے جادوگروں نے ایک دلیرانہ قدم اٹھایا اور توبہ کرلیا اوربارگاہ الٰہی کے مقربین کے درجہ تک پہنچ گئے ابراہیم ادہم، فضیل بن عیاض، حربن یزید ریاحی، جابر جعفی اور بدھ واقعی منقلب ہونے والوں کے نمونے ہیں۔

---

[1] سورۂزمر ،آیت۵۳۔
[2] سورۂ :تحریم ،آیت۸۔
[3] چہل حدیث ،ص ۲۳۳، ۲۳۴۔

توبہ کرنے کے بعد اس کے استحکام کے لئے اور گذشتہ گناہ کی تکرار نہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ درج ذیل باتوں کو یاد رکھیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''گناہ سے توبہ یہ ہے کہ پھر اس کی طرف واپس نہ آئے[1]۔

''خداوند سبحان کے نزدیک توبہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی اور جہالت کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں کہ خداوند کریم ان کی توبہ قبول کرتا ہے، اور خداوند متعال علیم دانا اور حکیم ہے[2]۔

''وہ لوگ وہ ہیں کہ جب برا کام کرتے ہیں، یا اپنے نفس پر ستم کرتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں، کون ہے خدا کے سوا جو گناہوں کو بخش دے؟ اور جو گناہ و قصور (ناگہانی) کر بیٹھے ہیں اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے[3]۔ تمام متعلق اور مربوط امور میں اصلاح اور تبدیلی: ''مگر جن لوگوں نے توبہ کیا اور اپنے عمل کی اصلاح کی اور خدا سے تمسک رکھا اور اپنے دین کو خدا کے لئے خالص طور پر اختیار کیا تو نتیجہ کے طور پر وہ لوگ مومنین کے ساتھ ہوں گے اور عنقریب خداوند عالم مومنین کو اجر عظیم جزا دے گا[4]۔

خود کو خدا کے حضور میں تصور کریں اور یہ جانیں کہ خدا ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے :ایک حبشی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور بولا: اے رسولؐ خدا! میں ایک بُرے کام کا مرتکب ہوا ہوں، آیا میرے لئے توبہ ہے؟ فرمایا: ہاں۔ پھر وہ چلا گیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آکر بولا: اے رسول خدا! آیا اس وقت خدا نے مجھے دیکھا ہے؟ فرمایا: ہاں، پھر اُس حبشی نے اس طرح چیخ ماری کہ روح اس کے جسم سے نکل گئی[5]۔

---

[1] نہج الفصاحۃ،حدیث ۱۲۱۱۔
[2] سورۂنساء، آیت۱۷۔
[3] سورۂآل عمران ،آیت۱۳۵۔
[4] سورۂنساء ،آیت۱۴۶۔
[5] احیاء العلوم، ابو حامد غزالی،ج۴،ص۱۵۔

آخری نکتہ: توبہ کے بعد اپنے آپ پر نظارت اور تحفظ کے لئے اپنے آپ سے عہد کرے اور مشارطہ کرے مشارطہ یہ ہے کہ پہلے دن مثال کے طور پر اپنے آپ سے شرط کرے کہ آج خداوند عزوجل کے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا اور اس بات کا عزم بالجزم کرے اور معلوم ہے کہ ایک دن خلاف ورزی نہ کرنا، بہت آسان امر ہے اور انسان آسانی سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے، تم عازم ہوکر شرط کرو اور تجربہ کرو تو دیکھو گے کہ کتنا آسان ہے۔ ممکن ہے کہ شیطان اور اُس ملعون کا لشکر تم پر اس امر کو بہت سخت دکھائے، لیکن یہ اُس ملعون کا دھوکا ہے۔ اُس پر دل سے حقیقتاً لعنت کرو اور باطل اوہام وخیالات کو دل سے نکال دو اور ایک دن تجربہ تو کرو، اس وقت اس کی تصدیق کرو گے[1]۔

یہ مشارطہ اور معاہدہ کلی طور پر ہفت گانہ اعضا (آنکھ، کان، زبان، شکم، دامن، ہاتھ اور پاؤں) کے ساتھ ہو یا یہ کہ ایک ایسی خالص اخلاقی رفتار یا خاص صفت سے متعلق ہو کہ انسان جس سے دوچار ہے، بہتر ہے کہ یہ مشارطہ پہلے ہی دن انجام دیا جائے۔ ملا مہدی نراقیؒ اس سلسلہ میں بڑی خوبصورت تمثیل پیش کرتے ہیں '' :جان لوکہ عقل آخرت کی راہ میں ایک تاجر کے مانند ہے جس کا سرمایہ اور پونجی عمر ہے اور اُسے وہ نفس کی مدد سے استعمال کرتا ہے کہ اس لحاظ سے عقل کے شریک کی مانند ہے کہ اُس کے مال میں تجارت کرتا ہے اور اس تجارت کا فائدہ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کا حصول ہے کہ انسان کو دائمی سعادت اور ابدی نعمت کی جانب راہنمائی کرتے ہیں۔ اُس کا نقصان اس صورت میں ہے کہ اس سے ایسے گناہ سرزد ہوں کہ جو دوزخ کے دردناک عذاب تک منتہی ہوجاتے ہیں... اور اس تجارت کی مدت پوری عمر ہے۔ جس طرح تاجر کی ابتدا میں اپنے شریک سے مشارطہ ومعاہدہ کرتا ہے پھر اس کا مراقب اورنگران ہوجاتا ہے اور آخر میں اس کا محاسبہ کرتا ہے اور ممکن ہے کہ اُس سے تاوان بھی مانگ لے، اسی طرح عقل کو بھی اپنی نفس کے ساتھ مشارکت میں ان امور کی رعایت کرنی چاہئے[2]۔

---

[1] چہل حدیث ،ص۸۔
[2] جامع السعادات ،ج۳،ص۹۳۔

ب۔ مراقبہ: امام خمینیؒ اس کی توضیح میں فرماتے ہیں ... '' :ایسا ہے کہ تمام شرط کی مدت میں اس پر عمل کرنے کی طرف متوجہ رہو اور خود کو اُس پر عمل کرنا لازم سمجھو اور اگر خدا نخواستہ تمھارے دل میں خیال آئے کہ ایسے کے مرتکب ہو رہے ہو جو کہ حکم خداوندی کے خلاف ہے تو جان لو کہ یہ شیطان اور اس کے لشکر کی طرف ہے وہ چاہتے ہیں کہ جو تم نے شرط کی ہے اُس سے روک دیں اُن پر لعنت کرو اور اُن کے شرّ سے خدا کی پناہ مانگو اور باطل خیال کو دل سے نکال دو اور شیطان سے کہو کہ ایک دن میں نے خود سے شرط کی ہے کہ خدا کے حکم کے خلاف نہ کروں لیکن ولیِ نعمت نے سالوں سال سے مجھے نعمت دی ہے، صحت، سلامتی اور امنیت مرحمت فرمائی ہے کہ اور اس نے مجھ پر ایسے لطف کئے ہیں کہ اگر تا ابد اس کی خدمت کروں تب بھی ان میں سے کسی ایک کا حق ادا نہیں کرسکتا ، لہٰذا مناسب نہیں ہے کہ ایک معمولی سی شرط کو بھی وفا نہ کروں... یہ مراقبہ تمہارے کاموں میں بھی جیسے کسب اورکمائی، تعلیم وتعلم اور مسافرت، کسی ایک سے بھی منافات نہیں رکھتا ہے اور اسی حال پر رات تک باقی رہو کہ وہ محاسبہ کا وقت ہے[1]۔

حضرت حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''سزاوار ہے کہ انسان اپنے نفس پر حاکم، قلب کا نگراں اور زبان کا محافظ ہو[2]۔

حضرت امام حسین ۔ نے فرمایا: ''تین چیزیں اگر ہر مومن میں پائی جائیں تو وہ خدا کی پناہ میں ہے... (تیسرے یہ کہ) اپنے نفس سے محاسبہ کرے اور اُس وقت تک اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت نہ دے جب تک یہ نہ جان لے کہ خدا کی راہ میں قدم اٹھایا ہے یا اُس کی نافرمانی کی راہ میں اور یہ کہ اپنے بھائی کے کسی عیب پر ملامت نہ کرے مگر یہ کہ خود اُس کا ترک کرنے والا ہو[3]۔

حضرت امام جعفر صادق ۔ فرماتے ہیں '' :اُس بندہ پر آفرین ہو جو اپنے نفس سے جہاد کے لئے قدم اٹھائے، جو انسان ہوائے نفس کے سپاہیوں کو مغلوب بنا دے اُس نے رضائے خداوندی کا راستہ پا لیا ہے اور جس شخص کی عقل کوشش وتلاش کے ساتھ نفس امارہ پر غلبہ کرے اور خضوع وخاکساری کے ساتھ عقل کی خدمت میں پہنچے تو اس نے عظیم کامیابی حاصل کی ہے، خود نفس اور ہوائے نفس

---

[1] چہل حدیث ،ص۹۰۸۔
[2] غرر الحکم۔
[3] بحار الانوار ،ج۷۸،ص ۱۴۱۔

سے زیادہ تاریک اور وحشتناک خداوند متعال اور بندہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے اور اُس سے مقابلہ کے لئے خدا کی درگاہ میں احتیاج اور اس کے لئے خضوع و خشوع، دن میں بھوکا اور پیاسا رہنے اور تہجد کے علاوہ کوئی تیز تر اسلحہ نہیں ہے، لہٰذا اگر راہ جہاد میں مرگیا تو وہ شہادت کے درجہ پر فائز ہوگا اور اگر زندہ رہ گیا اور ثبات وپائداری کا ثبوت دیا تو نتیجہ میں ''رضوان اکبر'' کے حاصل کرے۔ خداوند عزّوجل فرماتا ہے :(وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ[1])۔ اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے ہم انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقیناً اللہ حسن عمل کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

لہٰذا مراقبہ اعضائے ہفتگانہ کے عمل کرنے کے وقت انسان کا فعالانہ حضور ہے ، عمل سے پہلے فکر و تامل کے ساتھ اپنی نیت اور مقصد کی نسبت توجہ اور مراقبت کرے، عمل کے وقت مراقبت کرے کہیں کہ ایسا نہ ہو کہ اخلاقی اقدار اور الٰہی تعلیمات کے خلاف کوئی عمل اُس سے سرزد ہوجائے اور عمل کے بعد بھی مراقبت کرے کہ اس کے خاص آثار جیسے ریا، مّنت، اذیت وغیرہ اس سے صادر ہوکر عمل کو ضائع نہ کریں یہاں پر اگر اس کی نظر میں کوئی خاص اخلاقی صفت ہو تو وہ مراقبہ کو اسی صفت پر یا اس کے مناسب اعمال پر مرکوز کردے ،اس لحاظ سے اپنے آپ پر نظارت کا اساسی مرحلہ یہی مراقبہ ہے۔

مراقبہ کے سلسلہ میں اہم نکتہ یہ ہے کہ آغاز امر میں اپنے اوپر زیادہ سختی نہیں کرنی چاہئے اور عمل کے جزئیات اور ظرائف کو بھی انجام نہیں دینا چاہئے، یہ رویہ موجب ہوگا کہ اُس کی سختی اُسے اس عظیم جہاد سے روک دے گی،آغاز کار میں اُسے چاہئے کہ صرف اپنے بارے میں حلال و حرام کے سلسلہ میں نفرت کا اظہار کرے یا ایک اخلاقی رذیلت کی نسبت اپنا محاسبہ کرے تاکہ بعد کے مراحل میں خلوص نیت اور اُس سے بالاتر مراقبہ مراتب پر عمل کرے ۔

[1] سورۂعنکبوت، آیت ۶۹۔المحجۃ البیضاء ،ج۸،ص ۱۷۰۔

توجہ رکھنی چاہئے کہ خداوند عالم پر ایمان کی پشت پناہی کے بغیر مراقبہ بہت دشوار اور مشکل ہے، ایک بصیر وناظر کے حضور پر یقین واعتقاد ہی مراقبہ کو آسان کرتا ہے اور یہ بات ایمان کی تربیت سے حاصل ہوتی ہے۔

ج۔ محاسبہ: یعنی کوئی وقت معین کرے (بہتر ہے کہ سونے سے قبل ہو) اور روزانہ کے اعمال کا حساب وکتاب کرے، اگر یہ محاسبہ انجام نہ پائے تو اپنے آپ پر نظارت اور مراقبہ آئندہ ایام میں عملی طور پر ممکن نہیں ہوگا۔

اے صاحبان ایمان! خدا سے ڈرو اور ہر انسان کو غور کرنا چاہئے کہ اپنے کل (آئندہ) کے لئے پہلے سے کیا بھیجا ہے[1]۔

تم لوگ اپنے دل کی باتوں کو ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو، خدا تمہارا ان سب کے سلسلہ میں محاسبہ کرے گا[2]۔

حضرت ابراہیم کے صحیفوں میں اس طرح مذکور ہے: عقلمند انسان جب تک کہ اس پر اس کی عقل حاکم ہے اس کو چاہئے کہ اپنے لئے چار اوقات معین کرے... اور ایک ساعت اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کے لئے معین کردے[3]۔

''اپنے نفس کو محاسبہ کے ذریعہ کنٹرول کرو اور اس (نفس) کی مخالفت کرکے اُس کے مالک ہو جاؤ[4]۔

اپنے نفس کا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے اور خود کو بھاری اور ہلکا کرو قبل اس کے کہ اس کا وزن دیکھیں اور اپنے عمال کو پیش کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ[5]۔

عاقل انسان کے لئے مناسب ہے کہ اپنی برائیوں کا دین، اعتقاد، اخلاق وادب کے اعتبار اپنے نزدیک حساب کرے پھر انھیں سینوں میں یا کسی کاغذ پر محفوظ کرے اور ان کی اصلاح کرے۔

---

[1] سورۂحشر ،آیت۱۲۔
[2] سورۂبقرہ ،آیت۲۸۴۔
[3] بحار الانوار ،ج۷۷، ص۷۱۔
[4] غررالحکم۔
[5] بحار الانوار ،ج۷۰ ،ص۷۳۔

محاسبہ کی ترکیب اس طرح ہے کہ دن کی ابتدا سے شروع کرے اور جو کچھ اُس سے اعمال سرزد ہوئے ہیں ان کی جانچ کرے کہ آیا اخلاقی معیار کے مطابق ہیںیا نہیں؟آیااُن کے اندر خدا کی رضایت اور خوشنودی پائی جاتی ہے...؟

حضرت امیر المومنین علی ـ سے سوال کیا گیا: انسان کس طرح اپنا محاسبہ کرے؟ فرمایا'' :جب صبح کو بیدار ہو تواُس وقت سے عصر تک اپنے نفس کی طرف رجوع کرے اور کہے: اے نفس!آج کا دن ایسا دن تھا جو تم پر گذر گیا اوردوبارہ کبھی واپس نہیں آئے گا اور خدا اُس سے متعلق تم سے بازپرس کرے گا کہ تم نے اس کوکس طرح سے گذارااور اس میں کونسا عمل انجام دیا آیا خدا کی یاد اوراس کے شکرانہ میں مشغول تھے؟آیا اپنے مومن بھائی کا حق ادا کیا؟

آیا اس کی مشکلات کو برطرف کیا؟ آیا اس کی غیبت میں اُس کے اہل وعیال کی سرپرستی کی؟ آیامرنے کے بعد اُس کے ورثاء کی نسبت مہربان رہے ہو؟آیا اپنی موقعیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برادر مومن کی غیبت سے روکا ہے؟آیا کسی مسلمان کی مدد کی ہے؟ اس دن تم نے کیا کیا؟ پھر دل میں سوچے جو کچھ اُس سے سرزد ہوا ہے: اگر نیک اور خیر کام تھے، تو خدا کی حمد وستائش کرے اور اس توفیق پر اس کی تعریف وتمجید کرے ـ اگر گناہ اورکوتاہی اُس سے سرزد ہوئی تو خدا سے طلب مغفرت کرے اوراُسے ترک کرے اور توبہ کرے ـ

اخلاقی تربیت سے متعلق محاسبہ نفس بہت سے آثاراور فوائد کا حامل ہے کہ ان میں سے بعض فوائد اپنے ناپسند صفات و عیوب سے واقف ہونا اور گناہوں سے خالی ہونا اوراصلاح وسعادت کی راہ ہموار ہیں اسی طرح بھولنا نہیں چاہئے ـ

کہ اگرمحاسبہ کچھ سخت معلوم ہو، تواُس پر مجاہدہ (جہاد بالنفس) کے ذریعہ غالب آجانا چاہئےاور اس کےآثار و فوائد کے بارے میں غور کرنا چاہئے پھرکچھ مدت بعد روزانہ اٹوميٹک صورت میں دن بھر یہ محاسبہ اور مراقبہ انجام پائے گا اور رات کے لئے کوئی کام نہیں رہ جائے گا ـ

امام موسیٰ بن جعفر ـ نے فرمایا ہے'' :جو شخص روزانہ اپنا محاسبہ نہ کرے وہ ہم سے نہیں ہے، لھٰذا اگر اُس نے کوئی اچھا اور نیک کام کیا ہے تو خدا سے اس کی زیادتی کی دعا کرے اور اس کی حمد و ستائش کرے اور اگر برا کام کیا ہے تو خدا سے مغفرت طلب کرے اور اس کی بارگاہ میں توبہ کرے[1]۔

د ـ معاقبہ: محاسبہ کے بعد قانون تقویت (فعال ماحول سازی) کے مطابق ان مقامات پر جہاں انجام دیئے گئے اعمال اخلاقی معیار کے مطابق تھے اس کے لئے ایک جزا معین کرے (جیسے مناسب تفریح وگردش، اچھی غذا...) اور اگر اس کے برخلاف ہو تو اُس کے لئے مناسب سزا تجویز کرے، جیسے یہ کہ سب سے پہلے اپنے آپ کو سرزنش اور ملامت کرے اس کے بعد مشقت آمیز اعمال کو برداشت کرے ؛جیسے روزہ رکھے یا خود کو وقتی طور پر بعض لذیذ چیزوں اور عطیوں سے محروم کرے۔

ان موارد میں برے عمل سے مشابہت کا لحاظ کیا جاسکتا ہے؛ مثال کے طورپر حرام غذاؤں سے پرہیز نہ کرنے کے سلسلہ میں، خودکو بھوکا رکھے اور نا محرم کی طرف نگاہ کرنے کے سلسلہ میں بعض پسندیدہ اور محبوب امورکو دیکھنے سے اپنی آنکھ کو (جسے ایک جالب نظر فیلم دیکھنے سے) دور کرے اور اگر زبان سے متعلق ہو تو اُسے سکوت کے ذریعہ سزا دے اور اگر کسی کو رنج پہنچا یا ہو تو اس کے پاس جائے اور اُس سے عذر خواہی کرکے اپنے آپ کو ذلیل وخوار کرے...۔

مجازات معاقبہ پر جو کہ جہاد اکبر ہے ضرور بالضرور عمل کریں ورنہ انسان کے لئے برے اعمال اور اخلاقی رذائل آسان ہو جائیں گے اور وہ اُن سے اس حدتک مانوس ہو جائے گا کہ اس کا ترک کرنا مشکل اور دشوار ہو جائے گا۔

حضرت علی ـ نے فرمایا'' :سب سے بڑا جہاد نفسانی خواہشات سے مقابلہ کرنا اور اسے دنیاوی لذتوں سے بازرکھنا ہے[2]۔

---

[1] بحار الانوار ،ج۷۰ ،ص۷۳۔
[2] غررا لحکم، فصل۱، ص۱۴۲۔

''جان لوکہ جہاد اکبر نفسانی خواہشات سے مقابلہ کرنا ہے لہٰذا اس جہاد میں مشغول رہو تاکہ کامیابی کی سعادت نصیب ہو[1]۔

آخر میں دو باتوں کی یاد دہانی ضروری اور لازم ہے: اوّل یہ کہ اپنے آپ پر نظارت کی بحث میں آداب و رسوم (عرفی عادات) اصول اور افعال اخلاقی کے درمیان فرق رکھنا چاہئے: اول کلیت نہیں رکھتے لہٰذا ان کی ہمیشہ مراعات کرنا ضروری نہیں ہے ؛بر خلاف دوسرے کے۔ دوسرے یہ کہ تقویت ارادہ کی ترکیبوں سے استفادہ کرنا اپنے آپ پر نظارت کرنے کی کامیابی میں بہت زیادہ موثر ہے۔

۱۰۔ ایمان کی تربیتایمان ایک قلبی حالت اور روحی اثر ہے کہ جس کی تاثیر افکار، احساسات اور اعمال میں آشکار ہوتی ہے۔ حضرت امام محمد باقر ـ فرماتے ہیں'' :الایمان ما کان فی القلب والاسلام ما علیہ التناکح والتوارث[2] '' ''ایمان وہ ہے جو دل میں ہوتا ہے اور اسلام وہ ہے جو جس پر تناکح وتوازث ہوتا ہے''۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا'' :الایمان قول مقول وعمل معمول وعرفان العقول[3]'' ''ایمان وہ قول جو بولا جاتا ہے اور وہ عمل ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے اور عقلوں کی معرفت ہے''۔

خداوندمتعال روز قیامت، ملائکہ یا تدبیرعالم کے مامورین پر ایمان رکھنے سے (کہ یہ سب ایمان بالغیب کے مصداق ہیں) انسان کی معرفتی، عاطفی، اور اخلاقی جہات تبدیل ہوجاتی ہیں اور اس نظر جسمانی، کمی اور فائدہ طلب محاسبات کے حدود میں محدود نہیں رہتی ہے، بلکہ اُس کی یہ فکر، یہ نظر اور خدا شناسی اس کی باطنی استعدادوں کی بالیدگی کا سبب بنتی ہے اور اس کے وجود کی وسعت کو کمال مطلق کے امتداد میں محقق بناتی ہے۔ ایک بے کراں اور لامتناہی علیم وقدیر وجود مقدس کے سامنے حضور کا احساس انسان کے اخلاقی کنٹرول اور تربیت میں ایک اہم عامل ہوگا، لہٰذا ایمان کی پرورش انسان کے پورے وجود میں بہت سے قوی وسائل انسان

---

[1] غررا لحکم، فصل ۷، ص۲۲۶۔
[2] میزان الحکمۃ،ج۱ ،ص۳۰۰
[3] میزان الحکمۃ،ج۱ ،ص۳۰۲۔

کے پورے وجود میں (جوکہ وہ اختیار میں رکھتی ہے، اخلاقی تربیت کو آسان بنا دیتی ہے، بلکہ خود انسان کے وجود میں مکارم اخلاق کو پیدا کرتی ہے۔

الیکس کارل انسان کے مذہبی ایمان اور اخلاقی پہلو کے رابطہ کی اس طرح منظر کشی کرتا ہے :اخلاقی اور مذہبی افعال عملی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اخلاقی احساس، عرفانی احساس کے ختم ہونے کے بعد دیر تک باقی نہیں رہتا انسان مذہب سے مستقل اور الگ ایک اخلاقی سسٹم بنانے میں جیسا کہ سقراط نے چاہا تھا کامیاب نہیں ہوا ہے، وہ سماج اور معاشرہ جس نے دعا اور راز ونیاز کو اپنے اندر ترک کردیا ہے عام طور پر فساد اور زوال سے محفوظ نہیں رہے گا ۔ لہٰذا بے ایمان (نام نہاد)متمدن افراد دیندار لوگوں کی طرح فریضہ رکھتے ہیں کہ اپنے باطنی افعال کے رشد کے مسئلہ میں کہ جو ایک انسانی وجود کا لازمہ ہے، دلبستگی پیدا کریں[1]۔

علامہ طباطبائی اخلاقی اسلوب وطریقے کی توضیح میں، تین مسلک کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

پہلا مسلک: دنیوی صالح غایات کی راہ سے تہذیب ہے کہ یہی یونانی فلاسفہ کا عقلی مسلک ہے۔

دوسرا مسلک: اخروی غرض وغایت کے لحاظ سے تہذیب ہے جیسے حور، قصور، بہشت ودوزخ و۔۔۔ کہ اس کے سلسلہ میں قرآنی آیات بہت زیادہ ہیں اور انبیاء کا تربیتی طرز عمل بھی اسی روش پر رہا ہے۔

تیسرا مسلک: یہ قرآن کریم سے مخصوص ہے کہ ایک طرح سے ایمان کی پرورش اور معارف الٰہی سے استفادہ کے ذریعہ اخلاقی رذائل کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکتا ہے... جو عمل بھی انسان انجام دیتا ہے اس کا ہدف اور غایت یا اُس میں عزت کا حصول مطلوب ہے یا وہ

---

[1] نیائش ،ص۲۸۔

قدرت ہے جس سے ڈرتا ہے۔ لیکن خداوند سبحان فرماتا ہے :(اِن العِزّۃَ للّٰہِ جَمِیعاً [1]) تمام عزت اللہ کے لئے ہے اور فرماتا ہے ۔(اِن القُوَّۃَ للّٰہِ جَمِیعاً [2]) تمام قدرت اللہ کے لئے ہے ۔

اگر یہ معرفت اور یقین محقق ہوجائے تو ریا، سمعہ، (دکھاوا)، خدا کے علاوہ سے خوف، خدا کے سوا کسی اور سے امید نہ رکھنے، اس کے علاوہ پر تکیہ کرنے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی، یہ دو جملے جب بھی انسان کو معلوم ہوجائیں (قلبی یقین کی حد میں) تمام اخلاقی ورذیلت کو انسان سے پاک کردیتے ہیں(خواہ صفت) ہو یا فعل اور اس کے مقابل اخلاقی فضائل جیسے تقوائے الٰہی، عزت خدا وندی، عظمت وشوکت ،بے نیازی اور ربانی ہیبت وغیرہ سے آراستہ کردیتے ہیں[3]۔

خداوند ذوا لجلال کی وحدانیت پر ایمان رکھنا انسان کے توحید ی مکتب فکر کو تنظیم کرتا ہے اور اسے انسجام بخشتا ہے، اہداف ومقاصد، افکار، عواطف وجذبات، عادات واطوار،افعال، سارے کے سارے ایک ہدف کے تحقق کے لئے (کہ اللہ کی حاکمیت اور اس کی رضاہے) ہم آہنگ اور متحد ہوجاتے ہیں اور اس وجہ سے دنیوی، شیطانی اور نفسانی خواہشات، اہداف کے اسباب میں اس لئے کہ وہ غیر خدا کوئی اور ہیں تفرقہ اور اختلاف، لڑائی جھگڑے ،کینہ وحسد اور دیگر اخلاقی رذائل ۔

اور خداوند عالم رقیب وعقید فرشتوں پرشکوہ حضور روز قیامت کا یقین اخلاقی مراقبت اورکنٹرول کو انسان کے لئے سہل وآسان بنادیتا ہے اور جس قدر ایمان کی قوت زیادہ ہوگی احساس حضور زیادہ ہوگا اور اخلاقی تربیت آسان تر ہوگی: ''خداوند عالم تم پر ہمیشہ نگہبان ہے[4]۔

[1] سورۂ یونس، آیت۶۵۔
[2] سورۂبقرہ ،آیت۱۶۵۔
[3] المیزان ،ج۱،ص ۳۵۴۔۳۶۰۔
[4] سورۂنساء آیت۱۔

انسان کوئی بات نہیں کرتا، مگر یہ کہ اس کے پاس ایک مراقب وآمادہ (فرشتہ) ہوتا ہے جسے وہ ضبط وثبت کرتا ہے[1]۔

حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''خداوند عالم نے ہر عمل کے لئے ثواب اور ہر چیز کے لئے حساب قرار دیا ہے[2]۔

علمائے اخلاق کے شیوہ میں بالخصوص غزالی کے زمانے سے اب تک یہ روش بہت مورد توجہ رہی ہے اور اخلاقی کتابوں کا قابل توجہ حصہ باواسطہ یا بلاواسطہ اس سے مخصوص رہا ہے اس کے علاوہ چونکہ لوگوں کے اخلاق کوآراستہ کرنااوران کی اصلاح انبیاء کی بعثت کا اصلی وبنیادی ہدف رہا ہے (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق) میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔[رسول خداؐ]) اور انبیاء کی تعلیمات میں اخلاقی پیغامات اور موعظے ان کی سیرت وسلوک کا عظیم باب رہے ہیں لہٰذا پرورش ایمان اور اخلاقی تربیت کے درمیان رابطہ کے اثبات کے سلسلہ میں تفصیل ضروری نہیں ہے۔ درج ذیل احادیث مطلب کی وضاحت کے لئے کافی ہیں :

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان حرام امور سے دوری اور دنیوی خواہشات سے پاکیزگی کا سبب ہے[3]۔

''ایمان حلم وبردباری اور جودو بخشش کے سوا کچھ نہیں[4]۔

حضرت علی ۔ نے فرمایا: ''ایمان ایک ایسا درخت ہے جس کی جڑ وبنیاد یقین، شاخ تقویٰ، کلیاں شرم وحیا، اور اس کا ثمر سخاوت ہے'' (غرر الحکم) ''سچائی ایمان کے لئے سر کے مانند ہے''۔ (غرر الحکم)

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں ''مومن کی شادمانی اُس کے چہرہ پر اور غم و اندوہ اس کے دل کے اندر ہوتا ہے، وہ کشادہ سینہ اور خاکسار وخاضع نفس کا مالک ہوتا ہے، فوقیت طلبی کو ناپسند کرتا ہے... اس کا سکوت طولانی ہوتا ہے، اُس کے اوقات مشغول ہوتے ہیں، وہ شاکر اور صابر ہوتاہے[5]۔

---

[1] سورۂق،آیت ۱۸۔
[2] غرر الحکم۔
[3] کنز العمال ،ح۵۸۔
[4] بحار الانوار ،ج۶۹،ص ۴۱۱۔
[5] بحار الانوار ،ج۷۱،ص ۳۸۷۔

پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ''تم میں ایمان کے لحاظ سے کاملترین انسان وہ ہے جو سب سے اچھا اخلاق رکھتا ہو''۔

ویکٹور فرانکل ماہر نفسیات اور علاج معنوی مکتب کا حامل مذہبی ایمان کو جیلوں کے اندر افراد کے اخلاقی اقدار کے تحفظ کے لئے اہم ترین وسیلہ شمار کرتا ہے، آغاز میں جیلوں کے متعلق اس طرح بیان کرتا ہے :

... ''ایک دن ایک پولیس جو کہ ہمارے جیلوں میں کام کررہا تھا اس نے مجھ سے کہا: چھاؤنی میں انسان مردار کا ایک ٹکڑا گوشت کو تلاش کررہا ہے ، آخرکار اُسے آگ پر چڑھے ایک برتن میں پایا... ہمارے جیل چھاؤنی آدم خوری سے بھری ہوئی تھی[1] ہم نے تو اسیروں کے جیل میں زندگی گذار دی ہے ، اس وقت ہم ایسے لوگوں کو یاد کرتے ہیں جوکمرہ کمرہ میں جاتے اور دیگر قیدیوں کی دلداری کرتے حتی کہ روٹی کا آخری ٹکڑا بھی انھیں بخش دیتے تھے[2]۔

انسان کبھی اخلاقی رفتار کی سمت کھینچ کر لے جایا نہیں جاتا بلکہ فیصلہ کرتا ہے کہ اخلاقی رفتار رکھے، وہ اس کام کو میلان کی تکمیل یا وجدان کی آسودگی کے لئے انجام نہیں دیتا ہے، بلکہ اس دلیل اور علت کی وجہ سے کہ جس کا پابند ہے اُس انسان کے لئے جسے دوست رکھتا ہے یا اپنے خدا کے لئے انجام دیتا ہے... ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تمام مقدس افراد کا مقصد اپنے خدا کی خدمت کے سوا کچھ نہیں تھا اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ ان کا اصلی و بنیادی ہدف مقدس ہونا تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ مکتب کمال کو انتخاب کرتے[3]۔

اُس نے نیچہ کے جملہ سے استناد کیا کہ اس نے کہا تھا ''جس انسان نے زندگی کی کیوں علت دریافت کرلیا ہے وہ ہر کیفیت کے ساتھ نبھالے گا'' فرانکل کہتا ہے: جرمن نازیوں کے جیل میں یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی ہے کہ وہ تمام وہ لوگ جو خیال کرتے تھے کہ ان کو

---

[1] انسان درجستجو ی معنا ، ص۶۲۔
[2] انسان درجستجو ی معنا ، ص۴۷۔
[3] انسان درجستجو ی معنا ، ص ۱۴۵و۱۴۶۔

کام اور ذمہ داری انجام دینا ہے (اس معنی کے مقابل جس کا وہ اعتقاد رکھتے تھے) انھوں نے زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کا چانس رکھا (بعد میں یہ بات کوریا اور جاپان میں امریکی ماہرین کے ذریعہ ثابت ہوگئی ہے[1]) ۔

امریکا کا عظیم ماہر نفسیات ویلیام جیمز بھی دینی ایمان کے اخلاقی پہلو کی امر سون نامی انسان کے قول کو نقل کرتے ہوئے اس طرح تصویر کشی کرتا ہے ... :آدمی کی روح میں ایک عدالت پائی جاتی ہے کہ جس کی سزا اور جزا قطعی اور یقینی ہے جو شخص آلودگی اور برائی کو اپنے سے دورے کرے تو اس نے پاکی اور خوبی کو حاصل کرلیا ہے

اور جو انسان پہلے ہی سے قلبی اعتبار سے اچھا انسان ہو اس کے دل میں خداوند عالم جگہ رکھتا ہے، اس عدالت اور اچھائی دوستی کے ساتھ جو یہ شخص اپنے دل میں رکھتا ہے، خداوند ازلی وابدی، خدائے عظیم کو اپنے دل میں رکھتا ہے۔ اگر کوئی دھوکہ دے اور مکر سے کام لے گویا اُس نے خود کو دھوکا دیا اور اپنی معرفت بھی نہیں رکھتا ہے،

ہر انسان کا باطن بخوبی پہچان لیا جاتا ہے، چور کبھی مالدار نہیں ہوتا اور جوانسان فقرا کی مدد کرتا وہ کبھی محتاج نہیں ہوتا ہے۔ پتھریلی دیوار کی پشت سے بھی قتل آواز دیتا ہے یعنی قتل کو چھپایا نہیں جا سکتا ۔

جھوٹ اور ملاوٹ کا ادنیٰ ذرہ بھی اگر کسی چیز میں ہو، مثال کے طور پر خود خواہی کا شائبہ، وسوسہ، تظاہر، ریاتو تمہارے کام کے نتیجہ کو فاسد کردے گا لیکن اگر صداقت اور راستگوئی سے کام لوگے تو ساری چیزیں اور ہر کوئی جاندار ہو یا بے جان تمہاری صداقت کا گواہ ہوگا...

عشق، عدالت، محبت، خوش خلقی اور صبر سبھی کا سر چشمہ ایک ہی ہے،

---

[1] انسان درجستجو ی معنا ،ص۱۵۵۔۱

لہذا جتنا آدمی ان ''مقاصد'' سے دور ہوگا، قدرت ونفرت کے سرچشمہ سے بھی ممکن ہے کہ اس سے فیضیاب ہو، دور ہوجائے گا نتیجہ کے طور پر اس کا وجود بے پناہ اور متزلزل ہوکر تدریجاً کمزوراور معمولی ہوکر ذرہ اور نقطہ میں تبدیل ہوکر نہایت برائی اور پستی کے ساتھ وجہ موت اور نابودی کے گڑھے میں گر جائے گا۔

اس قانون کا فہم وادراک آدمی میں ایسی فکر واحساس پیدا کرتا ہے کہ ہم اُسے احساس مذہبی کے نام سے یاد کرتے ہیں ایک عجیب وغریب قوت کہ خود جذب بھی کرتی ہے اور شاد و مسرور بھی کرتی ہے۔ پہاڑوں سے چل کر جو عطر نسیم عالم کو معطر بنا دیتی ہے وہ اسی کی ذات سے ہے، آسمانوں اور بلند وبالاپہاڑوں کو عظمت وجلالت وہی عطا کر تا ہے، ستاروں کے سکوت آمیز آواز اُسی کی دین ہے، تمام خوبصورتیاں اور خوبیاں اسی کی ذات سے ہیں، وہ ہے کہ آدمی کو ابدی بنادیتا ہے۔

جب انسان کہتا ہے: ''میرا فریضہ وفریضہ ہے'' جب عشق ومحبت اسے حکم دیتی ہے، جب عالم بالا سے الہام نیک اور عظیم کام کا انتخاب کرتا ہے، ایسے موقع پراس کی روح عالمِ عقل کے عالم گیر نغموں سے سرشار ہوجاتی ہے... (ویلیام جیمز، ص۸،۷) درحقیقت انسان کا خدا پر ایمان، غیرا ارادی طور پر ضمیر میں وارد ہونے سے (گوستاویونگ) کہ غیر ارادی ضمیری چیزوں کو ناخود آگاہ ضمیر کا مفہوم روح، خدا اور غیبی قوتوں پر مشتمل جانتا ہے[1]۔

اس کے بہت سے دیگر افکار ونظریات پر براہ راست نہایت تاثیر رکھتا ہے جیسے اُس کا زندگی اور زندگی ہدف کے بارےنظریہ۔ اور یہ نظریات خود اپنی جگہ پر خوب وبد، درست ونادرست کے بارے میں انسان کے افکار کو تشکیل دیتے ہیں، یہاں تک کہ آخرکار انفرادی، اجتماعی اور اخلاقی عمل اور انفرادی مناسبتیں بھی اوّلی اور اساسی افکار ونظریات سے تاثیر قبول کرتی ہیں۔

انسان کے غیر ارادی طور پر وارد ہونے کے طریقے، چار اساسی راہ کے حامل ہیں کہ آخری کے علاوہ سبھی طبیعی ہیں :

---

[1] رواشناسی ضمیر خود آگاہ ،ص۹۲۔

۱۔ عہد طفولیت میں منصوبہ بنانا۔

۲۔ مثبت یا منفی شدید ہیجانات کے وقت ہوشیاری کے وقت نفس کی تلقین: اس طرح سے کہ اچھے اور مثبت جملات اور مفاہیم کی مناسب وقت میں آہستہ آہستہ توجہ کے ساتھ بلند آواز سے تکرار کرے۔

۴۔ ہپناٹزم کی روش۔

وہ دینی تعلیمات اور دستورات کہ جو ایمان کی تربیت کے لئے مد نظر قرار دئے گئے ہیں، اوّل تین راستوں سے افراد معاشرہ کی ہدایت اور سماج کے اخلاقی اصلاح کے عنوان سے بہترین استفادہ کیا ہے۔ ایمان کی پرورش کے وہ اسلوب جو دینی معارف کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

الف۔ عبادت: عبودیت تذلل اور خاکساری کے اظہار کے معنی ہے کہ جو فارسی میں ''بندگی'' کے معنی میں ہے اور عبادت اس سے بھی بالاتر چیز ہے، یعنی انتہائی درجہ تذلل، اسی وجہ سے خدا کے علاوہ کوئی اس کا مستحق نہیں ہے۔ (المفردات) اس بنا پر مختلف عبادی اعمال، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ اسی تذلل وبندگی کا اعلان ہے۔

سید قطب اس مطلب کی اچھی طرح منظر کشی کرتے ہیں :نماز، روزہ، زکات،حج اور تمام تعبدی شعائر واعمال ایک کنجی کے سوا کچھ نہیں ہیں، وہ صرف ایسی کنجیاں ہیں جن کے ذریعہ اپنے لئے عبادت کے دروازوں کو کھول سکیں، یا ایسے منازل اور قیامگاہ ہیں کہ طریق عبادت کے راہی اور منزل معبود کے سالکیں راستہ میں اُس قیام گاہ میں کچھ دیر قیام کرکے توشۂ راہ حاصل کرتے ہیں، تازہ دم ہوتے ہیں پھر کافی زادۂ راہ کے ساتھ اپنی راہ طے کرتے ہوئے معشوق کی منزل کی طرف چل پڑتے ہیں، یہ راہ وہی عبادت ہے لہٰذا جو کچھ اس راہ میں واقع ہو، عبادت سے لے کر روز مرہ کی زندگی کے امور یا غور وخوض اور ادراک تک جب تک کہ ہدف خدا ہو، وہ سب کا سب عبادت ہے۔

یہ اساس اور بنیاد اُس وقت زیادہ مضبوط ہوجاتی ہے جب حقیقت اور عملی اعتبار سے (نہ کہ صرف زبان) سے گواہی دے کہ کوئی بھی مقام اور شخصیت نیز مظہر قدرت عبادت کے قابل نہیں ہسوائے اس خداوند واحد و خالق کے کہ جو حکیم و علیم ہے[1]۔

اس طرح کی عبادت انسان کی زندگی کے تمام شعبوں میں سرایت کرکے ایمان کی پرورش کا باعث ہے اور اس کا نتیجہ وثمرہ اخلاقی تربیت اور انسانی فضائل ہیں۔

''اے لوگو!تم سب اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے والوں کو خلق کیا ہے، لہٰذا اس کی عبادت کرو، شاید تقویٰ اختیار کرو[2]''۔

،روزانہ کی عبادتوں کی راہ میں، جیسے روزانہ کی نمازیں اور موسمی عبادتیں جیسے روزہ،حج اور اعتکاف نفسیات کے مختلف فنون سے استفادہ کرکے (جیسے اپنے آپ کو تلقین کرنے، عادت دینے اور عمل کرنے، شرطی سازی وغیرہ کے ذریعہ) خدا کی بندگی اور پرستش کی اس حالت کو اپنے اندر ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اپنے ناخودآگاہ ضمیر میں جاگزین کرسکتا ہے۔

لہٰذا عبادت میں جتنا اخلاص زیادہ ہوگا اور عمل جتنا ہی صاف وشفاف اور خالص ہوتا ہوگا اتنا ہی انسان تیزی کے ساتھ اس مقصد تک پہنچ جائے گا۔ لیکن عبادت کے نچلے مراتب بھی اس ہدف تک رسائی کے لئے مقدمہ کے عنوان سے کار ساز ہیں۔

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''عبادت کی تین قسمیں ہیں: ''کچھ لوگ خدا کے خوف سے عبادت کرتے ہیں، یہ غلاموں کی عبادت ہے کچھ لوگ ثواب خداوندی کے حصول کے لئے عبادت کرتے ہیں، یہ مزدوروں کی عبادت ہے، کچھ لوگ خدا سے عشق و محبت کی بنا پر

---

[1] روش تربیتی در اسلام،ص٣٩۔
[2] سورۂبقرہ ،آیت ٢١۔

عبادت کرتے ہیں، یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے اور یہی عبادت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے[۱]'' ''سب سے افضل عبادت عمل کو خدا کے لئے خالص کرنا ہے[۲]''۔

عبادت کی تاثیر میں اہم نکتہ یہ ہے کہ رغبت ودلچسپی کی بنیاد پر ہو، نہ کہ کراہت اور سستی کی بنیاد پر ہو۔ اسی لئے پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا ہے'' :اُس بندہ پر آفرین ہو جو عبادت سے عشق کرتا ہے، جسم سے عبادت کرتا ہے اور قلب سے اُسے دوست رکھتا ہے اور خود کو اُس کے لئے فارغ کرتا ہے''۔

جو لذت و شیرینی عبادت میں ہے وہ اس کے استمرار اور اُسے قوت پہنچانے کا باعث ہوتی ہے، لیکن اس لذت کا احساس دو شرط پر مبنی ہے :

۱۔ہوا پرستی (نفسانی خواہشات) سے دوری ۔ ۲۔ حب دنیا سے اجتناب۔

حضرت علی ۔نے فرمایا'' :جو نفسانی خواہشات سے اجتناب نہیں کرتا وہ کس طرح عبادت کی لذت محسوس کرتا ہے''؟(غرر الحکم) ''جس طرح کوئی ایسا بیمار کہ جو شدید درد کا احساس کرتا ہے، اچھی غذا کی لذت محسوس نہیں کرتا، دنیا پرست بھی دنیا سے لگاؤ کی بنا پر عبادت کی لذت محسوس نہیں کرتا اور اس کی حلاوت و شیرینی کو درک نہیں کرتا[۳]''۔

ایک دوسرا نکتہ جو عبادت میں قابل توجہ ہے، یہ ہے کہ عبادت کا ہدف خداوند عالم کے سامنے صرف اطاعت ہے اور ''تعبد''کے معنی بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر باوجودیکہ ہم نہیں جانتے کہ نماز صبح دو رکعت کیوں ہے اور بلند آواز سے ہمیں پڑھنا چاہئے، تو ہم صرف اُس کے فرمان کی اطاعت کرتے ہوئے انجام دیتے ہیں۔

---

[۱] بحارالانوار ،ج۷۰ ،ص ۲۵۵۔
[۲] غرر الحکم۔
[۳] بحارالانوار ،ج۱۴ ،ص۳۱۰۔

فضل بن شاذان حضرت امام علی رضا ـ سے نقل کرتے ہیں: ''اس لئے کہ اُسے فراموشی کے حوالے نہ کردیں، اس کے مراتب ادب کو ترک نہ کریں، اس کے امر ونہی سے غافل نہ ہو جائیں[1]''۔

اسی وجہ سے (فرمان خدا کی اطاعت) اللہ کے حدود حلال وحرام کی رعایت اور خدا کے فرائض اور واجبات کی مراعات کرنا عبادت کا اہم حصہ شمار ہوتا ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں: عبادت کے دس جز ہیں کہ اس کے نو جز حلال کے سراغ میں جانا ہے[2]۔

خداوند سبحان ارشاد فرماتا ہے: ''اے اولاد آدم! جو کچھ ہم نے تم پر واجب کیا ہے اُس پر عمل کرو تاکہ لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار بن جاؤ''۔

ب۔ذکر: ذکر ''یاد آوری'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی طرح کسی چیز کے معنی کا یاد رکھنا یا اُس کا حاضر ہونا ذکر کہلاتا ہے۔ دقیق تر تعبیر میں کبھی ذکر سے مراد ایک نفسانی حالت ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان اُس چیز کو جس کی اس سے پہلے شناخت اور معرفت یاد رکھ سکتا ہو۔ ذکر اس معنی میں حفظ کے مانند ہے اس فرق کے ساتھ کہ ذکر اس جگہ استعمال ہوتا ہے کہ کوئی بات حافظہ کے خزانہ میں موجود ہونے کے علاوہ اس کی نظر میں بھی حاضر ہو، کبھی سے مراد دل وزبان پر کسی مطلب کا حاضر ہونا ہے اور اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ذکر کی دو قسم ہے قلبی اور لسانی[3]۔

اس بنا بر ایمان کی تربیت کا ایک دوسرا شیوہ ذکر ہے کہ جو خدا کے قطعی اور یقینی حضور کی انسان کے نزدیک تقویت کرتا ہے۔

زبانی اذکار جو اسلامی تعلیمات میں وارد ہوئے ہیں اس لئے ہیں کہ وہی حضور قلبی کی حالت انسان میں ایجاد کریں ہے۔ البتہ اذکار کی تربیتی تاثیر سے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے ؛کیونکہ معین باتوں کو زبان پر لانا تلقین نفس سے استفادہ کے ساتھ ساتھ اُس کے مقتضیٰ سے

---

[1] علل الشرائع ،ص۲۵۶۔
[2] بحار الانوار ،ج۱۰۳ ،ص۱۸۔
[3] (مفردات)

انسان کے ضمیر میں ایک تبدیلی ایجاد کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے غیر ہوشیار ضمیر کی راہ ورود کے سلسلے میں ذکر کیا ہے، یہ شیوہ اسلامی تعلیمات میں بہت زیادہ مورد توجہ واقع ہوا ہے اور ہماری پوری زندگی خواب وبیداری، کام اور راحت، خوشی اور غم سب کے وقت خدا پرستانہ اذکار اور تلقینات سے بھری پڑی ہے جو ہم میں اثر انداز ہوتے ہیں۔

یومیہ نمازیں (نافلہ اور فریضہ) ان کے مقدمات اور تعقیبات مخصوص اذکار کے ساتھ، کاموں کا آغاز ''بسم اللہ'' سے اور ہر کام کا خاتمہ ''الحمد للہ'' سے اور دیگر اذکار کہ جو گھر سے نکلتے وقت، کام کی جگہ میں داخل ہوتے وقت، مسجد میں وارد ہونے کے وقت... یہ ساری تلقینیں پوشیدہ اور آشکار اذکار کی صورت میں صاف وشفاف اور زلال بارش کے مانند مومنین کے قلب وروح کو بارآور کرکے ایمان وفضلیت کے ثمرات اُن کے اختیار میں قرار دیتے ہیں۔

ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ زبان کے اذکار قلب کو زیادہ سے آمادہ کرتے ہیں، امام خمینیؒ اپنے استاد کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہمارے عارف کامل شیخ (استاد) جناب شاہ آبادی (روحی فداہ) فرماتے تھے: ذاکر انسان ذکر میں اُس انسان کے مانند ہے جو چھوٹے بچے کو کہ جس نے ابھی ڈھنگ سے بولنا نہیں سیکھا ہے اُسے اگر کوئی کلمہ یاد کراتا ہے تو اُس کی تکرار کرتا ہے تاکہ اُس کی زبان کھل جائے اور کلمہ کو ادا کرے اور جب وہ کلمہ ادا کردیتا ہے تو معلم بچہ کا اتباع کرتا ہے اور اس تکرار کی تھکن ختم ہو جاتی ہے گویا کہ اُسے بچہ سے مدد ملتی ہے، یہی صورت ہے اس کی جو ذکر کرتا ہے اُسے چاہئے کہ اپنے دل کو کہ جس نے زبان ذکر نہیں کھولی ہے ذکر کی تعلیم دے اور ان اذکار کی تکرار میں نکتہ یہ ہے کہ زبان دل کھل جائے اور زبان قلب کے کھلنے کی علامت یہ ہے کہ زبان، دل کی تبعیت کرتی ہے اور تکرار کی زحمت اور تھکن بر طرف ہو جاتی ہے[1]۔

پس اے عزیز! ذکر و یاد محبوب کے راستہ میں تونے جتنی زحمتیں برداشت کی ہیں کم ہیں، دل کو یاد محبوب کی عادت دے، بلکہ خدا کی خواہش اور مرضی سے قلب کی صورت ذکر حق کی صورت ہوجائے اور کلمۂ ''لاالٰہ الا اللہ'' کمال نفس کی انتہا ہوجائے کہ اس سے

[1] چہل حدیث، ص ۲۵۰۔

بہتر سلوک الیٰ اللہ کے لئے کوئی زادہ راہ اور نفس کے معایب (عیوب) کے لئے سب سے اچھا مصلح اور معارف الٰہیہ میں بہترین رہبر نہیں ملے گا، لہٰذا اگر صوری اور معنوی کمال کے طالب ہو اور طریق آخرت کے سالک، مسافر و مہاجر الی اللہ ہو تو قلب کو محبوب کے ذکر کی عادت دو اور دل کو یاد حق تبارک وتعالیٰ سے عجین کردو (گوندھ دو[1]) خداوند سبحان کی یاد انسان کو غفلت اور نسیان سے نکال دیتی ہے اور اخلاقی تربیت کی راہ ہموار کرتی ہے، کیونکہ اخلاقی انحراف اور برے افعال کے اسباب وعلل غفلت اور نسیان ہیں '' :اس انسان کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور اس نے اپنی ہوا وہوس کی پیروی کی ہے اور اس کے کام کی بنیاد زیادہ روی پر ہے[2]''۔

''در حقیقت جو لوگ صاحبان تقویٰ ہیں، جب شیطان کی جانب سے انھیں وسوسہ ہوتا ہے تو [خدا کو] یاد کرتے ہیں اور حقائق کو دیکھنے لگتے ہیں[3]''۔

حضرت علی ۔ فرماتے ہیں: ''خداوند سبحان نے اپنی یاد کو دلوں کے لئے روشنی قرار دیا ہے، قلوب اس وسیلہ سے بہرے پن کے بعد سننے والے، نابینائی کے بعد بینا اور سرکشی و طغیانی کے بعد مطیع وفرمانبردار ہوجاتے ہیں[4]''۔

آیات وروایات میں ذکر کثرت ومداومت کی تاکید کی گئی ہے: ''اے صاحبان ایمان! خدا کو بہت زیادہ کرو[5]'' ذکر الٰہی کی مداومت قلب کی اصلاح اور اخلاقی فضائل سے کہ جو بالیدگی وحیات نو کا سبب ہے: ''جو انسان اپنے دل کو ذکر کی مداومت سے آباد کرے تو اس کا کردار ظاہر وباطن دونوں صورتوں میں نیک ہوجائے گا[6]''۔

''قلب کی اصلاح کی بنیاد، انسان کا ذکر خداوندی میں مشغول ہونا ہے[1]''۔

---

[1] چہل حدیث، ص۲۵۰۔
[2] سورۂکہف ،آیت۲۸۔
[3] سورۂاعراف ،آیت۲۰۱۔
[4] نہج البلاغہ ،خطبہ ۲۲۲۔
[5] سورۂ احزاب ،آیت۴۱۔المیزان ،ج۱ ،ص۳۴۰۔
[6] غرر الحکم۔

ذکر کی روش میں ذکر خداوندی کے علاوہ خدا کی نعمتوں کا یاد کرنا بھی منعم [نعمت دینے والے] کے احترام کے عنوان سے انسان کو خداوند عالم کی بے نظیر اور لاثانی ذات کے سامنے سراپا تسلیم ہونے اور اس کی تعظیم کرنے پر آمادہ کرتا ہے، بالخصوص جس قدر نعمت عظیم اور اس کا منعم بے غرض ہوگا، اس کا احترام فطرت کی نظر میں اتنا ہی زیادہ لازم ہوگا: ''اے لوگو! اپنے اوپر خداوند سبحان کی نعمت کو یاد کرو، آیا خدا کے علاوہ کوئی خالق ہے کہ تمہیں زمین وآسمان سے رزق دے[۲]''۔

چونکہ قرآن کریم خود کو ذکر اور حامل ذکر کے عنوان سے تعارف کراتا ہےلہٰذا تلاوت قرآن بھی ذکر کی حالت انسان کے اندر پیدا کیااور ایمان کی پرورش کا باعث ہوتی ہے: (اِن ہُوَ الاّ ذِکْرٌ لِلعالَمِینَ[۳]) ''یہ عالمین کے لئے صرف ذکر (نصیحت) کا سامان ہے''۔

(ص، والقرآن ذی الذکر[۴]) ''ص ذکر (نصیحت) والے قرآن کی قسم''۔

(وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْہِم آیاتہِ زَادَتْہُمْ اِیمَاناً[۵]) ''اور جب ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے''۔

ذکر کی بحث میں آخری نکتہ ''موت کی یاد'' سے متعلق ہے، اس بات کی طرف توجہ دیتے ہوئے کہ آخرت پر ایمان رکھنا اخلاقی تربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے، موت کا تذکرہ اور اس کا [ذہن میں] حضور ایمان کی پرورش اور اخلاقی آثار کے مجسم ہونے کا باعث ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ موت کی یاد، دنیا کی دوستی اور محبت کو ختم کرنے میں جوکہ بہت سے اخلاقی رذائل کا سرچشمہ ہے،

اہم کردار اداکرتی ہے: (کلّ نفس ذائقۃ الموت، وانّما توفون اجورکم یوم القیامۃ فمن زحزح عن النار وادخل الجنۃ فقد فاز وما الحیاۃ الدنیا الاّ متاع الغرور[۱])

---

[۱] غرر الحکم۔
[۲] سورۂفاطر ،آیت
[۳] سورۂتکویر ،آیت۲۷۔
[۴] سورۂص،آیت۱۔
[۵] سورۂانفال،آیت

''ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور تمھارا مکمل بدلہ تو صرف قیامت کے دن ملے گا اس وقت جسے جہنم سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا وہ کامیاب ہے اور زندگانی دنیا تو صرف دھوکہ کا سرمایہ ہے''[1]۔ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات میں بھی موت کی یاد کا تربیتی اثر ملتا ہے'' :جو شخص [مرنے کے بعد] سفر کی دوری کو یاد کرے گا وہ آمادہ سفر ہوجائے گا[2]''۔

''جو انسان موت کی آمد کا انتظار کرے گا وہ نیک کاموں میں جلدی کرے گا''۔

موت کی یاد نفسانی خواہشات اور شہوات کو مار دیتی ہے، غفلت کی جڑوں کو اکھاڑ دیتی ہے، دل کو خداوند سبحان کے وعدوں سے قوی اور مضبوط بنا دیتی ہے، انسان کے وجود کو لطیف و نرم کرتی ہے اور ہوا و ہوس کی نشانیوں کو درہم و برہم کردیتی ہے اور حرص و طمع کی آگ کو خاموش کردیتی ہے اور دنیا کوانسان کی نظر میں بے وقعت اور ذلیل و خوار کردیتی ہے[3]۔

راہ آخرت کے سالکین نے اپنے شاگردوں کو ہمیشہ قبرستان میں جانے کی تاکید کی ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک بار جائیں اور اہل قبور کی زیارت کریں اور موت کی یاد سے اپنے آپ کو تقویت کریں[4]۔

ج۔دعا : دعا در اصل عالم کے غیر مادی مرکز کی جانب روح کی کشش کا نام ہے عام طور سے عام طور سے دعا سے مراد تضرع وزاری، اضطراب اور نالہ وشیون، استعانت اور مدد طلبی ۔ اور کبھی ایک روشن کشف و شہود کی حالت جو تمام محسوسات کی دنیا سے دور مستمر اور باطنی آرام ہے۔ بعبارت دیگر کہا جاسکتا ہے کہ دعاخدا کی سمت پروازِ روح کا نام ہے یا عاشقانہ پرستش کی حالت ہے اس مبدأ کی نسبت جس سے معجزہ حیات صادر ہوا ہے اور بالآخر دعاانسان کی کوشش ہے اس نامرئی اور ناقابل دید وجود سے ارتباط کے لئے جو تمام ہستی کا خالق، عقل کل، قدرت مطلق اور خیر مطلق ہے۔

---

[1] سورۂآل عمران ,آیت۱۸۵۔
[2] غرر الحکم
[3] المحجۃ البیضا ,ج۸,ص ۲۴۲۔
[4] ہم بالخصوص ملا حسین قلی ہمدانی ، بہاری ہمدانی اور میرزا جواد انصاری ہمدانی کی وصیتوں میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

خاص اوراد کے نقل سے صرف نظر کرتے ہوئے، حقیقت دعا سوز و گداز سے بھری ایک عرفانی حالت کو مجسم کرتی کہ دل اس میں خدا سے جذب ہو جاتا ہے[1]۔

راز و نیاز ،دعا و مناجات بھی پرورش ایمان کا ایک طریقہ ہے۔ دعا احتیاج کا اظہار ہے بلکہ دعا یہ ہے کہ انسان یکسر احتیاج بن جائے ۔دعا اشتیاق کا اظہار ہے ،بلکہ انسان کی تمام احتیاج یہی شوق و اشتیاق ہے۔ دعا سنوارنے اور تربیت دینے کا ایک عامل ہے کہ نہ صرف انسان کو اس کی کمیوں سے متعلق ہوشیار کرتی ہے بلکہ اس کی تمام کوششوں اور توانائیوں کو اس کے مطلوب کے حصول کی خاطر صرف کر دیتی ہے۔

جب کوئی بیمار درد و سوز سے پیچ و تاب کھاتا ہے اور ڈاکٹر سے مدد مانگتا ہے خود ہی ابتدائی کاموں کو انجام دیتا ہے تاکہ معالجہ کی راہ ہموار ہو جائے پس یہی بات ہے کہ دعا اور طلب اپنے حقیقی معنی کو پالیتی ہے اور نتیجہ کے طور پر اجابت اور قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے :(وَاِذَا سَ‌ءلَکَ عِبَادِیُ عَنِّی فَاِنِّی قَرِیُبٌ، اُجِیُبُ دَعُوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلُیَسُتَجِیُبُوا لِی وَلُیُؤمِنُوا بِیُ لَعَلَّھُم یَرُشُدُونَ[2])

''اور اے پیغمبر! اگر میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں ان سے قریب ہوں، پکارنے والے کی آواز سنتا ہوں جب بھی پکارتا ہے لہٰذا مجھ سے طلب کرو قبولیت کریں اور مجھ ہی ایمان و اعتماد رکھیں کہ شاید اس طرح راہِ راست پر آجائیں''۔ابھی دعا کے عینی آثار [حاجتوں کی برآوری اور قبولیت و اجابت] مورد نظر نہیں ہیں، بلکہ ان کے علاوہ دعا و مناجات ہے، معبود سے باتیں کرنا اور راز و نیاز کا اظہار کرنا ہے،

---

[1] الکسین کارل: نیایش، ص ۵۱۔
[2] سورۂبقرہ،آیت ۱۸۶۔

اس وجہ سے محبوب کے حضور کو دعا کرنے والے کے دل وجان میں تقویت کرتی ہے، کیونکہ دعا ومناجات حاضر مخاطب سے بات کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے، اسی وجہ سے کہ دعا عارفوں کے روح کی غذااور مومنین کے لئے خالص شراب ہے۔ خداوند سجان نے اپنی توجہ وعنایت کو دعا وعبادت میں قراردیا ہے: ''کہو: اگر تمہاری دعا نہ ہو تو تمہارا رب تمہاری کوئی اعتنا نہیں کرتا[1]''۔

حضرت علی ـ فرماتے ہیں: ''دعا [مراد تک]پہنچنے کا خزانہ اور کامیابی کا چراغ ہے[2]۔''خداوند رحیم وکریم نے کشائش، اور آسمانوں کے فتح باب اور معلومات[فضائل ومکارم اخلاق]کے راستہ کو اپنی بارگاہ میں درخواست اور دعا کرنا قرار دیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق ـ فرماتے ہیں: زیادہ سے زیادہ دعا کرو کیونکہ وہ رحمت رحمت اور حاجت پوری ہونے کا ذریعہ ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ صرف دعا کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہو[3]۔

استجابت وقبولیت دعا کے شرائط میں حضور قلب اور رقت کی شرط کی گئی ہے، کیونکہ جو چیز سوز ونیاز کے ساتھ ہوتی ہے وہ حقیقت میں ارزش وقیمت رکھتی ہے اور ایک حقیقت کو اپنے اندر پروان چڑھاتی ہے: جان لو کہ خداوند سجان دعا کو غافل اور بے خبر دل سے قبول نہیں کرتا[4]۔ ''دعا کو رقت قلب کے وقت غنیمت سمجھو اس لئے کہ وہ نزولِ رحمت کی نشانی ہے[5]''۔

ائمہ معصومین ۲۲۲ کی دعاؤں اور مناجاتوں میں ایسے عارفانہ مضامین ہیں کہ ائمہ معصومین ۲۲۲ نے محبوب ازلی کے ساتھ اپنی خلوتوں میں ان کو انشأ فرمایا ہے اورراز ونیاز کیا ہے۔ ان دعاؤں کے بعض فقرات کو حفظ کرکے اور مناسب مواقع پر ان کی تکرار کرکے تربیتی مکتب میں طرز دعا کو ہم سیکھ سکتے ہیں۔

---

[1] سورۂفرقان ،آیت ۷۷۔
[2] بحار الانوار ،ج۹۳،ص۳۴۱۔
[3] بحار الانوار ،ج۹۳،ص۲۹۵۔
[4] بحار الانوار ،ج۷۷،ص۱۷۳۔
[5] بحار الانوار ،ج۹۳،ص۳۱۳۔

البتہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ راز ونیاز، دعا ومناجات سوز دل کے ساتھ ہونی چاہئے اور دل کی گہرائی سے نکلنی چاہئے، اس لحاظ سے ہمیں سعی وکوشش کرنی چاہئے کہ اپنی زبان سے بھی دلوں کے محبوب سے راز ونیاز کریں اور اس سے شفیق و مہربان دوست اور اپنی خلوتوں کا مونس وغمخوار جانیں: ''یارَفِیقَ مَن لاَ رَفِیقَ لَہ،یا اَنِیسَ مَن لاَ اَنِیسَ لَہ۔ ''اے اس کا رفیق جوکوئی رفیق نہیں رکھتا،اے اس کا انیس جوکوئی انیس نہیں رکھتا۔

اس کے علاوہ بعض دعائیں (بالخصوص صحیفۂ سجادیہ کی دعائیں) ہمیں باطنی دردوں اور بیرونی خطاؤں سے آشنا کرتی ہیں کہ ہم ان دعاؤں کے مضامین سے بھی استفادہ کرتے ہوئے اپنی اخلاقی تربیت کے بارے میں کوشش کریں۔

حضرت امام زین العابدین ـکی دعائے مکارم الاخلاق خاص اہمیت کی حامل ہے :خدایا! میں تیری پناہ چاہتا ہوں حرص وطمع کی طغیانی سے، غیض وغضب کی تندی سے، حسد کے غلبہ سے، صبر کی کمی اور قناعت کی کمی سے،بداخلاقی سے، شہوت افراط سے، تعصب کے غلبہ سے، نفسانی خواہشات کی پیروی سے، درستگی اورہدایت کی مخالفت سے، خواب غفلت سے، (دنیا کے) کاموں پر سخت راضی ہونے سے، حق پر باطل کے انتخاب سے، گناہوں پر اصرار سے،گناہوں کو معمولی اورکم سمجھنے سے اور عبادت واطاعت کو عظیم خیال کرنے سے۔

د۔اولیائے خدا سے محبت: جو کسی شخص کوانسان کامل سمجھے اور اس کے اخلاق ومعنویات کا سخت دلدادہ ہو تو اس کے تحت تاثیر واقع ہوجاتا ہے۔

استاد مطہری اس سلسلہ میں فرماتے ہیں : محبت مشابہت ومشاکلت کی طرف کھینچتی ہے اور اس کی قدرت باعث ہوتی ہے کہ محب محبوب کی شکل اختیار کرلے۔

محبت الکٹریک تار کی طرح ہے کہ جو محبوب کے وجود سے وصل ہوتا ہے اور اُس میں محبوب کے صفات کو منتقل کرتا ہے[1]۔

تہذیب اخلاق میں محبت کی تربیتی تاثیر کے بارے میں فرماتے ہیں :اہل عرفان اور صاحبان سیر و سلوک راہ عقل واستدلال سے کام لینے کے بجائے محبت وعقیدت کی تاکید اور پیشکش کرتے ہیں[اور] کہتے ہیں: کسی کامل کو تلاش کرو اور اس کی محبت وعقیدت کے رشتہ کو گردن دل میں آویزاں کرلو کہ راہ عقل واستدلال سے بھی زیادہ بے خطر ہے اور سریع تر ہے۔

محبت اور عقیدت کی قوت کی تاثیر دل سے اخلاقی رذائل کو زائل کرنے میں لوہے پر کیمیکل مواد ڈالنے کے مانند ہے، مثال کے طورپر ایک اچھے چھاپے کی [پھولدار]پلیٹ بنانے والا تیزاب کے ذریعہ حروف کے اطراف کو مٹادیتا ہے، نہ کہ ناخن سے اور نہ ہی چاقو کی نوک سے۔ لیکن عقلی توانائی کا اثر اُس انسان کے کام کے مانند ہے جو لوہے کے ذرّوں کو ہاتھ کے ذریعہ خاک سے جدا کرنا چاہتا ہے، اس میں کس قدر زحمت ومشقت ہے؟اگر ایک قوی ومضبوط آہن ربا [مقناطیس]ہاتھ میں ہو، ممکن ہے کہ ایک گردش میں اُن سب کو جدا کردے، عقیدت ومحبت کی طاقت آہن ربا کے مانند صفات رذیلہ کو جمع کرکے دور پھینک دیتی ہے۔ صاحبان عرفان کے عقیدہ کے مطابق پاک وپاکیزہ اور کامل واکمل افراد کی محبت وعقیدت ایک اٹومیٹک مشین کے مانند ہے جو خود بخود رذائل کو جمع کرکے باہر پھینک دیتی ہے[2]

ان لوگوں کے نمونے جو صدر اسلام میں اس جذب وانجذاب کے تحت تاثیر واقع ہوئے ہیں اور حضرت رسول اکرم ﷺ کے شیفتہ اور دلدادہ ہوگئے ہیں ابوذر غفاری، بلال حبشی ،اویس قرنی اور سلمان فارسی ہیں اس محبت نے ایک عظیم اکسیر کے مانند انھیں بے مثال گوہر کے مثل کرامت انسانیمیں تبدیل کردیا، اُس کے بعد بھی پوری تاریخ میں ایسے نمونے [شدت وضعف]کے ساتھ

---

[1] جاذبہ ودافعہ علی ۔ ، ص۷۳۔
[2] جاذبہ و دافعہ علی ۔ ،ص۷۷۔۷۸۔

کثرت سے پائے جاتے ہیں جلال الدین محمد رومی جو ''مولوی'' کے نام سے معروف ہیں اس میسر کے بارزترین نمونوں میں سے ایک نمونہ ہیں۔

جب وہ ایک کمسن بچہ تھے اور اپنے والد کے ہمراہ نیشاپور سے گذر رہے تھے تو نیشاپور کے بزرگ شیخ عطار نے بہاء الدولہ بچہ کو عام انسانوں سے زیادہ افضل بچہ پایا اور کسی تردید اور تأمل کے بغیر، بہاء الدولہ کو مبارک باد دی کہ عنقریب یہ بچہ سوختگان عالم میںآگ روشن کردے گا اور رہروان طریقت کے درمیان ایک اور شور وغوغا مچادے گا[1]۔

اس واقعہ کو گذرے ہوئے چند عشرے بھی نہ گذرے تھے کہ یہ پیشینگوئی مولانا کی شمس تبریزی سے ملاقات اور اُن سے عشق وعقیدت میں ظاہر ہوئی۔اسلام میں یہ محبت اور شیفتگی ''ولایت '' کے عنوان سے معصومین علیہم السلام کی نسبت مکمل طور پر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ ان اولیائے الٰہی کی محبت کہ جو حق کے مکمل آئینہ دار اور اس کی تجلی کی کاملجلوہ گاہ ہیں، انسان کو خدا پر ایمان اورعقیدت کی طرف منتقل کرتی ہے،اور اسی وجہ سے دعاؤں میں اس محبت کو ہم خدا سے طلب کرتے ہیں :خدایا!میرے نفس کو اپنی قدر سے ہماری جان کو قدر سے مطمئن اور اپنی قضا سے راضی قرار دے اور اپنے ذکر ودعا کا مشتاق اور حریص قرار دے اور اپنے خاص الخاص اولیاء کا دوستدار قرار دے اورزمین وآسمان کے درمیان محبوب قرار دے[2]۔

آیات وروایات میں عام طور سے ائمہ ہدیٰ ۲۲۲ کی محبت اور مودت عمومی اورخالص طور پر امیر المومنین ـ کی محبت ومودت قابل توجہ وتاکید قرار پائی ہے :(قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیهِ اَجراً اِلّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبیٰ[3]) ''اے پیغمبرؐ!آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ کا کوئی اجر نہیں چاہتا علاوہ اس کے کہ میرے اقربا سے محبت کرو''۔

---

[1] عبد الحسین، زرین کوب، پلہ پلہ تا ملاقات خدا،ص۵۰۔
[2] فاتیح الجنان ،شیخ عباس قمی، زیارت امین اللہ۔م
[3] سورۂشوریٰ ،آیت۲۳۔

اس آیت کے ذیل میں بہت سی احادیث شیعہ اور سنی سے نقل ہوئی ہیں کہ ''پیغمبر ﷺ کے قربیٰ'' سے مراد ا اس آیت میں علی، فاطمہ، اور آپ کے دونوں فرزند[حسن وحسین] ٢٢٢ ہیں[1]۔اس بناپر پیغمبر ﷺ اور ائمہ اطہار ٢٢٢ کی محبت و ولایت کہ جو کامل انسان ہیں جس قدر بھی زیادہ ہوگی، یہ درحقیقت مکارم اخلاق اور فضائل سے عشق ہے اور یہ عشق خدا کی محبت سے جدا نہیں ہوسکتا ۔

اولیائے خداوندی سے قلبی طور پر محبت آمیز رابطہ اور توسل اسی وجہ سے پرورش ایمان کا باعث ہے۔ ہمیں توجہ رکھنی چاہئے کہ انسان کی خصوصیات میں ہے کہ وہ صرف یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں کی توجہ کا مرکز رہے، بلکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا ہو جس سے اظہار محبت کرے اور عشق رکھے جیساکہ مزلو ذکر کرتا ہے: ''...اسی طرح ہمیں اس حقیقت سے غافل نہیں ہونا چاہئے کہ محبت کی ضرورتیں دونوں ضرورتوں کو یعنی محبت کرنے اور محبت دیکھنے کو شامل ہیں[2]''۔

اس بناپر اگر محبت کا متعلّق [طرف] اولیائے الٰہی اورانسان کامل کی محبت ہوں، تویہ سرگرداں قوت مجازی عشقوں اوربے قیمت محبتوں میں صرف نہیں ہوگی، بلکہ کمال انسانیت کے اعلیٰ مقصد میں پھولے پھلے گی۔ سعدی اگر عاشقی کنی وجوانی عشق محمد بس است وآل محمد اے سعدی!اگر تم عاشقی اور جواں مردی کرو تو اس کے لئے عشق محمد وآل محمد ٢٢٢ کافی ہے۔

اس موضوع میں آخری نکتہ ''زیارت'' ہے ائمہ اطہار ٢٢٢ کے مشاہد مشرفہ کی زیارت ان امور میں سے ہے جو ان کی محبت اور ولایت کو تقویت کرتی ہے اور باغ ایمان کو سرسبز وشاداب بنا دیتی ہے۔ متعدد روایات میں یہ نکتہ بیان ہوا ہے، نمونہ کے طور پر چند حدیث کی جانب ہم اشارہ کررہے ہیں '' :کسی قبر کی زیارت کے لئے سامان سفر آمادہ مت کرو، جز ہماری قبروں کی زیارت کے۔

---

[1] منجملہ تفسیر فخر رازی،ج٢٧ ،ص١٦٦بحارالانوار ،ج٢٧ ،ص١٣۔
[2] روانشناسی شخصیت سالم ،ص١٥۴۔

جان لو کہ میں زہر سے شہید کیا جاؤں گا اور پردیس اور عالم غربت میں دفن کیا جاؤں گا ۔ جو شخص میری زیارت کو آئے گا اس کی دعا مقبول و مستجاب ہے اور اس کا گناہ معاف ہے[1]۔

محبت کے عنوان سے برادران دینی وایمانی کی زیارت بھی قلوب کی حیات کا باعث، ایمان اور محبت میں رشد و اضافہ کا موجب ہے، بالخصوص صالح انسان اور ربانی علماء کی زیارت جو کہ دوگنا اخلاقی تاثیر رکھتی ہے'' :تم لوگ ایک دوسرے کی زیارت اور ملاقات کو جاؤ کہ یہ تمہارے دلوں کی حیات کا باعث ہے اور ہماری باتیں بھی ذکر ہوں اور ہماری احادیث تمہارے درمیان رابطہ برقرار کرتی ہیں، لہٰذا اگر ان سے تمسک اختیار کرو گے تو تمہارے رشد اور نجات کا باعث ہے[2]''۔

''زیارت دلوں میں دوستی اور محبت ایجاد کرتی ہے[3]''۔

نیک اور صالح افراد سے ملاقات کرنا قلب کی اصلاح کا باعث ہے[4]۔

---

[1] عیون اخبار الرضا ۔ ،ج۱ ،ص۲۸۵۔
[2] بحارالانوار،ج۷۴ ،ص۲۵۸۔
[3] بحارالانوار،ج۷۴ ،ص۳۵۵۔
[4] بحارالانوار،ج۷۷ ،ص۲۰۸۔

منابع

۱۔ قرآن مجید

۲۔ نہج البلاغہ

۳۔آدلر، آلفرد، روان شناسی فردی، ترجمہ حسن زمانی شرفشاہی، تصویر، ۱۳۷۵۔

۴۔آمدی، عبدالواحد، غررالحکم ودرالکلیم، تہران، محمد علی الانصاری القمی، ۱۳۳۷۔

۵۔ آندرہ، پی تیر، مارکومارکیم، ترجمہ شجاع الدین ضیائیان، تہران انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۴۰۲۔

۶۔ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ۲۰ جلد، بیروت، دار احیاء التراث، ۱۳۸۵ق۔

۷۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، نہایہ، قم، اسماعیلیان، ۱۴۰۸ق۔

۸۔ ابن شعبہ حرّانی، تحف العقول، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، ۱۴۰۴ق۔

۹۔ابن طاووس، علی ابن موسی، الملاحم و الفتن، قم، مؤسسہ صاحب الامر (عج)، ۱۴۱۶ق۔

۱۰۔ ابن فارس، معجم مقاییس اللغۃ، مصر، مطبعۃ المصطفی، ۱۳۸۹۔

۱۱۔ ابن فہد حلّی، عدۃ الداعی، قم، مکتبۃ الوجدانی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۲۔ابن مسکویہ، تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق، قم، بیدار، ۱۳۷۱ش۔

۱۳۔ ابن منظور، لسان العرب، بیروت، دار صار، ۱۴۱۵ق۔

۱۴۔ اتکینسون، ریتال، زمینۂ روان شناسی، ترجمہ محمد تقی براہنی اور دیگر افراد، تہران، رشد، ۱۳۶۶۔

۱۵۔ اتکینسون، فلسفۂ اخلاق، ترجمہ سہراب علوی نیا، تہران، مرکز ترجمہ و نشر کتاب، ۱۳۷۵۔

۱۶۔ احمد بن ابی یعقوب، تاریخ الیعقوبی، قم، مؤسسہ ونشر فرہنگ اہل بیت، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۷۔ احمدی سید احمد، اصول و روشہای تربیت در اسلام، تہران، جہاد دانشگاہی، ۱۳۶۴۔

۱۸۔ ادگاردپش، اندیشہ ہای فروید، ترجمہ غلام علی توسلی، تہران، انتشارات کتاب فروشی ابن سینا، ۱۳۳۲۔

۱۹۔ اربلی، ابوالفتح، کشف الغمہ، بیروت، دارالکتاب الاسلامی، ۱۴۵۱ق۔

۲۰۔ ارسطو، اخلاق نیکوماخس، ترجمہ سید ابوالقاسم پور حسینی، تہران، انتشار دانشگاہ تہران، ۱۳۶۸۔

۲۱۔ ارون سون، الیوت، روان شناسی اجتماعی، ترجمہ حسین شکر کن، تہران، رشد، ۱۳۶۶۔

۲۲۔ اسکافی، محمد بن ہمام، التمحیص، قم، مدرسہ امام مہدی (عج)، ۱۴۵۴ق۔

۲۳۔ اشعث کوفی، جعفریات، تہران، مکتبۃ نینوی الحدیثۃ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۲۴۔ الراغب اصفہانی، الحسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، تہران، المکتبۃ المرتضویۃ لاحیاء آثار لمرتضویۃ۔

۲۵۔ المظفر، محمد رضا، المنطق، قم، اسماعیلیان، ۱۳۶۶۔

۲۶۔ امام خمینیؒ، تحریر الوسیلہ، تہران، المکتبۃ العلمیۃ الاسلامیۃ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۲۷۔ امام خمینیؒ، چہل حدیث، تہران، مرکز نشر دانشگاہی رجاء، ۱۳۶۸۔

۲۸۔ حضرت امام جعفر صادق ۔، مصباح الشریعۃ۔

۲۹۔ حضرت امام جعفر صادق ۔،نہج الفصاحہ۔

۳۰۔ باب الحوائجی، نصر اللہ، فروید چہ می گوید، تہران، انتشارات دریا، ۱۳۴۷۔

۳۱۔ باقری، خسرو، مبانی شیوہ ہای تربیت اخلاقی، تہران، سازمان تبلیغات اسلامی، مرکز چاپ و نشر، ۱۳۷۷۔

۳۲۔ باقری، خسرو، نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی، تہران، وزارت آموزش وپرورش، ۱۳۶۸۔

۳۳۔برقی، محمد بن خالد، محاسن، قم مجمع جہانی اہل بیت ۲۲۲،۱۳، ۱۴۱۳ق۔

۳۴۔ بلاکہام،ھ۔ج، شش متفکر اگزیستانیا لیست، ترجمہ محسن حکیمی، تہران، نشر مرکز، ۱۳۷۲۔

۳۵۔بی ناس، جان، تاریخ جامع ادیان، تہران، شرکت انتشارات علمی فرہنگی، ۱۳۷۳۔

۳۶۔ بیہقی، احمد بن الحسین، شعب الایمان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۱۵ق۔

۳۷۔ پاپکین و استرول، کلیات فلسفہ، ترجمہ جلال الدین مجتبوی، تہران، حکمت، ۱۳۷۵ش۔

۳۸۔ پروین، لارنس، روان شناسی شخصیت: نظریہ و تحقیق، ترجمہ محمد جعفر جوادی، تہران، رسا، ۱۳۷۲۔

۳۹۔ پیاژہ، ژان، تربیت بہ کجا می سپرد، ترجمہ دادستان و منصور، تہران، دانشگاہ تہران، ۱۳۶۹۔

۴۰۔ پیاژہ، ژان، دیدگاہ پیاژہ در گسترہ تحول روانی، ترجمہ وگردآوری از منصور، محمود وپریرخ دادستان، تہران، نشر ژرف، ۱۳۶۷۔

۴۱۔ تفتازنی، سعد الدین، شرح مقاصد، قم، انتشارات شریف رضی، ۱۳۷۵۔

۴۲۔ ثقفی، ابراہیم بن محمد، الغارات، تہران، انجمن آثار ملی، ۱۳۹۵ق۔

۴۳۔ جرجانی، سید شریف، شرح المواقف، قم، انتشارات شریف رضی، ۱۳۷۵۔

۴۴۔ جعفری، محمد تقی، بررسی و نقد افکار راسل، تہران، امیر کبیر، ۱۳۷۵۔

۴۵۔ جوادی، محسن، مسألہ باید و ہست، قم، تبلیغات اسلامی، ۱۳۷۵۔

۴۶۔ جوادی، محسن، نظریہ ایمان در عرصہ کلام وقرآن، قم، معاونت امور اساتید و دروس معارف اسلامی، ۱۳۷۶۔

۴۷۔ جونز ارنست ودالبی یزو، اصول روانکاوی، ترجمہ ہاشم رضی، تہران، کاوہ، ۱۳۴۲۔

۴۸۔ جوہری، اسماعیل بن حماد، صحاح اللغۃ، بیروت دار العلم للملایین، ۱۹۹۰م۔

۴۹جیمز، ویلیام، دین وروان، ترجمہ مہدی قائنی، قم، دار الفکر، ۱۳۶۷۔

۵۰۔ حسینی، سید مہدی، مشاورہ وراہنمائی در تعلیم و تربیت اسلامی۔

۵۱۔ حکیمی، محمد رضا، الحیاۃ، تہران، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱۴۵۹ق۔

۵۲۔ حمصی رازی، سدید الدین محمود، المنقذ من التقلید، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۵۳۔ خراسانی، محمد کاظم، کفایۃ الاصول، قم، مؤسسہ آل البیت ؑ لاحیاء التراث، ۱۴۱۷ق۔

۵۴۔ خزّاز القمی، کفایۃ الاثر، قم، بیدار، ۱۴۵۱ق۔

۵۵۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، مدینہ منورہ، مکتب سلفیہ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۵۶۔ دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، روان شناسی رشد با نگرش بہ منابع اسلامی، تہران، سمت، ۱۳۷۴۔

۵۷۔ دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، مکتب ہای روان شناسی و نقد آن، ۲ جلد، تہران، سمت، ۱۳۶۹۔

۵۸۔ دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، نقش تربیتی معلم۔

۵۹۔ دیلمی، حسن بن ابی الحسن، ارشاد القلوب ۲ جلد، قم، مؤسسہ آل البیت ۲۲۲ ۱۴۱۳ق۔

۶۰۔ دیلمی، حسن بن ابی الحسن، اعلام الدین، قم، مؤسسہ آل البیت ۲۲۲ ۱۴۰۸ق۔

۶۱۔ راسل برتراند، تاریخ فلسفہ غرب، ۲جلد، ترجمہ نجف دریابندی، تہران، شرکت سہامی کتاب داری جیبی، ۱۳۵۱۔

۶۲۔ راسل برتراند، زناشوئی و اخلاق، ترجمہ مہدی افشار، تہران، کاویان، ۱۳۵۵۔

۶۳۔ راوندی، قطب الدین، دعوات، قم، مؤسسہ الامام المہدی (عج)، ۱۴۰۷ق۔

۶۴۔ روحانی، شہریار، خانودہ موعود مارکسیم، تہران، قلم، ۱۳۶۴۔

۶۵۔ زبیدی، سید محمد بن محمد، تاج العروس، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۴ق۔

۶۶۔ زرین کوب، عبد الحسین، پلہ پلہ تا ملاقات خدا، مولانا جلال الدین رومی کی زندگی اور ان کی فکر کے بارے میں، تہران، علمی، ۳۷۲۔

۶۷۔ سبحانی، جعفر، حسن و قبح عقلی، پایہ ہای جاودان اخلاق، تہران، پژوہشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، ۱۳۷۷۔

۶۸۔ سید ابن طاووس، مسکن الفوائد، قم، مؤسسہ آل البیت ۲۲۲ ۱۴۱۲ق۔

۶۹۔ سیف، علی اکبر، تغییر رفتار و رفتار درمانی (نظریہ ہا وروش ہا)، تہران، دانا، ۱۳۷۳۔

۷۰ ۔ سیف، علی اکبر، روان شناسی پرورشی (روان شناسی یادگیری و آموزش)، تہران، آگاہ، ۱۳۶۸۔

۷۱ ۔ شالہ، فیلیسین، فروید و فروید یسم، ترجمہ اسحاق وکیلی، تہران، بنگاہ مطبوعاتی قائم مقام، ۱۳۴۱۔

۷۲ ۔ شعیر سبزواری، جامع الاخبار، قم، مؤسسہ آل البیت ۲۲۲، ۱۴۱۴ق۔

۷۳ ۔ شیخ صدوق، اعتقادات، قم، کنفرانس جہانی ہزارہ شیخ مفید، ۱۴۱۳ق۔

۷۴ ۔ شیخ صدوق، توحید، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۷۵ ۔ شیخ صدوق، خصال، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، ۱۴۵۳۔

۷۶ ۔ شیخ صدوق، صفات الشیعہ، قم، مؤسسہ الامام المہدی (عج) ۱۴۱۵۔

۷۷ ۔ شیخ صدوق، علل الشرایع، بیروت، دار احیاء التراث، ۱۳۸۵ق۔

۷۸ ۔ شیخ صدوق، عیون اخبار الرضا ۔، تہران، مکتبۃ جہان، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۷۹ ۔ شیخ صدوق، مقنع، قم، مؤسسہ امام ہادی ۔، ۱۴۱۵ق۔

۸۰ ۔ شیخ صدوق، تومن لا یحضر الفقیہ، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۸۱ ۔ شیخ طوسی، امالی، قم، مؤسسہ البعثۃ، دار الثقافۃ، ۱۴۱۴ق۔

۸۲ ۔ شیخ طوسی، محمد بن حسن، تہذیب الاحکام، بیروت، دار التعارف و دار صعب، ۱۴۵۱ق۔

۸۳ ۔ شیخ مفید، ارشاد، قم، مؤسسہ آل البیت ۲۲۲، ۱۴۱۳ق۔

۸۴۔ شیخ مفید، اوائل المقالات، قم، کنگرہ جہانی شیخ مفید، ۱۴۱۳ق۔

۸۵۔ شیرازی، صدرالدین، تفسیر القرآن، قم، بیدار، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۸۶۔ صبور اردو باری، احمد، معمای عادت۔

۸۷۔ صحیفہ سجادیہ، الکاملۃ، دمشق، رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۸۸۔ صدرا لدین شیرازی، الاسفار الاربعۃ قم، مصطفوی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۸۹۔ صدر، سید محمد باقر، فلسفتنا (نظریہ المعرفۃ)، قم، دارالکتاب الاسلامی، ۱۴۵۱ق۔

۹۰۔ صدر، محمد باقر، بحث فی علم الاصول (تقریر سید محمود ہاشمی)، ۷جلد، قم، مکتب الاعلام اسلامی، ۱۴۰۵ق۔

۹۱۔ صدر، محمد باقر، دروس فی علم الاصول، ۳حلقہ، بیروت، دارالکتاب اللبنانی، قاہرہ، دارالکتاب المصری، ۱۹۸۷۔

۹۲۔ صدوق، عیون اخبارالرضا ۔ تعلیق حسین اعلمی، بیروت، مؤسسہالاعلمی للمطبوعات، ۱۴۰۴۔

۹۳۔ طبرسی، حسن بن فضل، مکارم الاخلاق، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، ۱۴۱۴ق۔

۹۴۔ طریحی، فخرالدین، مجمع البحرین، قم، مؤسسہ البعثۃ، ۱۴۱۵ق۔

۹۵۔ طوسی، خواجہ نصیر الدین، اخلاق ناصری، شیراز انتشارات علیہ اسلامیہ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۹۶۔ عاملی، شیخ حر، وسائل الشیعہ، ۲۰ جلد، تہران، کتاب فروشی اسلامیہ، ۱۴۰۳ق۔

۹۷۔ عبد الباقی، محمد فواد، المعجم لالفاظ القرآن الکریم، قاہرہ، مطبعہ دارالکتب المصریہ، ۱۳۶۴ق۔

۹۸۔ عدۃ من الرواۃ، اصول ستہ عشر، قم، دارا لشبستری، ۱۴۰۵ق۔

۹۹۔ عسکری، ابو ہلال و جزایری، سید نور الدین، معجم الفروق اللغویہ، قم، مکتبہ بصیرتی، ۱۳۵۳۔

۱۰۰۔ علامہ امینی، احمد، الغدیر، بیروت، دارالکتاب العربی، ۱۴۰۲ق۔

۱۰۱۔ علامہ حلی، کشف المراد، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، ۱۴۱۳ق۔

۱۰۲۔ علامہ طبا طبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القران، ۲۰ جلد، قم، جامعتالمدرسین، مؤسسہ نشر اسلامی۔

۱۰۳۔ علامہ طبا طبائی، سید محمد حسین، رسائل سبعہ، قم، نمایش گاہ و نشر کتاب، ۱۳۶۲۔

۱۰۴۔ علم الہدی، سید مرتضی، الذخیرہ، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، ۱۴۱۱ق۔

۱۰۵۔ عیاشی، محمد بن مسعود، تفسیر عیاشی، تہران، المکتبہ العلیہ الاسلامیہ، ۱۳۸۰ق۔

۱۰۶۔ غزالی، ابو حامد محمد، احیاء علوم الدین، بیروت، دارالعلم، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۰۷۔ فرانکل، ویکتور، انسان در جستجوی معنا، ترجمہ نہضت صالحیان و میلانی، درسا، ۱۳۷۳۔

۱۰۸۔ فرانکنا، فلسفہ اخلاق، ترجمہ ہادی صادقی، قم، مؤسسہ فرہنگی طہ، ۱۳۷۶۔

۱۰۹۔ فقہ الرضا (فقہ منسوب بہ امام رضا ـ)، مشہد، کنفرانس جہانی امام رضا ـ ۱۴۰۶ق۔

۱۱۰۔ فلسفی، محمد تقی، اخلاق، تہران، نشر معارف اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۱۱۔ فلسفی، محمد تقی، کودک از نظر وراثت و تربیت، تہران، نشر معارف اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۱۲۔ فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، قم، دفتر انتشارات اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۱۳۔ فیض کاشانی، ملا محسن، المحجۃ البیضا فی تہذیب الاحیاء، ۸ جلد، بیروت، مؤسسہ اعلمی مطبوعات، ۱۴۰۳ق۔

۱۱۴۔ قطب محمد، روش تربیتی در اسلام، ترجمہ محمد مہدی جعفری، تہران، انجام کتاب، ۱۳۶۲۔

۱۱۵۔ قمی، شیخ عباس، کلیات مفاتیح الجنان، بہ خط طاہرہ خوشنویس، تہران، کتابچی، ۱۳۷۰۔

۱۱۶۔ قمی، علی بن ابراہیم، تفسیر قمی، قم، دار الکتاب، ۱۴۰۴ق۔

۱۱۷۔ کارل الکسیس، نیایش، ترجمہ علی شریعتی، تہران، حسینیہ ارشاد، ۱۳۵۸۔

۱۱۸۔ کانت، ایمانوئل، بنیاد ما بعد الطبیعہ اخلاق، ترجمہ حمید عنایت و علی قیصری، تہران، شرکت سہامی انتشار خوارزمی، ۱۳۶۹۔

۱۱۹۔ کتاب مقدس، ترجمہ فارسی، قطع جیبی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۲۰۔ کراجکی، محمد بن علی، کنز الفوائد، قم، دار الذخائر، ۱۴۱۰ق۔

۱۲۱۔ کریستیانی، ترزاس، روان شناسی مشاورہ، ترجمہ رضا فلاحی و حاجی لو، مؤسسہ رشد، ۱۳۷۴۔

۱۲۲۔ کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ۲ جلد، بیروت، دار الاضواء، ۱۴۱۴ق۔

۱۲۳۔ مارستون، انتفانی، معجزۂ تشویق، ترجمہ توراندخت تمدن (مالکی)، تہران، علمی، ۱۳۷۵۔

۱۲۴۔ مثولتز، دوان، روان شناسی کمال، ترجمہ گیتی خوش دل، تہران، نشر نو، ۱۳۶۲۔

۱۲۵۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ۱۱۱ جلد، بیروت، دار الاضواء، ۱۴۱۳ق۔

۱۲۶۔ محمد قاسمی، حمید، اخلاق جنسی اسلام کی نظر میں، تہران، سازمان تبلیغات اسلامی، ۱۳۷۳۔

۱۲۷۔ محمدی ری شہری، محمد، میزان الحکمہ، ۱۰ جلد، قم، حوزہ علمیہ قم، دفتر تبلیغات اسلامی، ۱۳۶۲۔

۱۲۸۔ مزلو، آبراہام، روان شناسی شخصیت سالم، ترجمہ شیوا روی گردان، تہران، ہدف، ۱۳۶۷۔

۱۲۹۔ مزلو، آبراہام، انگیزش و شخصیت، ترجمہ احمد رضوانی، مشہد، آستانہ قدس رضوی، ۱۳۶۷۔

۱۳۰۔ مشکور، محمد جواد، خلاصۂ ادیان، تہران، شرق، ۱۳۷۲۔

۱۳۱۔ مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق در قرآن، تہران، امیر کبیر، ۱۳۷۲۔

۱۳۲۔ مصباح یزدی، محمد تقی، دروس فلسفہ اخلاق، تہران، اطلاعات، ۱۳۶۷۔

۱۳۳۔ مطہری، مرتضی، آشنایی با علوم اسلامی (حکمت عملی)، قم، صدرا، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۳۴۔ مطہری، مرتضی، آشنایی با علوم اسلامی (عرفان)، قم، صدرا، ۱۳۷۱۔

۱۳۵۔ مطہری، مرتضی، اخلاق جنسی در اسلام و جہان غرب، قم، صدرا، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۳۶۔ مطہری، مرتضی، اسلام و مقتضیات زمان، ۲جلد، قم، صدرا، ۱۳۷۴۔

۱۳۷۔ مطہری، مرتضی، تعلیم و تربیت در اسلام، تہران، صدرا، ۱۳۶۷۔

۱۳۸۔ مطہری، مرتضی، جاذبہ ودافعہ علی ۔، تہران، صدرا، ۱۳۶۸۔

۱۳۹۔ مطہری، مرتضی، جاودانگی اخلاق، (چاپ شدہ در یاد نامہ استاد مطہری، ج۱)، تہران، سازمان انتشارات و آموزش انقلاب سلامی، ۱۳۶۰۔

۱۴۰۔ مطہری، مرتضی، سیری در سیرۂ نبوی، قم، صدرا، ۱۳۷۶۔

۱۴۱۔ مطہری، مرتضی، مسألہ حجاب، قم، صدرا، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۴۲۔ مطہری، مرتضی، مسألہ شناخت، قم، صدرا، ۱۳۷۴۔

۱۴۳۔ مطہری، مرتضی، مقدمہ ای بر جہان بینی اسلامی (انسان در قرآن)، قم، صدرا، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۴۴۔ مطہری، مرتضی، نظام حقوق زن در اسلام، قم، صدرا، ۱۳۷۵۔

۱۴۵۔ مطہری، مرتضی، نقدی بر مارکسیسم، قم، صدرا، ۱۳۶۲۔

۱۴۶۔ معین، محمد، فرہنگ فارسی (متوسط)، ۶جلد، تہران، امیر کبیر، ۱۳۷۱۔

۱۴۷۔ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، تہران، دارالکتب الاسلامۃ، ۱۳۷۲۔

۱۴۸۔ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ۲۷ جلد، تہران، دارالکتب الاسلامۃ، ۱۳۷۱۔

۱۴۹۔ ملکی تبریزی، میرزا جواد آغا، رسالۂ لقاء اللہ، ترجمہ و مقدمہ و اضافات سید احمد فہری، نہضت زنان مسلمان، ۱۳۶۰۔ ا

۵۰۔ منصور، محمود، احساس کہتری، تہران، دانشگاہ تہران، مؤسسہ انتشارات و چاپ، ۱۳۶۹۔

۱۵۱۔ منصور، محمود، روان شناسی ژنتیک: تحول روانی از کودکی تا پیری، تہران، ترمہ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۵۲۔ مہرین، مہراد، فلسفہ شرق، تہران، مؤسسہ مطبوعاتی، عطائی، ۱۳۵۷۔

۱۵۳۔ نائینی، میرزا محمد حسین، فوائد الاصول (تقریر محمد علی کاظمی)، ۴جلد، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، ۱۴۰۴ق۔

۱۵۴۔ ناطق، ناصح، بحثی دربارۂ زندگی مانی وپیام او، تہران، امیر کبیر، ۱۳۵۷۔

۱۵۵ نراقی، ملا احمد، معراج السعادہ، تہران، رشیدی، ۱۳۶۲۔

۱۵۶۔ نراقی، ملا مہدی، جامع السعادات، قم، اسماعیلیان، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۵۷۔ نعمانی، محمد بن ابراہیم، الغیبہ، تہران، مکتبۃ الصدوق، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۵۸۔ نوری، میرزا حسین، مستدرک الوسائل، قم، مؤسسہ آل البیت، ۱۴۰۷ق۔

۱۵۹۔ نوری، میرزا حسین، مستدرک الوسائل ومستنبط المسایل، بیروت، مؤسسہ آل البیت لاحیاء التراث، ۱۴۰۸ق۔

۱۶۰۔ ورام بن ابی فراس، تنبیہ الخواطر، ۲ جلد، بیروت، دار التعارف ودار صعب، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۶۱۔ ویل دورانت، تاریخ تمدن، ترجمہ گروہی از مترجمین، تہران، اقبال، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۶۲۔ ویل دورانت، لذات فلسفہ، تہران، شرکت سہامی انتشار اندیشہ، ۱۳۵۴۔

۱۶۳۔ ہرگنہان، بی۔ آر۔ مقدمہ ای بر نظریہ ہای یادگیری، ترجمہ علی اکبر سیف، تہران، دانا، ۱۳۷۴۔

۱۶۴۔ ہرمان الدنبورک، فروغ خاور، ترجمہ بدر الدین کتابی، اصفہانی، انتشارات کتاب فروشی تأیید، ۱۳۴۰۔

۱۶۵۔ ہیلگارد، ارنست، نظریہ ہای یادگیری، ترجمہ محمد نقی براہنی، تہران، ستاد انقلاب فرہنگی مرکز نشر دانشگاہی، ۱۳۷۶۔

١٦٦۔یونگ، روان شناسی ضمیر نا خود آگاہ، ترجمہ محمد علی امیری، تہران، انتشارات آموزش و انقلاب

اسلامی، ١٣٧٢۔ ١٦٧۔ The Psychology of Healthe ,M.Robin Dimatteo, colifornia,١٩٩١.

//